قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ زبان شناسی

میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

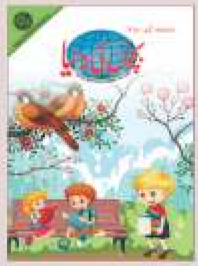
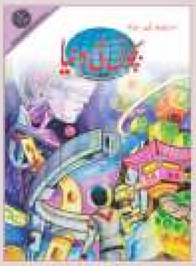

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

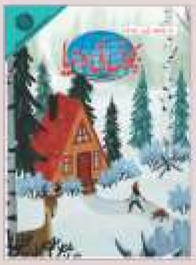

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:5، مئی 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم، ثاقب فریدی، فیضان الحق

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔ 500002

فون:040-24415194

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

- مادری زبان میں درس و تدریس — ایاز احمد خان 7

ادب زاویے اور جہات

- بابا فرید گنج شکر اور ان کا کلام — ابراہیم افسر 11

- الطاف حسین حالی بہ حیثیت غزل گو — محمد مستر 15
- اردو غزل میں کرداروں کی اہمیت — قسیم اختر 18
- خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت — محمد اکبر 20
- غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری — عبدالرزاق زیادی 24

شخصیات

- خلیل علی خاں اشک — سید محمد 27
- منفی رویوں کا نکتہ چیں: اختر آصف — اسرار اللہ انصاری 31
- مطالعہ واہی کی چند جہتیں — حذیفہ شکیل 33

یاد رفتگاں

- عابد رضا بیدار: ایک مثالی شخصیت — اسلم جاوداں 36
- نجمہ رحمانی: جو ہمیشہ یادوں میں زندہ رہے گی — شیخ عقیل احمد 39

جہان آگہی

- مٹی کے اوراق کی کتابیں — شایاں قدوائی 43
- علمیات کے نظریے — عذرا عابدی 45

کتاب دریچہ

- جن کتابوں نے متاثر کیا — شوکت احمد ڈار 49

ٹیکنالوجی

- اردو زبان، جدید میڈیا اور نئی نسل — ایم جے وارثی 52

تراجم

- ادب کیوں پڑھیں؟ — مصنف: ماریو برگس یوسا، ترجمہ: نایاب حسن 55

شمع راہ

- گیتا اور اس کی تعلیم — خواجہ دل محمد 61

خسرو شناسی

- امیر خسرو کی شاعری میں وطن دوستی — سید صباح الدین عبدالرحمن 64

خصوصی گفتگو

- پدم شری حکیم سید ظل الرحمن سے گفتگو — عبدالمنان صمدی 68

نیا آسمان نئے ستارے

- احمد یوسف کی افسانہ نگاری — محمد محمود الحسن 71
- شانتی رنجن بھٹاچاریہ: اردو ادب کا ایک سنجیدہ اور مخلص فنکار — محمد اجمل حسین 74

- درشن سنگھ کی غزل گوئی — نذیر احمد کمار 77

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 81

خبر نامہ

- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 93

ہماری بات

کسی بھی ملک یا قوم کی زبان اس کی تہذیبی و ثقافتی روایات کی نمائندہ ہوتی ہے۔ زبان محض خیالات کا اظہار نہیں بلکہ پرانی قدروں کی محافظ ہے۔ یہی وہ مضبوط وسیلہ ہے جو روایت کو نسل درنسل آگے بڑھاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر خطے کی زبان انفرادی طور پر اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ جو انسان جس علاقے سے پیدائشی طور پر تعلق رکھتا ہے، اس سے ایک خاص ربط قائم ہو جاتا ہے۔ ماں کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس کے ذہن میں ایک خاص مقام حاصل کر لیتے ہیں اور اس کی فکری تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عمر گزر جانے اور علاقوں کے تبدیل ہو جانے کے باوجود مادری زبان سے گہری انسیت اور محبت برقرار رہتی ہے۔

تعلیم وتدریس کے سلسلے میں بھی مادری زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بچہ جب بھی سیکھنے کی شروعات کرتا ہے، الفاظ اس کی مدد کرتے ہیں۔ ان الفاظ کا تعلق مادری زبان سے جتنا زیادہ ہوتا ہے بچوں کو تفہیم میں اتنی ہی آسانی ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہی الفاظ دوسری زبانوں اور غیر مانوس علاقوں کے ہوں تو بچے کو ان کی تفہیم اور آموزش میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مادری زبان میں تدریس وتعلیم کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں بچہ زیادہ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ ورنہ عام طور پر یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بچے کی ساری توجہ زبان کے قواعد اور اس کے اصولوں کو سمجھنے پر مرکوز رہتی ہے اور ایسے میں بہت سی اہم معلومات اس تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اسی طرح مادری زبان میں تعلیم وتدریس کا ایک اور بڑا فائدہ مشکل سے مشکل مسائل کو آسانی سے پیش کر دینا ہے۔ مادری زبان عام طور پر بچوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتی ہے اور الفاظ کی مانوسیت کے سبب اس میں پیش کیے گیے مسائل بھی اجنبی معلوم نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر اردو زبان سے واقف بچوں کو سائنس، جغرافیہ یا تاریخ کی کتابیں اگر اردو زبان میں فراہم کی جائیں تو وہ خاص دلچسپی کے ساتھ ان علوم سے آگہی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تراجم کو تعلیم وتدریس کے میدان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ تراجم کے ذریعے ہی یہ ممکن ہے کہ مختلف علوم وفنون کی بنیادی کتابیں دوسری زبانوں میں منتقل کی جائیں اور ان علاقوں تک پہنچائی جائیں جو اس زبان سے متعلق ہوں۔ مادری زبان میں مرکزی علوم کی تعلیم کے ساتھ ہی زمینی سطح پر تعلیمی بیداری کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی نے مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حمایت کی۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت نے بھی مادری زبان کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کے فروغ کے لیے بھی کوشاں ہے۔ NEP 2020 میں حکومت کی جانب سے جاری کی گئی پالیسیوں میں مادری زبان پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس کا مقصد مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں میں ان کے بولنے والوں تک علوم وفنون کے بنیادی مواد پہنچانا اور تعمیر وترقی کے راستے وا کرنا ہے۔ ایسے میں مختلف اداروں سے وابستہ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ مادری زبان کو تعلیم وتدریس کا ذریعہ بنائیں اور اگر مواد کی کمی ہے تو اسے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنے قیام کے ساتھ ہی اردو زبان میں مختلف علوم وفنون کی اہم کتابیں فراہم کرنے میں کوشاں ہے۔ سائنس، جغرافیہ، تاریخ، علم طب اور دیگر علوم وفنون سے متعلق کئی اہم کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اسی طرح کونسل کے رسائل میں بھی مادری زبان کی اہمیت پر مسلسل مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو بھی دیگر زبانوں کی طرح تعلیم وتدریس کا مؤثر ذریعہ ہے۔

شمس اقبال

ربط والتفات

خطوط

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

'اردودنیا' برائے اپریل 2025 موصول ہوا۔ سرورق پر عالمی اُردو کانفرنس کی افتتاحی تقریب کا منظر ہے اور چہروں پر خوداعتمادی اور عزم وعظمت کے تاثرات جو وکست بھارت کی کامیابی کے حوصلے کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک ایسا وژن جو آزادی کے سو سال بعد بھارت کے سپر پاور بن جانے کی ضمانت دیتا ہے۔ اداریہ ان ہی احساسات کا غماز ہے اور ہونا بھی چاہیے یہی وقت کا تقاضا ہے۔ بشمول اداریہ اس شمارہ میں کوئی 12 اصناف سخن شامل ہیں اور جن کے ذیل میں 22 ذیلی سرخیاں اور یہ تمام اس شمارہ کے معیار کی بلندی میں معاون ہیں۔ 'ربط والتفات' میں دو مراسلے شامل ہیں۔ تعریفی وتوصیفی 'رپورٹ' کے ذیل میں اداریہ کی جانب سے تفصیلی وتصویری روداد پیش کی گئی ہے جو پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جس میں وکست بھارت کے وژن کو نازونزاکت سے پیش کیا گیا ہے۔

'زبان وتعلیم' کے تحت ڈاکٹر محمد معمور علی نے 'قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی' پر اپنا تفصیلی مضمون تحریر کیا ہے۔ انھوں نے تعلیم اور ٹکنالوجی کا ایک ایسا علامتی رشتہ استوار کیا ہے جو ایک دوسرے کو تشکیل دیتے ہیں۔ پھر انھوں نے قومی پالیسی برائے تعلیم 2020 اور تعلیم میں ٹکنالوجی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ بڑا وقیع مضمون ہے جو پڑھنے سے زیادہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ 'ادب زاویے اور جہات' میں چار مقالے درج ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ بعنوان 'ادب پر اساطیر اور مہماتی قصوں کا اطلاق' ناز قادری کی تحریر ہے۔ اساطیر عربی لفظ ہے اور لفظ اسطورہ کی جمع ہے جس کے معنی اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں جو نہایت تعجب خیز بھی ہو سکتے ہیں۔ ان نکات پر مزید بحث کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ علامتیں ثقافت اور اس کی روح کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ کا دوسرا مضمون پروفیسر ابوبکر عباد کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ' مصنف نے اس سنجیدہ موضوع کو اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ اس میں دلچسپی بھر دی ہے۔ تیسرا مضمون ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی کا 'پنچ تنتر کے اُردو تراجم' ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ عالمی ادب کی شاہکار کتابوں میں پنچ تنتر بھی شامل ہے۔ سنسکرت میں لکھی ہوئی یہ کہانیاں نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے تراجم دنیا بھر کی زبانوں میں ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہی اس مضمون کا لب لباب ہے۔ اور ہے بھی نہایت دلچسپ۔ آخری مضمون ڈاکٹر محمد خواجہ مخدوم محی الدین کا تحریر کردہ ہے۔ عنوان ہے 'اُردو ادب میں تنقیدی نظریات ورجحانات' ان کے مضمون کا بیشتر حصہ افلاطون، ارسطو اور بوطیقا کے علاوہ عربی وسنسکرت تنقید پر مشتمل ہے۔ اخیر میں کچھ حصہ اُردو تنقید سے متعلق ہے۔

'شخصیات' کے ذیل میں چار مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا 'ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی' ہے۔ یہ اپنے عہد کے ایک ممتاز ادیب، عالم ومصنف تھے۔ میر محبوب علی خاں نظام دکن کے دربار سے بحیثیت شاعر وابستہ رہے۔ آگے ان کے حالاتِ حیات اور فن کے بارے میں لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر شفیع ایوب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ عنوان ہے 'اردو کا نندلال' (جو نیرنگ سرحدی بن کے چمکا) نندلال نیرنگ سرحدی، اُردو کے بڑے عاشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ بطور مدرس اور بطور شاعر ساری زندگی گزار دی۔ بقیہ آپ پڑھ کر خود اطمینان کر لیجیے۔ تیسرا مضمون ڈاکٹر فیضان حیدر کا تحریر کردہ ہے۔ عنوان ہے 'جگدیش سرن سکسینہ راز دہلوی اور ان کی غزلیہ شاعری'۔ اس مضمون کی ابتدا ہی توصیفی عبارت سے کی گئی ہے کہ جہانِ رنگ وبو میں کچھ ہستیاں ایسی بھی عالم وجود میں آئیں...... باقی لطف اس توصیفی مقالہ کو مکمل پڑھنے میں ہے۔ اس سلسلہ کا چوتھا اور آخری مضمون جناب ایم-اے کنول جعفری کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان 'رفعت سروش: جن کی آواز ریڈیو کی شناخت بن گئی'۔ مضمون اچھا ہے، ضرور مطالعہ کریں۔ 'کتاب دریچہ' میں ایک مقالہ درج ہے۔ بعنوان 'جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا'۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے پہلے پہل تو یہ بتایا کہ صوبۂ مہاراشٹر تعلیم کا ایک گڑھ ہے اور اس میں خصوصاً مراٹھواڑہ اور ودربھ علمی میدان میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ 'یادرفتگاں' کے ذیل میں تین مضامین درج ہیں۔ دو تابش مہدی کے بارے میں اور ایک پروفیسر ظہیر انصاری سے متعلق۔ پہلا مضمون ڈاکٹر منور حسن کمال کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے 'تابش مہدی تعمیر سے غزل خوانی نہیں جاتی' اس میں اولاً ان کی ادبی مصروفیات کا ذکر ہے اور پھر غزل خوانی میں ان کی قابلیت اور اوصاف کا تذکرہ۔ اچھا مضمون ہے۔ پڑھنے میں ادبی فوائد کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دوسرا مضمون جناب ابوالبشر کا تحریر کردہ ہے۔ عنوان ہے 'ڈاکٹر تابش مہدی' ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر تابش مہدی اردو زبان و ادب کا نمائندہ اور ایک معتبر حوالہ تھے۔ انھوں نے زندگی کا ہر لمحہ علم وادب کے فروغ

میں وقف کردیا تھا اور یہی ان کے تمام تر مضمون کا حوالہ ہے۔ تیسرا اور آخری مضمون جناب عبدالرحمٰن فیصل صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ بعنوان 'پروفیسر انور ظہیر انصاری' پروفیسر انور ظہیر نے ساحر لدھیانوی کی ادبی خدمت پر جو کتاب شائع کی تھی اسے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جو ایک مبسوط حوالہ جاتی مقالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ 'خصوصی گفتگو' کے ذیل میں جناب ساجد جلال پوری نے 'غلام حیدر صاحب' کا انٹرویو پیش کیا ہے۔ جس کے دوران غلام حیدر نے واضح کیا ہے کہ بچوں کے ادب میں سماجی، تکنیکی اور ماحولیاتی مواد کی ضرورت ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' کے ذیل میں جناب پرواز احمد نے 'اردو اور بھوجپوری کا رشتہ' واضح کیا ہے اور اتنا واضح کیا ہے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل 2025 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق پر عالمی اردو کانفرنس کے افتتاح کی تصویر نہایت دلکش ہے۔ 'ہماری بات' میں مدیر نے حسب روایت اردو زبان و ادب کے مسائل کو عصری تناظر میں اور سائنس و ٹکنالوجی کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ 'وکست بھارت وژن اور مشن کے تحت' اردو کے مجموعی کردار پر موثرانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'ربط و التفات' کا کالم اچھا ہے۔ اس میں مزید خطوط شائع کریں تو بہتر ہوگا۔ اس شمارے میں 12 صفحات پر عالمی اردو کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں تینوں دن کی علمی، تعلیمی ادبی سرگرمیوں اور تکنیکی سیشن کے علاوہ اردو کی تہذیبی، ادبی و ثقافتی کارکردگی کی عکاسی و ترجمانی کی گئی ہے، نیز اردو کے تعلق سے مدبرانہ و دانشمندانہ مشورے بھی دیے گئے ہیں۔ قومی اردو کونسل سے گذارش ہے کہ وہ حیدرآباد دکن میں بھی ایک عالمی کانفرنس منعقد کریں۔ محمد معمور علی نے قومی تعلیمی پالیسی اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی میں تعلیم کے موقف اور اس کے استفادے کے تعلق سے بات عمدہ گفتگو کی ہے۔ ناز قادری نے 'ادب پر اساطیری اور مہماتی قصوں کا اطلاق' میں بہت سے حوالوں سے اپنی بات مکمل کی ہے۔ ابوبکر عباد نے 'اردو ناول نگاری' میں خواتین ناول نگاروں کا تعارف اور ان کے ناولوں کا اجمال میں ذکر کیا ہے۔ اکبری بیگم، نذر سجاد حیدر، عباسی بیگم، بیگم صغرا ہمایوں، اےض حسن بیگم، بیگم شاہنواز، ضیا بانو، طیبہ بیگم، حجاب امتیاز علی، والدہ افضل علی، صالحہ عابد حسین اور پھر رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، قمر جمالی وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس مضمون میں خواتین کے ناولوں کا بھرپور تعارف و احاطہ کیا ہے۔ سید اسرارالحق سبیلی نے پنچ تنتر کے اردو تراجم پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ محمد الیاس الاعظمی ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی کی حیات اور کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ایم اے کنول جعفری نے رفعت سروش جن کی آواز ریڈیو کی شناخت بن گئی تھی میں ان کی حیات اور ادبی و علمی خدمات کے علاوہ ریڈیو سے وابستگی اور تصانیف کا تفصیل سے احاطہ کیا ہے جو رفعت شناسی کے لیے مفید ہے۔ رفیع الدین ناصر نے 'جن کتابوں نے متاثر کیا' میں سائنسی مضامین اور اردو میں سائنسی کتابوں کا تجزیہ بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی پر ابوالبشر اور منور حسن کمال نے عمدہ مضامین تحریر کیے ہیں۔ پرواز احمد نے اردو اور بھوجپوری کے لسانی رشتے کو ظاہر کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ و اکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل 9603018825

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ موصول ہوا۔ حسب روایت نہایت عمدہ طباعت، سرورق پرکشش، بہترین کاغذ، معیاری مواد اور اعلیٰ ادبی ذوق کا شاہکار ہے۔ اردو دنیا ہمیشہ اپنے قارئین کو معیاری ادب، زبان و ثقافت کی ترویج، اور اردو کی تازہ ترین سرگرمیوں سے باخبر رکھنے میں پیش پیش رہا ہے اور یہ شمارہ بھی اس روایت کا بہترین تسلسل ثابت ہوا ہے۔

شمارے میں شامل تحقیقی و تنقیدی مضامین، خصوصی گفتگو کے تحت انٹرویو، کتابوں کی دنیا کے تحت تعارف و تبصرے اور عالمی ادبی منظرنامے پر مبنی تحریریں نہ صرف معلوماتی ہیں بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی قابل داد ہیں۔ خاص طور پر تازہ ادبی تخلیقات میں موجود تنوع اور فکری گہرائی نے گہرا تاثر چھوڑا۔ رسالہ میں شامل 'قومی تعلیم پالیسی 2020 اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی' کے عنوان سے ایک اہم مضمون ہے جس کے حوالے سے مضمون نگار محمد معمور علی نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی پر اہم گفتگو کی اور کہا کہ زبان و ادب سے جوڑ کر زیادہ جامع، قابل رسائی، اور جدید تقاضوں کے مطابق تعلیم کے میدان میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شخصیات پر بھی کئی معتبر تحریریں ہیں، جیسے ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی، اردو کا نند لال، جگدیش سرن سکسینہ راز، رفعت سروش وغیرہ۔ یادرفتگاں کے تحت تابش مہدی پر ابوالبشر اور پروفیسر انور ظہیر انصاری پر عبدالرحمٰن فیصل کے تفصیلی مضامین ہیں۔

علاوہ ازیں اس رسالہ میں نئے لکھنے والوں خاص طور پر ریسرچ اسکالر کے لیے ایک گوشہ نئے آسمان نئے ستارے بھی ہے جس کے تحت 'اردو اور بھوجپوری کا رشتہ' عنوان سے ایک مضمون ہے جسے پرواز احمد نے تحریر کیا ہے۔ اردو اور بھوجپوری زبانوں کا آپس میں گہرا لسانی، ثقافتی اور جغرافیائی رشتہ ہے۔ یہ دونوں زبانیں برصغیر کی اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ بھوجپوری خاص طور پر شمالی ہند کے بہار، مشرقی اتر پردیش (پوروانچل)، اور جھارکھنڈ کے کچھ حصوں میں بولی جاتی ہے۔ رسالہ کے آخر میں مختلف کتب پر گراں قدر تبصرے اور خبرنامہ کے تحت اردو دنیا کی خبریں قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں جس سے ادبی دنیا کی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شمارے میں موجود دیگر علمی مضامین اور تعلیمی گوشے بھی قارئین کے لیے مفید معلومات فراہم کرتے ہیں، جو طلبہ، اساتذہ اور محققین کے لیے یکساں طور پر اہم ہیں۔ اردو دنیا نہ صرف اردو زبان کا نمائندہ رسالہ ہے بلکہ اردو ادب کے قاری اور تخلیق کار کے درمیان ایک موثر اور مضبوط پل کا کردار بھی ادا کر رہا ہے۔ اپریل کا شمارہ اردو زبان کے روشن مستقبل کی ایک جھلک پیش کرتا ہے، جو یقیناً حوصلہ افزا ہے۔ اللہ کرے یہ علمی و ادبی سفر یوں ہی رواں دواں رہے اور اردو دنیا ہر ماہ قارئین کو اسی طرح ذہنی آسودگی اور علمی تازگی فراہم کرتا رہے۔

ڈاکٹر قرۃ العین، سینئر ٹرانسلیٹر اینڈ لینگویج ریسورس پرسن، انوو ادبی فاؤنڈیشن، (اے آئی سی ٹی ای)، بھارت سرکار

ایاز احمد خان

مادری زبان میں درس وتدریس

درس وتدریس میں مادری زبان کی اہمیت ایک ایسا موضوع ہے جس پر دنیا بھر میں متعدد تحقیقات، تجربات اور پالیسی سازوں کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ زبان کسی بھی معاشرتی نظام کی بنیاد ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے علم کا تبادلہ اور تعلیم کا عمل ممکن ہوتا ہے۔ بچے کی ابتدائی تعلیم میں مادری زبان کا استعمال ان کی ترقی کے لیے ایک لازمی عنصر ہے، کیونکہ یہ بچے کے ذہنی، جذباتی اور سماجی نشو ونما میں گہرا اثر ڈالتا ہے۔ مادری زبان وہ زبان ہوتی ہے جو بچہ اپنے گھر اور ماحول میں سب سے پہلے سیکھتا ہے اور یہ زبان اس کے لیے نہ صرف بات چیت کا ذریعہ ہوتی ہے بلکہ اس کی شناخت اور ثقافت کا حصہ بھی ہوتی ہے۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کے فوائد بے شمار ہیں، جو نہ صرف تعلیمی معیار کو بہتر بناتے ہیں بلکہ بچوں کی ذاتی شناخت، ثقافتی تعلقات اور ذہنی صلاحیتوں کو بھی مضبوط کرتے ہیں۔ ماہرین تعلیم اور نفسیات کے مطابق، زبان انسان کے ذہن کی ساخت کو متاثر کرتی ہے اور مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے بہتر طریقے سے خیالات کو سمجھنے اور ان کا اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، مادری زبان کے ذریعے بچے اپنے جذبات اور خیالات کو زیادہ بہتر انداز میں بیان کرسکتے ہیں، جس سے ان کی خود اعتمادی اور ذہنی سکون میں اضافہ ہوتا ہے۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ”ابتدائی عمر میں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعلیمی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور وہ زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ سیکھنے کے عمل میں شامل ہوتے ہیں“ (یونیسکو، 2003)۔

مختلف تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم بچوں کی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ کرتی ہے اور ان کے سیکھنے کی استعداد کو بڑھاتی ہے۔ بچے جب اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو انھیں اپنے خیالات کو بہتر طور پر سمجھنے اور پیچیدہ تصورات کو آسانی سے سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ تعلیمی ماہرین کے مطابق، مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا بچوں کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے جو بعد میں دوسری زبانوں اور پیچیدہ موضوعات کے لیے ایک بہترین راستہ بناتی ہے۔ اس کے علاوہ، مادری زبان میں تعلیم دینے سے بچے اپنے ماحول اور کمیونٹی کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کرتے ہیں، جس سے ان کی ثقافتی شناخت مضبوط ہوتی ہے۔ یہ عمل بچوں کی خود اعتمادی اور ذہنی سکون میں اضافہ کرتا ہے، جو کہ تعلیمی کامیابی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہندوستان میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی ابتدائی تعلیم میں مادری زبان کو فروغ دینے کی تجویز دی ہے تاکہ بچے بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کرسکیں۔ اس پالیسی کے تحت یہ تجویز کی گئی ہے کہ تعلیمی ادارے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم فراہم کریں تاکہ وہ اپنے خیالات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں اور ان کے سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوسکے۔ یہ تجویز اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ مادری زبان میں تعلیم نہ صرف بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بہتر بناتی ہے بلکہ ان کی ثقافت اور معاشرتی تعلقات کو بھی مضبوط کرتی ہے۔ اس کے علاوہ، مادری زبان میں تدریس کا اثر نہ صرف تعلیمی میدان میں ہوتا ہے بلکہ یہ بچے کی ذاتی شناخت اور سماجی تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ جب بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، تو وہ اپنے خاندان، کمیونٹی اور ثقافت کے ساتھ ایک گہرا رشتہ قائم کرتے ہیں، جس سے ان کی سماجی زندگی میں بہتری آتی ہے۔ اس سے بچوں میں ثقافتی روایات اور اقدار کا شعور پیدا ہوتا ہے، جو کہ ان کے جذباتی اور سماجی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

تاریخی اور نظریاتی پس منظر

درس وتدریس میں زبان کے استعمال کا تعلق انتہائی قدیم اور تاریخ کے کئی ادوار سے ہے، جہاں مختلف تہذیبوں اور معاشروں میں مادری زبان کو علم اور فہم کی ترسیل کا سب سے اہم ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں تعلیم کا مقصد صرف معلومات کی ترسیل نہ تھا بلکہ یہ ایک ایسا عمل تھا جس کے ذریعے انسان اپنی ذہنی، سماجی اور ثقافتی ترقی کو بہتر بناتا تھا۔ مختلف تہذیبوں میں یہ تسلیم کیا گیا کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے سے ان کے سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں یہ حقیقت تسلیم کی گئی ہے کہ جب بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے تو وہ بہتر طریقے سے سیکھتے ہیں، اس کے علاوہ، ان کی ذہنی وتعلیمی ترقی میں بھی نمایاں بہتری آتی ہے۔ مثال کے طور پر، افریقہ اور جنوب مشرق ایشیا کے کئی ممالک میں مادری زبان کی بنیاد پر تعلیمی منصوبے کامیابی سے چلائے جا رہے ہیں۔ نائجیریا میں کی گئی ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ وہ بچے جو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کی تعلیمی کارکردگی ان بچوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہوتی ہے جو غیر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح، فلپائن اور لاؤس جیسے ممالک میں بھی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے سے بچوں کی سیکھنے کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ہے۔

مادری زبان کے کردار کو سمجھنے کے لیے مختلف تعلیمی ماہرین نے کئی نظریات پیش کیے ہیں، جن میں لیو ویگوٹسکی جیم کمنز اور جین پیاجے کے نظریات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان ماہرین کے نظریات کی بنیاد پر یہ کہا جا

سکتا ہے کہ مادری زبان کا استعمال بچوں کی ذہنی اور سماجی ترقی میں ایک اہم عنصر ہے:

1. **لیو ویگوٹسکی کا نظریہ سماجی ترقی**

لیو ویگوٹسکی نے زبان اور تعلیم کے درمیان تعلق پر گہری تحقیق کی اور اس بات پر زور دیا کہ زبان انسان کی ذہنی نشو ونما میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ویگوٹسکی کا ماننا تھا کہ انسان اپنی سوچوں کو زبان کے ذریعے ہی ترتیب دیتا ہے اور اسی زبان کے ذریعے وہ اپنے خیالات کو جلا دیتا ہے۔ ان کے مطابق، زبان اور سماجی روابط کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم دینے سے بچوں کی سوچنے کی صلاحیتیں بہتر ہو جاتی ہیں۔ ویگوٹسکی کے نظریہ 'زون آف پروگزیمل ڈیولپمنٹ' (Zone of Proximal Development) کے مطابق، مادری زبان بچوں کو زیادہ مواقع فراہم کرتی ہے تاکہ وہ پیچیدہ خیالات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ ان کے مطابق، مادری زبان بچوں کے سیکھنے کی صلاحیت کو بڑھاتی ہے اور انہیں اپنے ماحول کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے، جس سے ان کی تعلیمی کارکردگی میں بھی بہتری آتی ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ویگوٹسکی نے اپنی تحقیق میں یہ دکھایا کہ بچوں کو جب مادری زبان میں سکھایا جاتا ہے تو وہ اپنے ساتھیوں اور استاد سے بہتر طریقے سے بات چیت کرتے ہیں، جس سے ان کے سیکھنے کے عمل میں تیزی آتی ہے۔

2. **جم کمنز اور تھریشولڈ تھیوری**

جم کمنز نے مادری زبان کے بارے میں اپنی 'تھریشولڈ تھیوری' میں کہا کہ جب بچے اپنی مادری زبان میں ماہر ہوتے ہیں، تو وہ دوسری زبان میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات بڑھا لیتے ہیں۔ کمنز کے مطابق، مادری زبان بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے اور ان کی تعلیمی کارکردگی میں بہتری لاتی ہے۔

3. **جین پیاجے کا نظریہ ذہنی ترقی**

جین پیاجے، جو کہ ایک سوئس ماہر نفسیات اور ذہنی ارتقا کے ماہر تھے، نے سیکھنے کے عمل اور ذہنی ترقی پر گہری تحقیق کی۔ پیاجے کے نظریہ ذہنی ارتقا کے مطابق، بچے اپنی دنیا کو اپنی مادری زبان میں زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی زبان میں ان تمام تجربات کو محسوس کرتے ہیں جو وہ اپنے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ پیاجے کے مطابق، ابتدائی عمر میں مادری زبان میں تعلیم بچوں کی "Concrete Operational Stage" میں سوچنے کی صلاحیتوں کو بڑھا سکتی ہے، کیونکہ اس مرحلے میں بچے مادی اور ٹھوس حقائق کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ پیاجے کے مطابق، مادری زبان میں تعلیم دینے سے بچے نہ صرف اپنے خیالات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں بلکہ پیچیدہ خیالات کو بھی آسانی سے اپنے ذہن میں ترتیب دے سکتے ہیں۔ جب بچے اپنی مادری زبان میں سیکھتے ہیں، تو ان کے ذہن میں پہلے سے موجود خیالات اور تصورات کو بہتر طریقے سے ترتیب دیا جا سکتا ہے، جس سے ان کی سیکھنے کی صلاحیت میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادری زبان میں تعلیم بچوں کی ذہنی سطح پر انتہائی مثبت اثرات مرتب کرتی ہے اور انہیں بہتر طریقے سے سوچنے اور سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔

جیم کمنز، ویگوٹسکی اور پیاجے کے نظریات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ زبان اور سیکھنے کے عمل کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور مادری زبان کے ذریعے بچوں کی تعلیمی صلاحیتوں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں مادری زبان کا استعمال نہ صرف بچوں کے سیکھنے کے عمل کو تیز کرتا ہے بلکہ اس میں مؤثر بھی بنا دیتا ہے۔ جب بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے تو وہ اپنی ثقافت اور شناخت سے جڑے رہتے ہیں اور اسی زبان کے ذریعے وہ اپنی سوچ کو بہتر طریقے سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف ان کی ذہنی نشو ونما میں مددگار ثابت ہوتا ہے بلکہ ان کی سماجی اور ثقافتی ترقی کو بھی فروغ دیتا ہے۔

مادری زبان میں درس و تدریس کے فوائد

درس و تدریس میں مادری زبان کا استعمال نہ صرف بچوں کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کے لیے فائدہ مند ہے بلکہ ان کی نفسیاتی، سماجی، اور ثقافتی نشو ونما پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مادری زبان وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے بچے اپنے خیالات کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور اس میں اظہار کرتے ہیں۔ اس کے استعمال سے نہ صرف بچوں کی تعلیمی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ان کی شخصیت اور معاشرتی تعلقات میں بھی بہتری آتی ہے۔

1. **ذہنی نشو ونما:** مادری زبان میں تعلیم بچے کی ذہنی نشو ونما میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ جب بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ان کے لیے معلومات کو سمجھنا، تجزیہ کرنا اور نئے خیالات کو اپنی زبان میں بیان کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے ان کی سوچنے کی صلاحیت، تنقیدی تجزیہ، اور یادداشت میں بہتری آتی ہے۔ ماہر تعلیم جم کمنز (1979) نے اس بات کو اجاگر کیا کہ مادری زبان میں تعلیم بچے کے ذہنی ارتقاء کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کمنز کے مطابق، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچے علمی لحاظ سے زیادہ مضبوط اور پائیدار بنیاد رکھتے ہیں، جس کی بدولت وہ نئی معلومات کو بہتر طریقے سے جذب کرتے ہیں۔ ان کی ذہنی صلاحیتوں میں تیزی سے ترقی ہوتی ہے اور وہ مختلف مسائل کو بہتر طریقے سے حل کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس طرح، مادری زبان میں تعلیم بچوں کی ذہنی نشو ونما کو تیز کرتی ہے اور ان کے سیکھنے کی صلاحیتوں کو بہتر بناتی ہے۔

2. **تعلیمی کارکردگی:** مختلف تحقیقی مطالعے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے دیگر زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق، مادری زبان میں تعلیم دینے سے بچوں کے علمی نتائج میں نمایاں بہتری آتی ہے اور وہ تعلیمی عمل میں زیادہ اعتماد کے ساتھ شریک ہوتے ہیں (یونیسکو، 2003)۔

یونیسکو کی تحقیق میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے امتحانات میں بہتر کارکردگی دکھاتے ہیں کیونکہ ان کے لیے معلومات کا تجزیہ اور سیکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم میں مادری زبان کے استعمال سے بچوں کی سیکھنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، مادری زبان میں تعلیم بچوں کو اپنے خیالات کا بہتر اظہار کرنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے، جس سے ان کی تعلیمی کامیابی مزید مستحکم ہوتی ہے۔

3. **نفسیاتی اور جذباتی فوائد:** مادری زبان میں تعلیم بچوں کی نفسیاتی اور جذباتی حالت پر بھی مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ جب بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، تو انہیں خود اعتمادی اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی زبان میں اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کو بہتر طریقے سے بیان کر سکتے ہیں۔ یہ خود اعتمادی ان کے تعلیمی عمل میں شامل ہونے اور دیگر

سماجی سرگرمیوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے اپنی تعلیمی زندگی اور روزمرہ کی سرگرمیوں میں زیادہ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ انھیں اپنی زبان، ثقافت، اور روایات سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس سے ان کی جذباتی سکونت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم بچوں کے اندر جذباتی تحفظ پیدا کرتی ہے، جو کہ ان کی نفسیاتی ترقی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے نتیجے میں، بچوں کی ذہنی حالت مضبوط ہوتی ہے اور وہ تعلیمی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی اور اعتماد کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔

4. سماجی اور ثقافتی شناخت: مادری زبان میں تعلیم بچوں کی سماجی اور ثقافتی شناخت کو مستحکم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مادری زبان کے ذریعے بچے اپنی ثقافت، روایات، اور اخلاقی اقدار سے جڑے رہتے ہیں، جو ان کی شخصیت کی بنیاد بناتی ہیں۔ جب بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنے ماحول، خاندان، اور سماج سے زیادہ گہری وابستگی محسوس کرتے ہیں، جس سے ان کا سماجی اعتماد اور ثقافتی شناخت مضبوط ہوتی ہے۔ مادری زبان میں تعلیم نہ صرف بچوں کی ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعے بین النسلی روابط میں بھی بہتری آتی ہے۔ مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، اور یہ عمل معاشرتی ہم آہنگی اور یکجہتی کو فروغ دیتا ہے۔ مادری زبان کے ذریعے بچوں کو اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے کا موقع ملتا ہے، جو کہ ان کی ذاتی اور سماجی نشوونما کے لیے انتہائی اہم ہے۔

کامیاب نفاذ کی مثالیں

حالیہ دہائیوں میں، بہت سے ممالک نے اس بات کا گہرائی سے ادراک کیا ہے کہ مادری زبان پر مبنی تعلیم بچوں کی تعلیمی ترقی اور عمومی فلاح و بہبود پر گہرا اثر ڈال سکتی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جب بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے، تو وہ تیز تر سیکھتے ہیں، معلومات کو بہتر طریقے سے یاد رکھتے ہیں، اور ذہنی و سماجی صلاحیتوں میں مضبوطی حاصل کرتے ہیں۔ فلپائن، فن لینڈ، جنوبی افریقہ، کینیا، نیوزی لینڈ، ایتھوپیا اور سویڈن جیسے ممالک نے دنیا بھر میں یہ ثابت کیا ہے کہ جب مادری زبان میں تعلیم کو ترجیح دی جاتی ہے، تو تعلیمی کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان ممالک نے ایسی پالیسیوں کو اپنایا ہے جن میں بچوں کو ان کی پہلی زبان میں تعلیم دینے کو اہمیت دی گئی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم بچوں کی سماجی اور ثقافتی شناخت کو مستحکم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مادری زبان کے ذریعے بچے اپنی ثقافت، روایات اور اخلاقی اقدار سے جڑے رہتے ہیں، جو ان کی شخصیت کی بنیاد بناتی ہیں۔ جب بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنے ماحول، خاندان اور سماج سے زیادہ گہری وابستگی محسوس کرتے ہیں، جس سے ان کا سماجی اعتماد اور ثقافتی شناخت مضبوط ہوتی ہے۔

(1) فلپائن نے 2009 میں مادری زبان پر مبنی کثیر لسانی تعلیم based Multilingual , MTB-MLE) (Mother Tongue-,Education) پروگرام متعارف کرایا، جو ایک جدید اقدام تھا جس کا مقصد فلپائنی بچوں کی مادری زبانوں کو ابتدائی تعلیم میں تدریس کا ذریعہ بنانا تھا۔ اس پالیسی سے پہلے، زیادہ تر فلپائنی طلبا کو انگریزی یا فلپائنی زبان میں پڑھایا جاتا تھا، جو ان کی مقامی بولیوں سے مختلف تھیں اور اس سے سیکھنے میں مشکلات پیش آتی تھیں۔ MTB-MLE کے تحت، ابتدائی تعلیم میں بچوں کو ان کی مادری زبان میں تدریس دی جاتی ہے، خاص طور پر کنڈرگارٹن سے تیسری جماعت تک، اس کے بعد دیگر زبانوں جیسے فلپائنی اور انگریزی کو بتدریج متعارف کرایا جاتا ہے۔ اس ماڈل کی کامیابی کو بڑھتی ہوئی خواندگی کی شرح، بہتر فہمی کی سطح، اور خاص طور پر دیہی اور مقامی کمیونٹیز میں تعلیمی کارکردگی میں بہتری سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس پالیسی نے نہ صرف تعلیمی نتائج کو بہتر بنایا ہے بلکہ مقامی زبانوں اور ثقافتوں میں فخر کو بھی فروغ دیا ہے، جو عموماً قومی نصاب میں نظرانداز کی جاتی ہیں۔

(2) فن لینڈ کو دنیا کے بہترین تعلیمی نظاموں میں سے ایک کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ فن لینڈ کی تعلیمی کامیابی کے پیچھے ایک بڑی وجہ مادری زبان کی تعلیم پر مضبوط زور ہے، خاص طور پر ابتدائی مراحل میں۔ فن لینڈ کے بچے اپنی ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان فنش، میں حاصل کرتے ہیں اور پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کے دوران یہ زبان جاری رکھی جاتی ہے۔ فن لینڈ کا تعلیمی نظام دو لسانیت پر بہت زور دیتا ہے، جس میں بچوں کو سویڈش (جو فن لینڈ کی دوسری سرکاری زبان ہے) اور انگریزی جیسی دوسری زبانوں کو ابتدائی عمر سے سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ کثیر لسانی طریقہ بچوں کی مادری زبان سے متصادم نہیں ہوتا، بلکہ اسے ایک متوازن تعلیمی فریم ورک کے تحت مزید تقویت ملتی ہے۔ فن لینڈ کی کامیابی اس کے جامع اور شامل تعلیمی ماڈل میں ہے، جو تمام طلبا کو، چاہے ان کی لسانی یا ثقافتی پس منظر کچھ بھی ہو، یکساں مواقع فراہم کرتا ہے۔ فن لینڈ کے تعلیمی نظام کی مادری زبان کو برقرار رکھنے اور غیر ملکی زبانوں کو شامل کرنے کے عزم کی بدولت فن لینڈ نے مسلسل عالمی تعلیمی درجہ بندی میں اول پوزیشن حاصل کی ہے، خصوصاً خواندگی اور مسئلہ حل کرنے کی مہارتوں میں۔

(3) جنوبی افریقہ، جو اپنی ثقافتی اور لسانی تنوع کے لیے مشہور ہے، نے اپنے اسکولوں میں مادری زبان کی تعلیم کو شامل کرنے میں اہم پیش رفت کی ہے۔ اس ملک میں گیارہ سرکاری زبانیں ہیں، اور حکومت نے مادری زبان کی تدریس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات کا عہد کیا ہے کہ تعلیمی کامیابی، سماجی ہم آہنگی اور ثقافتی شناخت کو فروغ دینے کے لیے یہ ضروری ہے۔ جنوبی افریقہ کی زبان تعلیم پالیسی (LiEP) میں ابتدائی جماعتوں میں طلباء کی مادری زبانوں کا استعمال لازمی قرار دیا گیا ہے، جو انہیں بنیادی تصورات کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ پالیسی یہ بھی اجازت دیتی ہے کہ بعد کی جماعتوں میں انگریزی اور افریقیسی جیسے اضافی زبانوں کو آہستہ آہستہ متعارف کرایا جائے۔

(4) کینیا، جو کہ 40 سے زائد مقامی زبانوں کا گھر ہے، نے بھی مادری زبان کی تعلیم کے ذریعے اہم پیش رفت کی ہے۔ 2003 سے، کینیائی حکومت نے مادری زبان کی تدریس کو نصاب میں شامل کیا ہے، جو ابتدائی بچپن کی تعلیم سے لے کر پرائمری اسکول تک ہے۔ یہ پالیسی بچوں کو ان کی پہلی زبان میں سیکھنے کی ترغیب دیتی ہے، اور اس کے بعد انگریزی اور سواہلی زبانوں کا تدریجاً

تعارف کرایا جاتا ہے۔ کینیا میں مادری زبان کی تعلیم کو اپنانا خواندگی کی شرح میں بہتری لانے میں کامیاب رہا ہے، خصوصاً دیہی اور پسماندہ کمیونٹیز میں۔ یہ طریقہ تعلیم اور بچوں کی روزمرہ زندگی کے تجربات کے درمیان پل کا کام کرتا ہے، جس سے نئے تصورات کو بہتر طور پر سمجھا اور یاد رکھا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ کینیا کی مادری زبان کی تعلیم کی پالیسی نے متعدد مقامی زبانوں کو زندہ رکھنے اور ان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے، جو عموماً نوآبادیاتی زبانوں کے حق میں نظر انداز کی جاتی ہیں۔

(5) نیوزی لینڈ ایک ایسا مثالی ملک ہے جہاں مادری زبان کی تعلیم ثقافتی احیاء اور تعلیمی کامیابی کا محرک بن سکتی ہے۔ ماؤری زبان امیگریشن پروگرام، جسے کورا کاپاپا ماؤری کے نام سے جانا جاتا ہے، 1980 کی دہائی میں شروع کیا گیا تھا تاکہ ماؤری زبان کو محفوظ کیا جا سکے اور اسے اسکولوں میں فروغ دیا جا سکے۔ اس پروگرام نے ابتدائی عمر کے بچوں میں زبان و ثقافت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سالوں کے دوران، ماؤری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے اسکولوں نے تعلیمی کارکردگی میں اضافہ اور ماؤری طلباء میں ثقافتی شناخت کو مضبوط کرنے کے مثبت نتائج دکھائے ہیں۔ ماؤری زبان کی تعلیم کا یہ اقدام نہ صرف ماؤری بچوں کے لیے فائدہ مند رہا ہے بلکہ نیوزی لینڈ کے وسیع تر تعلیمی نظام کو بھی لسانی تنوع اور شمولیت کے ذریعے مزید مالا مال کیا ہے۔

(6) ایتھوپیا نے بھی اپنی متنوع نسلی گروپوں کے لیے مادری زبان کی تعلیم کی ایک مضبوط پالیسی اپنائی ہے۔ 1994 میں، ایتھوپیا نے زبان تعلیم کی پالیسی متعارف کرائی، جس کا مقصد ابتدائی آٹھ سالوں میں بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینا تھا۔ یہ پالیسی اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ مختلف لسانی پس منظر رکھنے والے بچوں کو ایسی زبان میں تعلیم حاصل ہو جو وہ سمجھیں، تاکہ مساوات کو فروغ ملے اور تعلیمی نتائج میں بہتری آئے۔ مادری زبان کی پالیسی نے ایتھوپیا میں ڈراپ آؤٹ کی شرح کو کم کیا ہے اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں خواندگی کی شرح میں اضافہ کیا ہے۔ یہ طریقہ بچوں کو تعلیمی عمل میں زیادہ شامل ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے اور ان کی تعلیمی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے۔

(7) سویڈن کا تعلیمی نظام ان بچوں کے لیے مادری زبان کی تدریس فراہم کرتا ہے جو سویڈش کے علاوہ کوئی اور زبان بولتے ہیں۔ حکومت غیر ملکی طلبا کے لیے خصوصی مادری زبان کی تعلیم فراہم کرتی ہے، جس سے وہ سویڈش سیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان میں بھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نظام نے غیر ملکی طلباء کو سویڈش تعلیمی نظام میں ضم کرنے میں مدد فراہم کی ہے، بغیر ان کی لسانی اور ثقافتی ورثے کو کھوئے۔ اس طریقے کی کامیابی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیر ملکی طلباء میں تعلیمی کامیابی کی شرح بہت زیادہ ہے، جو دونوں مادری زبان اور سویڈش میں مہارت حاصل کرتے ہیں، جو سماجی انضمام اور تعلیمی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

فلپائن، فن لینڈ، جنوبی افریقہ، کینیا، نیوزی لینڈ، ایتھوپیا اور سویڈن جیسے ممالک کی کامیاب کہانیاں یہ ثابت کرتی ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم صرف لسانی ترجیح کا معاملہ نہیں بلکہ تعلیمی کامیابی اور سماجی انضمام کے لیے ایک طاقتور آلہ ہے۔ مادری زبان کی تعلیم کی پالیسیوں کو اپنانے سے ان ممالک نے نہ صرف خواندگی کی شرح اور تعلیمی کارکردگی کو بہتر بنایا ہے بلکہ ثقافتی شناخت کو محفوظ رکھنے، سماجی شمولیت کو فروغ دینے اور تمام بچوں کے لیے یکساں مواقع فراہم کرنے میں بھی مدد کی ہے۔ ایک عالمی سطح پر، جہاں دنیا تیزی سے عالمی سطح پر جڑ رہی ہے، مادری زبان کی تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرنا تعلیمی نظام کو مزید مساوات، شمولیت اور کامیابی کی طرف لے جانے کے لیے ضروری ہے۔ دوسرے ممالک کو ان مثالوں سے سیکھنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ کیسے ایسی پالیسیوں کو اپنانا تمام بچوں کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے، آخرکار یہ ایک زیادہ شمولیتی اور مؤثر عالمی تعلیمی نظام کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے۔

مجموعی طور پر، یہ کہا جا سکتا ہے کہ مادری زبان میں تدریس ایک نہایت اہم قدم ہے جو بچوں کی ذہنی، جذباتی، اور سماجی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہ صرف بچوں کی تعلیمی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے بلکہ ان کی ثقافتی شناخت اور معاشرتی تعلقات کو بھی مضبوط کرتی ہے۔ لہٰذا، یہ ضروری ہے کہ تعلیمی ادارے اور حکومتیں مادری زبان میں تعلیم کو فروغ دیں اور اس کی اہمیت کو تسلیم کریں، تاکہ تمام بچے ایک برابری کی بنیاد پر تعلیمی میدان میں آگے بڑھ سکیں۔ تعلیم میں مادری زبان کا کردار بچوں کی علمی، سماجی، اور جذباتی ترقی کے لیے نہایت اہم ہے۔ مختلف تحقیقی مطالعے اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم سے بچوں کی سیکھنے کا تجربہ اور تعلیمی کارکردگی میں بہتری آتی ہے۔ مادری زبان کی بنیاد پر ابتدائی تعلیم بچوں کو ایک ایسا تعلیمی ماحول فراہم کرتی ہے جس میں وہ خود کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اپنے کلچر اور شناخت کے قریب رہتے ہیں۔ اس لیے تعلیمی پالیسیوں میں مادری زبان پر مبنی تعلیم کے فروغ کے لیے اقدامات کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ ایک معیاری اور مساوی تعلیمی نظام کو یقینی بنایا جا سکے۔

حوالہ جات

1 رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں، کورس بیچلر آف ایجوکیشن، سمسٹر اول، سن اشاعت 2017، حیدرآباد

2 رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، اکتساب اور تدریس، کورس بیچلر آف ایجوکیشن سمسٹر دوم، سن اشاعت، 2022، حیدرآباد

3 یونیسکو، عالمی تعلیم مانیٹرنگ رپورٹ (2021)، گلوبل ایجوکیشن مانیٹرنگ رپورٹ'
https://en.unesco.org/gem-report/

4 یونیسکو، 'اگر آپ سمجھ نہیں سکتے تو آپ کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ (2018) تعلیمی نظام میں زبان کی اہمیت پر مبنی رپورٹ
https://unesdoc.unesco.org/ark:/48223/pf0000261895

4 یونیسف، 'زبان کی پالیسی اور عملی اقدامات کے بچوں کی تعلیم پر اثرات' (2016) زبان کے تعلیمی اثرات پر تحقیق
https://www.unicef.org/documents/impact-language-policy-and-practice-children-learning

5 ورلڈ بینک، 'تعلیمی غربت: ایک عالمی چیلنج کی جھلک' (2019) تعلیم میں زبان اور خواندگی کی اہمیت پر رپورٹ
https://www.worldbank.org/en/publication/learning-poverty

6 عالمی شراکت برائے تعلیم، 'مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت' (2011) تعلیم میں مادری زبان کے کردار پر رپورٹ
https://www.globalpartnership.org/

8 ہارون ایوب، اردو کی درس و تدریس کے مسائل، بھوپال بک ہاؤس، بھوپال، 1983

■

Dr. Aiyaz Ahmad Khan
Assistant Professor, Dept of Education
AMU Centre Murshibad
Jangipur Barrage (Ahiran)-742149 (WB)
Mob.:8348564789
aakhan_co@myamu.ac.in

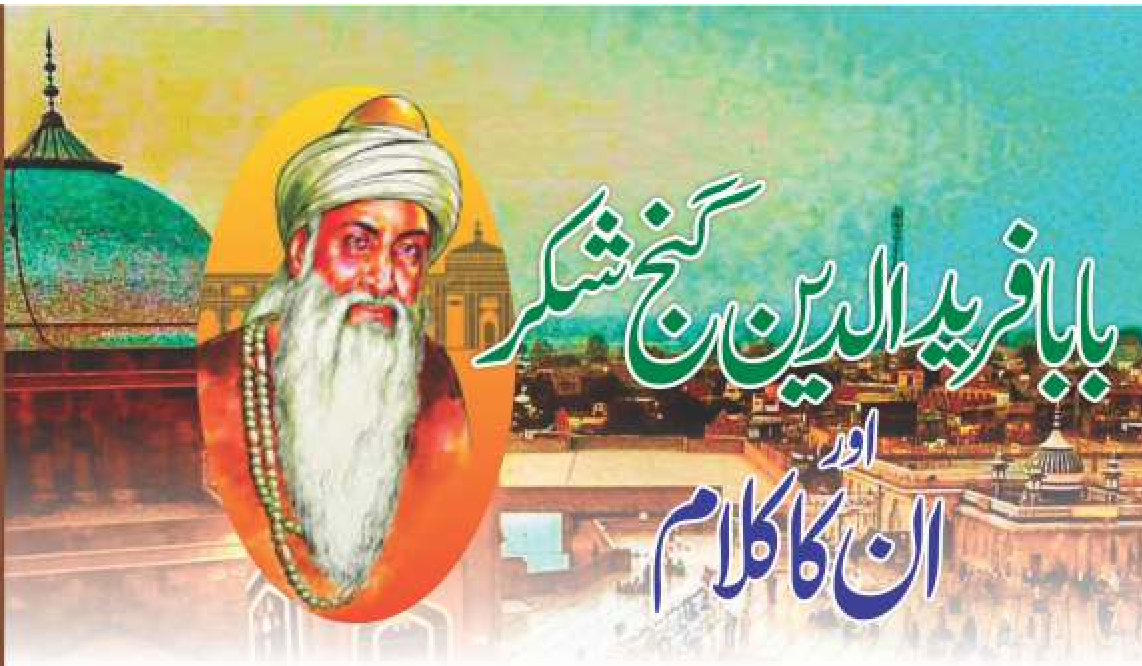

بابا فرید الدین گنج شکر اور ان کا کلام

ابراہیم افسر

ہندوستان دورِ قدیم سے ہی رشیوں، منیوں، جوگیوں، ولیوں، درویشوں اور صوفیوں کی آماج گاہ رہا ہے۔ یہاں کی سرسبز و شاداب اور مردم خیز مٹی نے ان افکار و نظریات کو ہمیشہ فروغ دیا جن میں یک جہتی، اخوت و بھائی چارے کی باتیں موجزن ہوں۔ شمالی ہندوستان بالخصوص دریائے سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں جوگیوں، صوفیوں اور ولیوں نے اپنی نیک سیرت اور پروقار شخصیت سے لوگوں کے اذہان و قلوب کی آلودگی کو روحانیت کے نور سے صاف کیا۔

سرزمینِ پنجاب میں توحید کی صدا کو عام کرنے والے ایک رفیع المرتبت شخصیت کا نام حضرت فرید الدین گنج شکر مسعود ہے جنھوں نے اپنے پاکیزہ خیالات، ملفوظات، نیک سیرت، پروقار شخصیت اور سماجی، اصلاحی، فلاح و بہبود کے کارناموں سے عوام و خواص کو متاثر کیا۔ حضرت بابا فریدؒ نے مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر لوگوں تک حق و صداقت اور توحید کا پیغام پہنچایا۔ ان کی روحانی اور تزکیۂ نفس سے متعلق باتوں کو عوام و خواص قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے خود اپنے کلام میں اپنا تعارف 'کملی' یعنی اونی چادر میں لپٹے ہوئے درویش کے طور پر پیش کیا۔ در اصل صوفیوں کی اصطلاح میں لفظ صوفی کا مطلب اونی یا موٹے کپڑے پہن کر خود کو دنیا سے الگ کر لینا اور خلوت میں زندگی بسر کر کے خدا کی رفاقت و قرابت حاصل کرنا ہے۔

حضرت بابا فرید 1173 میں ملتان کے کھتوال علاقے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام مسعود تھا جب کہ فرید کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد جمال الدین اور والدہ قرسم بی بی تھیں۔ فریدؒ کی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر ان کی والدہ اور اساتذہ کا تھا۔ قرسم بی بی ایک دیندار خاتون تھیں۔ ان کی والدہ نے شیخ فرید کو بچپن سے ہی صوم و صلاۃ کی پابندی کی ترغیب دی۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ فریدؒ کو شکر گنج کا خطاب ان کی ماں نے ان کے کرامات دیکھنے کے بعد عطا کیا۔ شیخ فرید کو بچپن سے ہی شکر (شیرینی) سے لگاؤ تھا۔ اس مناسبت سے بہت سی روایتیں ان سے منسوب ہیں۔ فریدؒ کی ابتدائی تعلیم کھتوال میں قائم مولانا منہاج ترمذی کے مدرسے میں ہوئی۔ یہاں پر انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ ان کے اساتذہ نے ان کی علمی ریاضت، لگن و جستجو کو دیکھتے ہوئے انھیں 'قاضی بچہ دیوانہ' کے لقب سے پکارا۔ زمانۂ طالب علمی میں ہی ان کی ملاقات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی۔ فریدؒ ان سے متاثر ہوئے اور گزارش کی کہ وہ انھیں اپنا مرید بنا لیں۔ لیکن مرشد نے فرمایا کہ پہلے تعلیم مکمل کیجیے اس کے بعد دہلی ان کی خانقاہ میں تشریف لایئے۔ مرشد کے حکم کی تعمیل میں فریدؒ نے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے پانچ سال قندھار میں گزارے۔ یہاں سے آپ بخارا، بغداد، غزنی، بدخشہ، اور مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اس طویل مسافرت کے بعد فریدؒ ہندوستان واپس آ کر اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ اپنے مرشد کے حکم پر شیخ فرید نے ہانسی میں خانقاہ قائم کی۔ یہاں پر آپ نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر آنے کی تلقین کی۔ 1235 میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات کے بعد آپ کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ وہ ایک بار پھر دہلی میں مقیم رہے۔ لیکن دہلی کی سیاسی سازشوں سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس ہانسی چلے گئے۔ یہاں کچھ سال قیام کرنے کے بعد انھوں نے اپنی خانقاہ اجودھن (پاک پٹن) میں قائم کی۔ یہیں پر آپ کا انتقال 1265 میں ہوا۔ فریدؒ کے انتقال کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ کو ان کا خلیفہ مقرر کیا گیا۔ انھوں نے اپنی خانقاہ دہلی میں قائم کی۔

بابا فریدؒ کا تعلق صوفیوں کے مشہور چشتیہ سلسلے سے تھا۔ چشتیہ سلسلے کے بانی حضرت خواجہ ابو اسحاقؒ تھے۔ چشتیہ سلسلے کا منبع افغانستان کے شہر ہرات کا ایک گاؤں 'چشت' ہے۔ اسی گاؤں میں خواجہ معین الدین حسن سنجری کا قیام تھا، جنھوں نے اپنی خانقاہ اجمیر میں پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں قائم کی 1۔ اجمیر کے بعد چشتیہ سلسلے کی دو اہم خانقاہیں دہلی میں حضرت بختیار کاکیؒ اور حضرت حمید الدینؒ نے ناگور میں قائم کیں۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اپنے پیر بختیار کاکیؒ کے حکم کو مقدم رکھتے ہوئے اجودھن (پاک پٹن) میں خانقاہ قائم کی، جہاں پر سادہ مزاجی اور مرتاض طرزِ زندگی گزارنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ حضرت بابا فرید کے مریدوں میں حضرت نظام الدین اولیاؒ اور علاؤ الدین صابر کلیریؒ کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ دونوں صوفی بزرگ اپنے مرشد فریدؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی خانقاہیں دہلی اور کلیر میں قائم کیں۔ ان دونوں جگہوں کی زیارت سے برصغیر کے بہت سے لوگ اپنی زندگی کے لیے روحانی سکون تلاش کرتے ہیں۔ جمال الدین ہانسوی بھی فریدؒ کے عزیز ترین شاگرد تھے جو شرف الدین بو علی شاہ قلندر پانی پتی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ جمال الدین ہانسوی کو حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی اپنی شاگردی میں لینا چاہتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے فریدؒ کی روحانیت سے متاثر ہو کر انھیں کے ہاتھ پر بیعت کی۔

فریدؒ نے اسلامی تعلیمات بالخصوص روح کی پاکیزگی اور اس کی تازگی پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔ ان سے ملنے والوں میں امرا، فقرا، وزرا اور عوام تھے۔ انھوں نے ہمیشہ غریبوں کی مدد کو مقدم رکھا۔ ان کے پاس جو تحفے تحائف آتے انھیں فوراً غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ فریدؒ نے جو تعلیم اپنے مریدوں کو دی، اس پر وہ پہلے عمل کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں کسی طرح کا جھول اور تضاد نہیں تھا۔ یعنی وہ جو کہتے اس پر کھرا اتر کر عوام کو دکھاتے تھے۔ انھوں نے عوام سے رابطے کے لیے ملتانی پنجابی اور ہندوی زبان کا استعمال کیا۔ ان کے شاگردوں نے ان کے کلام کو سینہ بہ سینہ محفوظ کیا۔ فریدؒ نے اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے کس زبان کا استعمال کیا، اس کے بارے میں زاہد ابرول رقم طراز ہیں:

''بابا فریدؒ کو عربی اور فارسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ملتان میں پیدا ہونے اور شمالی ہندوستان کی مختلف جگہوں میں مقیم ہونے کی وجہ سے اس زمانے کی ملتانی، پنجابی، پراکرت، اپ بھرنس اور برج وغیرہ پر مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے اس کلام میں عربی اور فارسی کے الفاظ پنجابی زبان کے سانچے میں ڈھال کر انھیں نئی شکل اور نیا روپ دیا ہے۔ جیسے ملک الموت کی جگہ ملک، مشائخ شیخ کی جگہ مسائک سیخ، فرشتہ کی جگہ فرستہ، وضو کی جگہ اجو اور نماز کی جگہ نواج وغیرہ۔ حضرت بابا بابا فریدؒ کا کلام اپنی سادگی، عام لوگوں میں بولی جانے والی زبان کا استعمال اور اوّل درجے کی شاعری کی وجہ سے تقریباً پنجابی بولنے والے کو زبانی یاد ہے۔ یہاں تک ہی نہیں، ان کے کلام میں سے بیسیوں مصرعے ایک زمانے سے پنجابی ادب اور پنجابیت کی تہذیب میں محاوروں کی طرح استعمال ہو رہے ہیں۔''2

گرونانک نے حضرت بابا فریدؒ کے پنجابی کلام کو محفوظ کر اپنے شاگرد گرو انگد کے سپرد کیا۔ 1604 میں سکھوں کی مقدس کتاب 'آدی گرنتھ' کی تالیف کے وقت گرو ارجن نے فریدؒ کے کلام کو 'اشلوک شیخ فرید' کے عنوان سے شامل کیا۔ اس طرح شیخ فریدؒ کا کلام 'گروبانی' کے طور پر گنگنایا جانے لگا۔ حالانکہ اس بارے میں گمان غالب ہے کہ 'گروگرنتھ صاحب' میں شیخ فرید گنج شکر سے منسوب کلام ان کا نہیں بلکہ پاک پٹن کی خانقاہ کے بارویں سجادہ نشیں شیخ ابراہیم عرف شیخ برھم عرف فرید ثانی کا ہے، جن سے گرونانک نے دو بار ملاقات کی تھی۔ اس ضمن میں لوگوں کا یہ بھی گمان ہے کہ فریدؒ اور گرونانک کے درمیان تین صدیوں کا زمانی فرق ہے۔ البتہ فریدؒ کے روحانی کلام سے متعلق دعووں اور دلیلوں کے درمیان گروگرنتھ صاحب میں شامل ان کے اشلوکوں کو 'بانی بھگت فریدی' نام سے موسوم کر پڑھا جاتا ہے۔ 'گروگرنتھ صاحب' میں موجود کلام فرید کی تفصیل بیان کرتے ہوئے زاہد ابرول لکھتے ہیں:

''پاک پٹن کی گدی کے بارہویں سجادہ نشیں شیخ ابراہیم عرف برھم سکھوں کے پہلے گرو شری نانک دیو جی کے ہم عصر تھے۔ حضرت بابا فرید کا لکھا پنجابی کا سارا کلام گرونانک دیو جی نے شیخ ابراہیم سے لیا تھا جسے بعد میں گروگرنتھ صاحب میں شامل کیا گیا۔ اس کلام میں بابا صاحب کے 112 اشلوک اور 4 شبد ہیں اور ان کو گروگرنتھ صاحب میں شامل کرتے وقت 18 اور اشلوک بھی ساتھ رکھے گئے جو گرونانک دیو جی (4)، گرو امر داس جی (5)، گرو رام داس جی (1) اور گرو ارجن دیو (8) نے بابا صاحب کے کچھ اشلوکوں کی تشریح کرنے اور ان کے معانی و مفہوم کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے لکھے تھے۔ ان میں تو کسی کسی اشلوک میں حضرت بابا فرید کے اشلوک کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔''3

وحید احمد مسعود نے اپنی کتاب 'سوانح حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ' میں اس بات پر تردد کا اظہار کیا کہ فریدؒ شاعر تھے۔ حالانکہ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ فریدؒ کا مذاق اعلا و بلند تھا۔ وہ ہندوی زبان میں اپنے مریدوں سے خطاب کرتے تھے۔ درمیان میں کوئی شعر موزوں کہہ دیتے جسے ان کے مرید یاد کر لیتے تھے۔ وحید احمد مسعود نے حافظ محمود خاں شیرانی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ان دعووں پر سوالیہ نشان قائم کیے جن میں فریدؒ کو شاعر قرار دیا گیا۔ وحید احمد مسعود اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے نامور ادیبوں میں حافظ محمود شیرانی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق بڑے پایے کے محقق گزرے ہیں۔ ان دونوں نے اپنی اپنی تصانیف میں حضرت بابا صاحب قدس سرہ العزیز کے شاعر ہونے کی تائید و توثیق کی ہے اور ان کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ حافظ شیرانی مرحوم نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' کا افتتاح حضرت بابا صاحبؒ ہی کے ذکر سے کیا ہے۔ اور انھیں اردو کا سب سے پہلا شاعر مانا ہے۔ 'اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی تصنیف ہے۔ اس میں بھی اسی دعوے کی تائید کی گئی ہے۔ لیکن دونوں حضرات کے پاس نہ کوئی اصلی سند ہے اور نہ دونوں میں سے کسی نے اپنا ماخذ بتایا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ خواجگان چشت کی تاریخ کے ماہر و محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بغیر روایت کے ان بے اصل کی بنیاد پر بابا صاحب کو شاعر لکھا ہے اور ان کا کلام بھی ثبوت میں پیش کیا ہے۔''4

بھلے ہی وحید احمد مسعود نے فریدؒ کے کلام پر شک کیا ہو لیکن مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب 'اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' میں 32 صوفیا کا کلام پیش کیا جن میں حضرت فریدالدین شکر گنج کا کلام بھی شامل ہے۔ مولوی عبدالحق نے مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف کردہ کتاب 'سیر الاولیا' سے مکمل عبارت نقل کی جس میں فریدؒ کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے حضرت شاہ عالم کے ملفوظات کے مجموعہ 'جمعات شاہی' سے درج ذیل منظوم قول نقل کیا۔

اسا کیری یہی سوریت   جاؤں نائے کہ جاؤں مسیت

مولوی عبدالحق نے شیخ فرید کی پرانی بیاض سے درج ذیل نظم نقل کی۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک   پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش بنسبت سے گر بڑے ہوتے   بوکڑواں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں   گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں
گوش گری میں گر خدا ملتا   گوش چویاں (ہکذا) کوئی واصل نہ تھا
عشق کا رموز نیارا ہے   جز مدد پیر کے نہ چارا ہے

مولوی عبدالحق نے محمد شمیم ڈسنوی کی وساطت سے شیخ فرید کی ریختہ میں کہی ہوئی غزل کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا۔

وقت سحر وقت مناجات ہے   خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا   خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن تنہا چہ روی زیر زمیں   نیک عمل کن کہ رہی سات ہے
پند شکر گنج کہ بدل جان شنو   ضایع مکن عمر کے ہیہات ہے

مولوی عبدالحق نے یہ بھی دعوا کیا کہ انھیں چار صفحے کے رسالے میں شیخ فرید کی نظم 'جھولنا شیخ فرید شکر گنج' دریافت ہوئی ہے۔ موصوف نے نمونے کے طور پر دو شعر شامل کتاب کیے۔

(سگن ذکر جلی)

جلی یاد کی کرنا ہر گھڑی یک تل حضور سوں ٹلنا نہیں
اٹھ بیٹھ میں یاد سوں شاد رہنا گواہ دار کو چھوڑ کے چلنا نہیں
پاک رکھ توں دل کو غیر ستی آج سائیں فرید کا آوتا ہے
قدیم قدیمی کے آونے سیں لا زوال دولت کون پاوتا ہے 5

فریدؒ سے منسوب 54 صفحات پر مشتمل کلام 'انتخاب کلام بابا فریدؒ' ڈاکٹر اسلم فرخی کے مقدمے کے ساتھ فضلی سنز، کراچی سے دسمبر 2002 میں شائع ہوا۔ اس انتخاب میں اشعار کے مطالب ومفاہیم حاشیے کے علاوہ متن کے نیچے بیان کیے گئے ہیں۔ بعض محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ امیر خسرو نے بھی 'سیر الاولیا' میں فریدؒ کا ایک شعر ملتانی پنجابی میں نقل کیا ہے۔ 6 یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیخ فریدؒ نے اپنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے ارشادات وملفوظات کا سہارا لیا۔ اغلب ہے ملفوظات وارشادات نثر ومنظوم شکل میں رہے ہوں گے۔ بعض پنجابی محققین کا خیال ہے کہ گرو نانک کے عہد تک فریدؒ کے کہے گئے اشعار میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آئی ہوگی۔ لیکن تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ انھوں نے پنجابی زبان میں عوام سے خطاب کیا۔ اس لیے انھیں پنجابی کا پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ حضرت بدرالدین اسحاق کی مرتبہ کردہ کتاب 'اسرارالاولیا' (ملفوظات بابا فرید گنج شکرؒ) کے اردو مترجم پروفیسر محمد معین الدین دردائی نے بھی فرید کی شاعری کے بارے میں ضمنی باتیں رقم کی ہیں۔ انھوں نے 'بابا صاحب کی شاعری' عنوان کے تحت اس بات پر زور دیا کہ موصوف کے جذبات کبھی نہ کبھی اشعار کی شکل میں ابل پڑتے تھے۔ امیر خسرو نے بھی اپنی کتاب میں فریدؒ کے اشعار نقل کیے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب 'اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام' میں حضرت بابا فرید کے اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ اس بارے میں پروفیسر محمد معین الدین دردائی لکھتے ہیں:

''بابا صاحب کے دل میں جو سوز وگداز محبت اور شفقت کے بے پناہ جذبات بھرے ہوئے تھے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ یہ جذبات کبھی نہ کبھی اشعار کی شکل میں ابل پڑیں۔ چنانچہ یہی ہوتا تھا جب وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے تو اکثر زبان مبارک سے اشعار نکل پڑتے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی کتاب میں بابا صاحب کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ مثلاً

بقدر رنج یابی سروری را — بشب بیدار بودن مہتری را
تو گدائی دور باش از بادشاہ — تانباید بر در تو دور باش
گر وصال شاہ می داری طمع — از وصال خویشتن مہجور باش 7

کچھ شعرا نے فریدؒ کے پنجابی کلام کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ان تراجم میں خداداد مونس کا پوری کتاب کا نام نشان زد ہے۔ 'ترجمان الفریدؒ' (گرو گرنتھ صاحب میں شامل حضرت بابا فرید کے کلام کا منظوم ترجمہ) (اشاعت 94-1993) 8، اور زاہد ابرول کا 'فرید نامہ'، (شیخ فرید گنج شکر کا پنجابی کلام اور اس کا اردو میں منظوم ترجمہ)، (اشاعت اوّل 2003 اشاعتِ ثانی 2020) 9 اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں تراجم میں شیخ فرید کے کلام کا اردو ترجمہ جداگانہ ہے۔ دونوں شاعروں نے فریدؒ کے پنجابی اشعار میں پنہاں خیالات، نظریات وافکار کو منفرد لب ولہجے کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا۔

'ترجمان الفریدؒ' پر یکم مارچ 1993 کو پروفیسر عنوان چشتی نے مربوط ومبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ انھوں نے اس مقدمے میں شیخ فرید کی شخصیت، تصوف کے پیغامات، روحانی تازگی، پاکیزہ افکار اور ان کے کلام کی انفرادیت پر خاص توجہ مرکوز کی۔ موصوف کی نظر میں 'ترجمان الفرید' شیخ فرید کے کلام کا پہلا منظوم ترجمہ ہے۔ عنوان چشتی نے مقدمے کے آخر میں لکھا:

''خداداد مونس ایک اچھے شاعر اور باشعور نقاد ہیں۔ انھوں نے بڑی حد تک اپنے اصول پر عمل کیا ہے۔ چونکہ انھوں نے 'روحانی کلام' کا ترجمہ کیا ہے، اس لیے روحانی اسرار ورموز سے آگہی، تصوف کی راہ کے پیچ وخم سے آشنائی اور اخلاقی نکات سے آگہی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ حضرت بابا فرید کے شلوکوں کے نثری تراجم تو نظر آتے ہیں لیکن یہ اردو میں پہلا منظوم ترجمہ ہے۔ اس لیے اپنی نوعیت کا پہلا ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خداداد خاں مونس کا ترجمہ (ترجمان الفرید) تصوف کے متوالوں اور ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے نیز دو قوموں کے دلوں کو جوڑنے کا خوش گوار اور پاکیزہ فرض انجام دے گا۔''10

فریدؒ کے اشلوکوں کا دوسرا منظوم ترجمہ زاہد ابرول نے کیا۔ وہ خود پنجابی النسل ہیں اور اس زبان کے ماہر اور شاعر ہیں۔ زاہد ابرول کا یہ ترجمہ 'فرید نامہ' کے نام سے پہلی بار 2003 میں شائع ہوا۔ اسے دوسری بار ترمیم واضافوں کے ساتھ 2020 میں شائع کیا گیا۔ اس ترجمے پر پروفیسر عزیز پری ہار، بلراج کومل، پروفیسر ستندر سنگھ نور نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اشاعت اوّل کے بعد جن ادبا، شعرا ناقدین ومحققین نے اپنے قلمی تاثرات ظاہر کیے ان میں وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، ندا فاضلی، مظفر حنفی، شمیم حنفی، ترنم ریاض، زبیر رضوی، افتخار امام صدیقی، آزاد گلاٹی، راشد جمال فاروقی، عبدل رشید خاں غوری، خوشونت سنگھ، ندیم پرمار اور طیب خان کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ زاہد ابرول کے ترجمے پر شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں 'فرید نامہ' کی تعریف کی ہے:

''بابا صاحب کا کلام جس پنجابی میں ہے وہ میری سمجھ سے آگے کی چیز ہے۔ اس لیے میں کوشش کے باوجود اصل کلام کو ٹھیک سے نہیں پڑھ سکا۔ ترجمہ البتہ میں نے جگہ جگہ سے دیکھا اور مجھے ترجمہ ہر جگہ بہت رواں اور شگفتہ معلوم ہوا۔ آپ نے اس ترجمے کے ذریعے اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے آپ کی کتاب بہت قیمتی اور قابلِ تعریف ہے۔''11

زاہد ابرول نے اپنے مقدمے میں فریدؒ کی حیات اور علمی، سماجی وروحانی اور لسانی خدمات پر ناقدانہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے فرید نامہ کی اشاعت دوم پر اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ فرید نامہ کے پہلے اڈیشن میں اصل کلام گرمکھی اور رومن انگریزی میں اور اردو ترجمہ اردو اور ہندی میں دیا تھا۔ لیکن دوسرے اڈیشن میں بابا فرید کا اصل کلام قدیم پنجابی اور ترجمہ اردو میں منظوم کیا گیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے حضرت بابا فرید کے کلام کا ترجمہ اردو میں کرتے وقت اپنی قلبی وذہنی کیفیت کے بارے میں لکھا:

''یہ ترجمہ میں نے خود نہیں کیا ہے بابا فرید نے مجھ سے کروایا ہے۔ میں تو ان کا ایک اشلوک پکڑ لیتا تھا، آنکھیں موند کر اس کو بار بار دہراتا ہوا بابا فرید سے پوچھتا تھا ''بابا! یہ اشلوک اگر آپ اردو میں کہتے تو کیسے کہتے؟ ذہن میں سمندر منتھن جیسا کچھ ہونے لگتا اور بابا کچھ دیر بعد اپنا اشلوک اردو میں ترجمہ کر کے مجھے دے دیتے۔ غیبی باتیں کچھ مبہم بھی ہوتی ہیں اور اوپر سے اتری بات سننے میں اور لکھنے میں کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس ترجمے میں جو بھی خوبیاں ہیں، حضرت بابا فرید کی ہیں اور جو خامیاں رہ گئی ہیں وہ میری ناسمجھی اور کم عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اپنی ان خامیوں کے لیے میں حضرت

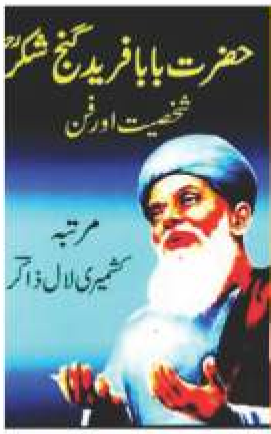

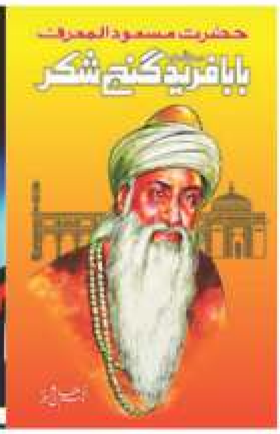

بابا فریداوران کے چاہنے والوں سے معافی چاہتا ہوں اور آخر میں حضرت بابا فرید ہی کے ایک اشلوک کے ساتھ 'فرید نامہ' کا دوسرا اڈیشن آپ کے سپرد کرتا ہوں ۔

عاقل ہو کر طفل ہے، شکت ہے لگے اشکت
پاس نہیں کچھ پھر بھی دے، وہی ہے سچا بھگت 12

'ترجمان الفرید' اور 'فرید نامہ' دونوں ترجمے لفظی ترجمے نہیں بلکہ تخلیقی ترجمے کے زمرے میں آتے ہیں۔ دونوں تراجم اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ بابا فرید کے کلام کو یک لخت تشکیک کے زمرے میں شامل کرنا کوتاہ فہمی کے مترادف ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں گرو ارجن دیو نے فریدؒ کے علاوہ دیگر صوفیوں کے کلام کو خوب چھان پھٹک کر شامل کیا ہے۔ وہ صرف سکھ مذہب کے گروہی نہیں تھے بلکہ اعلا شعری ذوق و نقد و فہم کے دلدادہ تھے۔ خود پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب Life And Times of Fariduddin Ganj-i-Shakar میں (1) فوائد السالکین (حضرت بابا قطب الدین بختیار کاکی کے ملفوظات، مرتب حضرت بابا فرید)(2) اسرار الاولیا (حضرت بابا فرید کے ملفوظات، مرتب شیخ بدر الدین اسحاق) (3) رفعت القلوب (حضرت بابا فرید کے ملفوظات، مرتب حضرت نظام الدین اولیا) کے حوالوں سے یہ بتایا کہ بابا فرید کا کچھ کلام ان میں شامل ہے۔ 13اس موقع 'ترجمان الفرید' اور 'فرید نامہ' میں شامل شیخ فرید کے کچھ اشلوکوں کے تراجم ملاحظہ کیجیے۔

'فرید نامہ' : اشلوک نمبر (1)

وقت نہ ٹلتا ہے کبھی، دل کو کوئی سمجھائے   وقتِ مقرر پر دلھن، ہر اک بیاہی جائے
میکے سے بیٹی اٹھے، جسم سے جان اٹھ جائے   خالی قالب جان بن، کس کو گلے لگائے
اب تک سنتے تھے جسے، آکر منہ دکھلائے   دلھا ملک الموت کا، جان دلھن لے جائے
بال سے بھی باریک پل، دریا پار کرائے   فریدا سن کے جو ان سنی کرے سو دھوکا کھائے

'ترجمان الفرید' (1)

جو ساعت وصل کی لکھ دی گئی وہ کون بدلے گا   فرشتہ موت کا بر وقت سر پر آن دھمکے گا
اجل کا دن مقرر ہے یہ کب ٹالے سے ٹلتی ہے   چٹختی ہیں ساری ہڈیاں جب جاں نکلتی ہے
عروسِ مرگ نے شادی رچائی ہے نئی جاں پر   دلہن گھر سے چلی اب روئیں ہم کس کے گلے لگ کر
ہے وہ پل صراط اک بال سے باریک اے غافل   نہیں سنتے ہیں آواز درا گم کردہ منزل

'فرید نامہ' اشلوک نمبر (4)

فریدا! عقل کم ہوں اگر، سنبھل کے بھریے ہاتھ   سائیں بال سمان ہو، جھک کر کیجیے بات

'ترجمان الفرید' (4)

نفس گنتی کے تھے جن کو گنوا کر دل پشیماں ہے   پیا ناداں سہاگن حسن بے کار نازاں ہے

'فرید نامہ نامہ' اشلوک نمبر (19)

جنگل جنگل کیا پھرے، کانٹوں پر کیا سوئے   باہر کیا ڈھونڈے اسے، من اندر جو ہوئے

'ترجمان الفرید' (19)

پھرے صحرا صحرا اپنی سعی غیر حاصل میں   جسے ڈھونڈا کیے برسوں وہ نکلا جاگزیں دل میں

'فرید نامہ' اشلوک نمبر (28)

روٹی میری کاٹھ کی، بھاجی میری بھوک   چپڑی جو کھائیں دکھ سہیں، مجھ سے نہ ہو چوک

'ترجمان الفرید' (28)

چبا کر سوکھے ٹکڑے بھوک پی جانا ہی اچھا ہے   یہ نانِ روغنی کل کے لیے گھاٹے کا سودا ہے

'فرید نامہ' اشلوک نمبر (58)

دھن دولت سے نہ موہ رکھ، موت بڑی بلوان   آخر جانا ہے جہاں، رہے وہیں کا دھیان

'ترجمان الفرید' (58)

متاع و مال کا سودا ہے سر میں موت ہے سر پر   کر فکر اس جگ کی جس جگہ جانا ہے جاں دے کر

'فرید نامہ' اشلوک نمبر (100)

پانی ان سے ہی چلیں، بھاری دریہہ کے شواس   بندہ جگ میں آئے ہے، لے کے سہانی آس
آئے ملک الموت جب، توڑ کے سارے دوار   بھائی بندھو، باندھ کر، کریں اسے تیار
چلا ہے بندہ چار کے، کندھوں پر اسوار   کرم جو اس جگ میں کیے، کام آئیں اس پار

'ترجمان الفرید' (100)

بدن کے بوجھ کو ڈھوتا ہے جب تک آپ جیتا ہے   یہ انسان نت نئی امید کا ہر دم نشانہ ہے
اجل ساری فصلیں توڑ کر جب آ دھمکتی ہے   جو اپنے ہیں انھی کی آنکھ میں میت کھٹکتی ہے
جسد جاتا ہے دیکھو چار انسانوں کے کاندھوں پر   عمل بس کام آئے گا حضورِ داورِ محشر

حواشی

1 بابا فرید، بلونت سنگھ آنند ترجمہ مہر افشاں فاروقی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1992، ص 15
2 فرید نامہ، زاہد ابرول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2020، ص 30
3 ایضاً، ص 30
4 سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، وحید مسعود اختر، پاک اکیڈمی، 141/1۔ وحید آباد 1965، ص 215 تا 216
5 اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 2008، ص 8 تا 9
6 بابا فرید، بلونت سنگھ آنند ترجمہ مہر افشاں فاروقی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1992، ص 41
7 اسرار الاولیا (ملفوظات بابا فرید گنج شکرؒ)، مرتب بدر الدین اسحاق، اردو ترجمہ پروفیسر محمد معین الدین دردائی، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع دوم، جون 1975، ص 17
8 ترجمان الفرید، خداداد مونس، راجستھان اردو اکادمی، جے پور، 94-1993
9 فرید نامہ، زاہد ابرول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اشاعت دوم 2020
10 ترجمان الفرید، خداداد مونس، راجستھان، اردو اکادمی، جے پور، 94-1993، ص 16-15
11 فرید نامہ، زاہد ابرول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2020، ص 18
12 فرید نامہ، زاہد ابرول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2020، ص 32
13 بابا فرید، بلونت سنگھ آنند ترجمہ مہر افشاں فاروقی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1992، ص 39

■

Dr. Ibraheem Afsar
Ward No 1, Mehpa Chauraha
Nagar Panchayat Siwal Khas
Distt.: Meerut - 250501 (UP)
Mob.: 9897012528
ibraheem.siwal@gmail.com

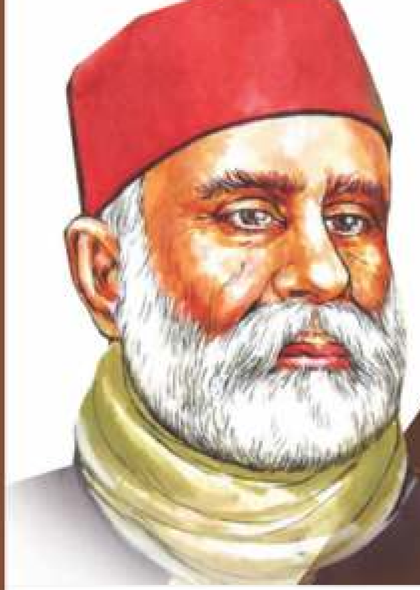

الطاف حسین حالی بہ حیثیت غزل گو

محمد مستمر

خواجہ الطاف حسین حالی پر گفتگو کرنا اور ان کی شخصیت سے وابستہ پہلوؤں کو کھنگالنا اور ان پر روشنی ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ حالی کی شخصیت ایسی عبقری اور ہمہ جہت ہے کہ جس سے آنے والی تقریباً تمام نسلوں نے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ وہ بیک وقت نثر نگار، مقدمہ نگار، مقالہ نگار، سوانح نگار، تنقید نگار، ناول نگار، سیرت نگار، مترجم اور اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں۔ بحیثیت شاعر وہ نظموں کے بادشاہ ہیں۔ تقریباً ان کو دنیا سے رخصت ہوئے سوا سو سال ہونے جا رہے ہیں لیکن ابھی بھی ان کی شخصیت ایک معمے سے کم نہیں۔ ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنا اور اس میں غوطہ لگا کر جواہر پاروں کو کنارے پر لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی شاعری کل بھی بامقصد اور بامعنی تھی اور آج بھی بامقصد اور زندگی کے قریب ہے۔ اگرچہ انسانی زندگی نے بہت سے تکنیکی اور سائنسی نشیب و فراز حاصل کیے ہیں لیکن اس تکنیکی دور میں بھی حالی اپنی جگہ قائم ہیں اور ان کی تخلیقات اسی طریقے سے آج بھی ہماری زندگی کے قریب ہیں گو ان کی شاعری ہماری نسلوں کی آبیاری کر رہی ہے۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں نے ہماری نسلوں کو مثبت رویے سے بے حد متاثر کیا ہے۔

بات چاہے حالی کی غزل گوئی کے تعلق سے ہو یا پھر ان کے معاصرین اکبر الہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد یا پھر دوسرے شعرا کی غزلوں کی خصوصیات اور امتیازات کا ذکر ہو۔ جب ہم حالی کے ابتدائی کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ چند پہلو اور نکات سامنے آتے ہیں کہ ہر شاعر کی ابتدا اس روایتی اندازِ بیان اور فکر سے ہوتی ہے جس روایت پر ہماری اردو غزل کی بنیاد کھڑی ہے یعنی وہی عشق و محبت کی باتیں، حسن و جمال کی رنگینیاں، ہجر و وصال، درد و غم، رنج و الم، فرحت و نشاط، حزن و ملال، شکوہ و شکایت، محبوب کا سراپا، شمع و پروانہ، گل و بلبل، فراق و وصال، محبوب کی ناز و ادا، جلی کٹی اور وہی روایتی تشبیہات و استعارات۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی اپنی غزلوں کی ابتدا کچھ ایسے ہی مذکورہ بالا مضامین سے کی۔ حالی نے بھی اسی طرزِ سخن کو اپنایا جو ہماری شاعری کا طرۂ امتیاز مانا جاتا رہا۔ جہاں صرف احساسات و جذبات کی فراوانیاں اور عشق و محبت کی رنگین دنیا آباد ہے۔ بعد میں ان کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور انھوں نے مختلف علوم و فنون سے فیض حاصل کیا۔ انھیں جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ جس راہ پر وہ غزل گوئی کر رہے ہیں اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

حالانکہ حالی کی ابتدائی غزلوں پر روایتی اور کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ حالی بھی عشق و محبت اور اس کے گرہ گیر میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا اندازِ بیان بھی وہی ہے جس میں خاص طور پر عورت یا محبوب کو مخاطب کر کے اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ حالی محبت کا واسطہ دیتے ہوئے اپنے محبوب کا شکوہ اور اعتماد و وفا کی بھی بات کرتے ہیں اور اس اعتماد و وفا میں دل پر جو گزرتی ہے یعنی وارداتِ قلب اور اس وارداتِ قلب میں چھپا ہوا وہ درد و غم رنج و غم بھی شامل رہتا ہے جو حالی کو موت اور زندگی کے درمیان لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ ایسی کیفیت میں حالی تھوڑے سے قنوطی اور اپنے محبوب سے بیزار بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن اس بیزاری یا قنوطیت میں حالی کا شعور بیدار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کو عشق کے فلسفے اور اس کے مفہوم سے بخوبی آگاہی حاصل ہے۔ مثلاً اس طرز میں ذیل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید — جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں
قیس ہو، کوہ کن ہو، اے حالی — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

اس میں جس قنوطیت اور بیزاری کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالی کی غزلوں میں یہ قنوطیت اور بیزاری کا سلسلہ رکتا نہیں بلکہ دراز اور طویل ہوتا جاتا ہے۔ نیز حالی اس بیزاری اور قنوطیت کے عالم میں ایسے شخص کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو ان کے دکھ، درد اور کرب کی باتیں بیان کر سکے۔ اس سلسلے میں حالی کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دردِ نہاں کوئی جاننے کو تیار نہیں ہے۔ ان کو یہ دنیا، یہ گھر، یہ آشیانہ ایک قفس دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو نہ فرحت کا احساس ہوتا ہے اور نہ شادمانی کا بلکہ کبھی کبھی وہ ایسی حالت میں وصل کے لیے زیادہ بے قرار نظر آتے ہیں۔ انھیں محبوب کے اشاروں اور کنایوں پر اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی ذہنی تسکین کے لیے محبوب سے مزید تقاضا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں — دھرا کیا ہے اشاراتِ جہاں میں

ان کے اشعار میں جس بوالہوسی اور شادمانی کی بات حالی کرتے ہیں اس کو حالی زندگی بھر نہیں بھول پاتے اور ایک الگ ہی نشے میں چور رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ نشہ کسی شراب کا نہیں بلکہ شباب کا نشہ ہے اور حقیقت میں شباب کا نشہ ایک ایسا نشہ ہوتا ہے جو شراب کی بہ نسبت تا دیر قائم رہتا ہے۔ اس بات کا اعتراف وہ خود یوں کرتے ہیں۔

عہدِ وصال دن میں بھلایا نہیں ہنوز — عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
کس نشہ میں ہے چور خدا جانے — حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ 17-27 کی عمر میں بقول غالب ایسی کیفیت رہتی ہے ''ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'' یعنی نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ کی درمیان ایک سرد جنگ جاری رہتی ہے۔ اسے ہم انا اور فوق الانا سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان انسان معلق رہتا ہے اور اس کا جوش وجذبہ اسے پریشان رکھتا ہے۔ نیز اس کے دماغ اور اعصابی نظام میں عجیب قسم کی ہلچل برپا رہتی ہے۔ حالی کے حسن وعشق سے عبارت شاعری میں کچھ ایسے ہی عناصر کارفرما ہیں جو اعصابی نظام کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ حالانکہ خواجہ الطاف حسین حالی کی زندگی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگی سادگی اور تزکیۂ نفس کا مرقع نظر آتی ہے۔ مگر اس تزکیۂ نفس کے مرقع میں بھی نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ کے درمیان سرد جنگ قائم رہتی ہے۔ اگر یہ سرد جنگ قائم نہ رہے تو تزکیۂ نفس کا مرقع وجود میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ اگرچہ حالی جنسی کجروی اور بے راہ روی کے شکار نہیں ہوئے لیکن اس کا اظہار انھوں نے اپنے شعروں کے توسل سے کر دیا ہے۔ یہ اشعار ان کی ابتدائی دور اور روایتی اندازِ فکر کے بھی غماز ہیں اور ان کے نفسیاتی پیچ وخم کے بھی مظہر۔ اس رویے اور رجحان کو مزید سمجھنے کے لیے یہاں کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو　　　　مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق　　　　رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی　　　　دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب　　　　آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

مذکورہ بالا اشعار سے اچھی طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالی حسن وعشق و محبت کے کس نہج پر گامزن ہیں۔ حالی اپنی غزلوں میں حسن وعشق ومحبت، نفسی کیفیتوں اور اعصابی نظام کی ہلچل کی بات کرتے ہیں۔ جس عشق ومحبت کی باتیں حالی کرتے ہیں وہ باتیں عشقِ حقیقی سے تعبیر نہیں کی جاسکتیں۔

جب ہم حالی کی عشقیہ شاعری پر بات کرتے ہیں تو اس میں کوئی دورائے نہیں کہ انھوں نے اس تعلق سے اپنی شاعری میں بہت ہی خوبصورت مضامین پرو دیے ہیں۔ حالی کے یہاں بھی عشقِ مجازی سے متعلق بہت سے اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق کے جو لوازمات ہیں وہ نفسیاتی اعتبار سے صداقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ بات وصل کی ہو یا ہجر کی یا پھر سوز دروں کی یا پھر یاسیت وتحمل کی یا پھر انتشارِ نفس کی یا پھر اعصابی خلل کی یا پھر دماغی ہلچل کی، ان تمام باتوں کا تعلق ہر انسان سے ہے نیز ان تمام پہلوؤں کا اطلاق انسان کی سائیکی سے خلط ملط رہتا ہے۔ اب ظاہر سی بات ہے جب انسان نفسیاتی اعتبار سے ان پہلوؤں سے گھرا ہوگا اور بالخصوص عشق ومحبت میں ڈوبا ہوگا تو پھر وہ دل سے خیالِ دوست کو بھلا بھی نہیں پائے گا اور جو سینے میں عشق کے داغ پڑ گئے ہیں اس کو بھی نہیں مٹا پائے گا۔ حالی اس بات کا خود اعتراف کرتے ہیں۔ داغِ عشق اور مبتلائے عشق سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا　　　　کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا　　　　سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط　　　　الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے　　　　پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ　　　　ہوگئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ　　　　کھیت رستے پر ہے اور رہ رو سوار

یہ انحراف واعتراف اور تصادم وتضاد کا وصف صرف حالی کی غزلوں میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ یہ شاعری بالخصوص غزل کا طرۂ امتیاز اور خاص فنی وصف ہے۔ کیونکہ شاعری میں عام زندگی سے ہٹ کر جب تک تضاد کی کیفیت قائم نہیں ہوتی غزل کا حسن دوبالا نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ تصادم وتضاد اور انحراف واعتراف کا معاملہ یہ ایسا فنی وصف ہے جو کلام میں چار چاند تو لگاتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ کلام میں تاثیر، شگفتگی، نغمگی اور موسیقی بھی پیدا کرتا ہے اور جب تک کلام میں ایسی کیفیت طاری نہ ہوگی تو کلام جمہور کے دلوں پر رقت اور اثر انگیزی بھی قائم نہ کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ صرف حالی ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے ساتھ جو شاعر غزل کے فن میں طبع آزمائی کرتا ہے، ہمیشہ وہ انحراف واعتراف اور تصادم وتضاد کے مابین معلق رہتا ہے۔ لہٰذا اسی وصفِ معلق میں وہ نفسیاتی اعتبار سے بھی دوچار ہوتا رہتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے یہاں یہ تمام شعری اوصاف موجزن اور رواں دواں رہتے ہیں۔

مذکورہ تمام باتیں حالی کی ابتدائی شاعری سے متعلق تھیں۔ بعد میں حالی کی غزلوں کا رنگ وآہنگ ہنگ اور موضوعات بدلتے جاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی کیفیت بھی یہی ہے۔ ان کا ابتدائی کلام بھی حسن وعشق کی عبارت سے مزین ہے ،بعد میں پھر انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی اور طنز ومزاح کے شہنشاہ کہلائے۔ چنانچہ جیسے جیسے حالی کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے تو ان کے خیالات میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ فکری تبدیلی کی بہت سی وجوہات تھیں جن میں خاص طور پر لاہور بک ڈپو میں ترجمے کا کام ،اس کے بعد محمد حسین ازاد کے رابطے میں آکر عنوانی اور مقصدی مشاعروں کی طرف رجوع ہونا۔ یہ وہ عوامل اور ادبی وعلمی امور ہیں جن کی وجہ سے حالی کے اندر ایک بدلاؤ پیدا ہوتا چلا گیا نیز پھر وہ آہستہ آہستہ غزل گوئی کے میدان میں بھی حسن وعشق کے بھنور سے آزاد ہوتے چلے گئے۔

حالی نے جو بعد میں غزل گوئی کے میدان میں کارنامے انجام دیے، اس تعلق سے اردو ناقدین کو یہ اعتراض ہے کہ حالی کے یہاں بعد کی غزلوں میں ایک الگ ہی روکھا پن دکھائی دیتا ہے جس میں جمالیاتی اور رومانی فضا نیز رنگینی اور غنائیت کہیں معدوم ہو جاتی ہے مگر یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ بعد میں اردو غزل گوئی کے تعلق سے حالی نے جو رنگ وآہنگ اختیار کیا اس میں حالی کی مقصدیت پوشیدہ رہتی ہے۔ شاید اسی رنگ وآہنگ کے تعلق سے حالی یوں کہتے ہیں۔

مال ہے نایاب اور گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دُکاں سب سے الگ

حالی نے جس نایاب مال اور سب سے الگ دکان کی بات کی ہے یہ فنی وصف ان کے دوسرے دور کی غزل میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ حالی کا مکمل ارتکاز غزلوں میں مقصدیت کی طرف رہتا ہے۔ وہ ہر بات اور ہر پہلو کو بامعنی بنانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں مزید پختگی، سنجیدگی، متانت، اثر انگیزی اور معنی آفرینی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان کے تخیل اور خیالات میں حقیقت کا عنصر موجیں مارنے لگتا ہے۔ ان کی غزل گوئی جواب سے پہلے ادب برائے ادب اور تفننِ طبع کے لئے تھی اب وہ ادب برائے زندگی کے زمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ ادب برائے زندگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سرسید کے مشن سے بے حد متاثر تھے اور دوسری جانب محمد حسین آزاد

کے ساتھ مل کر عنوانی نظموں کی بنیاد بھی ڈال چکے تھے۔ اسی وجہ سے بعد میں وہ غزل کے اس رنگ و آہنگ کی مخالفت کرتے ہیں جس رنگِ غزل کے کبھی وہ خود پیروکار تھے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار پیش خدمت ہیں۔

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت   جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت   نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو   اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں   بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی   لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

ڈاکٹر جاوید وشست نے حالی کی غزل گوئی کے تعلق سے لکھا ہے" حالی کی غزل کا جدید رنگ جدید شاعری کی گنگوتری ہے۔" ڈاکٹر جاوید وششٹ کا یہ قول حالی کی غزل گوئی کے تعلق سے بہت معنی خیز ہے۔ کچھ اسی طرح کے خیالات سجاد ظہیر اپنی کتاب مضامینِ سجاد ظہیر میں صفحہ 54 پر رقم طراز ہیں:

خواجہ الطاف حسین حالی نے غزل کی زبان و بیان رنگ و آہنگ اور موضوعات کو بھی اپنی نظموں کی طرح نیچرل بنایا۔ اس طرح کی غزلوں میں ان کے یہاں رنگینی، جمالیاتی اور رومانی فضا کم پائی جاتی ہے مگر کلام کی فصاحت، سلاست اور پختگی اور قادر الکلامی میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔

"انھوں نے اپنے زمانے کی اس قسم کی شاعری پر جو بیشتر چٹکلے بازی، پست قسم کی لذت کوشی اور مرصع نگاری بن کر رہ گئی تھی، جس میں انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل اور اس کی بلند ترین قدروں کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور جو سطحی تفریح کے علاوہ کسی دوسرے بلند اخلاقی مقصد کا اظہار نہیں کرتی تھی، سخت نکتہ چینی کی اور انھوں نے اس نکتہ چینی میں اتنے جوش بلکہ غصے کا اظہار کیا کہ لوگ تلملا اٹھے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی حالی کی اصلاحِ غزل سے لوگ بلبلا اٹھے۔ لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ لوگوں نے ان کے نظریات وخیالات سے اتفاق رائے کا اظہار کیا اور دھیرے دھیرے لوگ اس راستے پر آ گئے جو ادب برائے زندگی کی راہ تھی۔ بقول صالحہ عابد حسین:

"انھوں نے اپنے روحانی استادوں اور زندہ استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا تھا۔ میر سے دردِ دل لیا اور درد سے تصوف کی چاشنی۔ غالب سے حسنِ تخیل، ندرتِ فکر اور شوخیِ گفتار سیکھی اور سعدی سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی۔ شیفتہ سے سیدھی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے کا فن۔ اور ان سب کی ترکیب سے حالی کی غزل کا ہیولیٰ تیار ہوا۔" (یادگارِ حالی: ص 134)

صالحہ عابد حسین نے حالی کے تعلق سے جس فنی اختصاص کا ذکر کیا ہے، یہ تمام خوبیاں ابتدائی دور کا ہیولیٰ ہیں۔ دوسرے دور کی غزلوں میں مذکورہ خوبیوں کا کوئی ہیولیٰ نظر نہیں آتا بلکہ حالی کی غزلوں میں پیکر تراشیوں کا وہ سلسلہ جاری ہوتا ہے جو حالی کو خالص حالی بناتا ہے۔ جس میں نہ میر کی صدا ہے، نہ غالب کی شوخی اور نہ درد کا صوفیانہ مزاج بلکہ حالی کے اپنے تیور، نشتر اور تیر ہیں۔ سید عبداللہ نے اپنی کتاب 'ولی سے اقبال تک' میں صحیح لکھا ہے:

"حالی اپنے پیش روؤں اور معاصروں سے الگ ہیں کہ انھوں نے غزل کے موضوعات کی سابقہ حد بندی توڑ ڈالی اور سماجی اور قومی خیالات کو غزل میں داخل کیا۔"

بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالی کی غزل کا دوسرا پڑاؤ مکمل طور پر ادب برائے زندگی کا ہے۔ وہ اپنی غزلوں کی بنیاد ایسے خیالات، جذبات، تفکرات، تاثرات اور نظریات سے بھرتے ہیں کہ جس میں مقصدیت پنہاں ہوتی ہے اور نصیحت کی مٹھاس اور اصلاح کا پہلو ہمیشہ کارگر رہتا ہے۔ حالانکہ حالی کی اس طرح کی غزل گوئی پر لوگوں نے اعتراضات بھی کیے۔ حالی نے غزل کو ایک پیغام اور نصیحت کی پوٹلی بنا دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالی نے اس مفہوم کو بالکل پیچھے چھوڑ دیا جس میں غزل کا مفہوم محبوب یا عورتوں سے باتیں کرنے کا ہے۔ حالی ان اعتراضات کے تعلق سے کہتے ہیں۔

بات بچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی   بیچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے
اب سنے اس میں کوئی یا نہ سنے   وہی راگ اپنا گائے جاتا ہے
سر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مذکورہ بالا تینوں اشعار سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ حالی اپنی اس روش سے جس کو انھوں نے بعد میں ترک کر دیا غزل کو روایتی خول سے نکال کر مقصدیت سے ہم آہنگ اور زندگی سے قریب کرنا چاہتے ہیں۔ اصلاحِ غزل کے تعلق سے انھوں نے بہت سے اقدامات اٹھائے اور اپنے نظریات وخیالات سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ اگرچہ اس پر مکمل طور سے لوگ عمل پیرا نہیں ہوئے مگر پھر بھی انھوں نے اپنے تنقیدی اور اصلاحی نظریات سے غزل کی روش اور رفتار کو حتی الامکان ایک نیا موڑ دیا۔ جس سے آنے والی نسلوں نے سبق بھی حاصل کیا اور اس پر اپنی غزل کی عمارت بھی قائم کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج خواجہ الطاف حسین حالی اور دوسرے اربابِ ادب کی کاوشوں سے غزل کا دامن بے حد کشادہ اور وسیع ہو گیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے غزل کی زبان و بیان رنگ و آہنگ اور موضوعات کو بھی اپنی نظموں کی طرح نیچرل بنایا۔ اس طرح کی غزلوں میں ان کے یہاں رنگینی، جمالیاتی اور رومانی فضا کم پائی جاتی ہے مگر کلام کی فصاحت، سلاست اور پختگی اور قادر الکلامی میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔ حالی کی غزلوں میں جدت بھی ہے اور ندرت کی فضا بھی قائم ہے۔ حالی کے دوسرے دور کی غزلوں میں بے پناہ للّٰہیت، خلوص، قوم سے ہمدردی کا جذبہ، خدمتِ خلق کے عناصر، محبت واخوت کا پیغام، حب الوطنی کا جذبہ اور اسی طرح کے انسانی اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کی غزل میں ایک آفاقی پیغام پوشیدہ رہتا ہے۔ حالی کی غزل گوئی کا لب لباب یہی ہے کہ حالی نے اردو غزل میں نہ صرف اصلاحی اقدامات اٹھائے بلکہ انھوں نے غزل کو ایک نئی سمت، نیا لہجہ، نیا آہنگ، نیا رنگ، نیا اسلوب، نیا اندازِ بیان دیا اور غزل کو روایتی خول سے باہر نکالا، ساتھ ہی ایک آزاد فضا میں سانس لینا سکھایا۔ آج یہ حالی کا ہی کارنامہ ہے کہ غزل نے اپنے دامن میں مختلف اور ہر قسم کے موضوعات کو سمیٹ لیا ہے۔

■

Dr. Mohd Mustamir
Assistant Professor, Dept of Urdu
Zakir Husain College
Delhi- 110002
Mob.: 8920860709
drmohdmustamir@gmail.com

اردو غزل میں کرداروں کی اہمیت

قسیم اختر

اردو غزل اپنے ایمائی اور علامتی اظہار کی بنیاد پر سماجی اور سیاسی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ بنیادی طور پر عشق و عاشقی کی صنف سمجھی جاتی ہے۔ پھر عشقیہ کردار بھی اپنے عہد کا نمائندہ ہوتا ہے۔ عشق کے پردے میں سماج کے اقتصادی اور دیگر پہلوؤں کی شمولیت ہوتی ہے۔ شاعری کے کردار میں فکشن کے کرداروں کی طرح وسعت نہیں ہوتی ہے مگر شاعری کے مروجہ کرداروں کی تہہ داری میں فکشن کے تمام کردار سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اجتماعی لاشعور شاعری کے کرداروں میں شامل ہوتے ہیں۔ اردو کی طویل اصناف میں کرداروں کی وضاحت ضرور ہوتی ہے مگر غزلوں میں کرداروں کا معاملہ ابہام سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے غزل کے کرداروں کی تفہیم کے لیے کئی سطح پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قبل اس کے ہم غزلیہ اشعار کے کرداروں کا مطالعہ کریں، کردار کو سمجھنا لازمی ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ یونانی سے آیا ہے:

”انگریزی میں Character براہ راست یونانی Klelkyni سے مستعار ہے، جس کے معنی ہیں نقش کرنا، کندہ کرنا Engraving اسی وجہ سے ابتدا یہ لفظ سکّوں پر مہر لگانے کے رنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس صورت کے لیے بھی جس سے مہر ہوتی تھی۔“

(نجم الہدائی، کردار اور کردار نگاری، دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ 1980، ص16)

بلاشبہ کرداروں میں نقش اور ارتسام کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب ہم کسی ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے کردار ہمارے ذہنوں میں گردش کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم شاعری کا مطالعہ کریں تو کرداروں کی حرکات وسکنات بھی سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر مجید بیدار نے کردار کی جو تعریف کی ہے، وہ بھی ہمارے مطالعے کو تقویب پہنچاتے ہیں:

اردو شاعری میں رومانی موضوعات پر مبنی کردار بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کرداروں میں عاشق، معشوق، اور محبوبہ جیسے کردار شامل ہیں۔ یہ کردار شاعر کے احساسات اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے رومانی داستانیں تخلیق کی جاتی ہیں۔ ان کرداروں میں نہ صرف محبت کا پہلو دکھایا جاتا ہے بلکہ ان کے ذریعے شاعر انسانی تعلقات کی گہرائی اور پیچیدگی کو بھی بیان کرتا ہے۔

”زندگی کی رعنائیوں سے وابستہ رہتے ہوئے عمل، ردعمل، تحریک اور تعلقات کی نمائندگی کرنے والا جسم کردار کہلاتا ہے۔“

(مجید بیدار: ناول اور متعلقات ناول، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ص57)

بلاشبہ کرداروں کی تفہیم کے لیے تحریک اور عمل وردعمل کو سمجھنا لازمی ہے۔ مغنی تبسم کے مطابق: ”ادب میں لطیف ترین احساسات کو مادی شکل دے کر انسانی ڈھانچے میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ اس سے کرداروں کی تحلیل نفسی کا اندازہ ہوتا ہے۔“

(مغنی تبسم، کہانی اور اس کا فن، شعور پبلی کیشنز، حیدر آباد، ص4)

جس طرح فکشن میں متعدد کردار ہوتے ہیں اسی طرح شاعری میں بھی مختلف کردار اپنی معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں کرداروں کی نوعیت میں بڑی گہرائی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ کردار کبھی رومانی، کبھی سماجی، کبھی سیاسی اور کبھی فلسفیانہ ہوتے ہیں۔ ہر کردار کا ایک مخصوص پیغام ہوتا ہے جو شاعر کے مقصد سے علاقہ رکھتا ہے۔

اردو شاعری میں رومانی موضوعات پر مبنی کردار بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کرداروں میں عاشق، معشوق، اور محبوبہ جیسے کردار شامل ہیں۔ یہ کردار شاعر کے احساسات اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے رومانی داستانیں تخلیق کی جاتی ہیں۔ ان کرداروں میں نہ صرف محبت کا پہلو دکھایا جاتا ہے بلکہ ان کے ذریعے شاعر انسانی تعلقات کی گہرائی اور پیچیدگی کو بھی بیان کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عشقیہ لے کے ساتھ ساتھ،

شاعری میں سماجی کرداروں کا بھی ذکر ہوتا ہے؛ جیسے غریب، مظلوم، یا محنت کش۔ یہ کردار اردو شاعری میں سماجی عدم مساوات، غربت اور دیگر معاشرتی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے شاعر اپنی شاعری کو پیغام سے لبریز کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی کردار بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے شاعر سیاسی حالات، انقلاب یا تبدیلی کی خواہشات کو بیان کرتا ہے۔ ان کرداروں کو سامنے رکھتے ہوئے اردو غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں بہت سے قابل عمل پہلو نظر آئیں گے۔ ذیل میں چند متفرق موضوعات کے تحت اشعار کے کرداروں کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

غزل کے اساسی کردار میں رقیب یا غیر بھی شامل ہوتا ہے جو اپنی سادہ تلازماتی حیثیت میں مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا
دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم

میر نے اپنے اشعار میں متکلم کا صیغہ بہ کثرت استعمال کیا ہے۔ اس شعر میں 'ہم' سے کردار کا تصور ابھر رہا ہے۔ ہم کا معاملہ سماج سے مدغم ہوتا ہے۔ کیوں کہ سماج کا اطلاق صیغہ جمع پر ہوتا ہے۔ اوپر کے شعر میں رقیب کی کیفیت کو بھی محسوس کریں۔

غالب کی شاعری میں ایک ایسا کردار ملتا ہے جو زندگی کے دکھ درد، محبت کی پیچیدگیوں اور انسانی کمزوریوں کا عکاس ہوتا ہے۔ غالب کا کردار ہمیشہ سچائی، دکھ اور کرب سے جڑا ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں یہ کردار زیادہ تر تنہائی اور شکوہ کرنے والا ہوتا ہے۔ ایک معروف شعر۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہاں غالب کا کردار اپنی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل نہ ہونے کا دکھ محسوس کرتا ہے اور اس دکھ میں اتنی شدت پائی جاتی ہے کہ ہر خواہش کی تکمیل کے بعد بھی وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اس شعر کا کردار کچھ یوں بھی سامنے آتا ہے کہ کون اپنے ارمان کے متعلق بات کر رہا ہے۔ کس سے اپنی بات کا اظہار کر رہا ہے۔ کیا اس شعر کا کردار خود کلامی میں مصروف ہے؟ کیا پھر اپنی محبوب سے مخاطب ہے۔ مخاطبت کے مکمل نظام پر غور کرنے سے اس شعر کا کردار بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

اردو شاعری میں بھی کردار نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ذریعے شاعر اپنے خیالات، جذبات اور نظریات کو ایک جاندار اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کرداروں سے نہ صرف موضوعات کی تفہیم ہوتی ہے بلکہ شاعروں کا منشا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ایک اچھا شاعر نہ صرف خوبصورت الفاظ اور اشعار تخلیق کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے انسانی تجربات، معاشرتی تضادات، اور اخلاقی مسائل کو بھی پیش کرتا ہے۔ کردار، شاعری کا وہ پہلو ہے جو نہ صرف اس کے موضوعات کو گہرائی فراہم کرتا ہے بلکہ یہ شعری متن کو ایک مختلف جہت دے کر قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

شاعری کے کرداروں میں فلسفیانہ عناصر کی شمولیت ان کی گہرائی اور معنویت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ جب کوئی شاعر اپنے کرداروں میں زندگی کے مسائل، کائناتی سچائیوں اور انسانی احساسات کو بیان کرتا ہے، تو ان کرداروں کے ذریعے فلسفیانہ خیالات کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یہ کردار اکثر سوالات اٹھاتے ہیں، جواب تلاش کرتے ہیں اور قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان میں وقت، حقیقت، محبت، موت اور وجود کے گہرے سوالات شامل ہوتے ہیں، جو زندگی کے بنیادی پہلوؤں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شاعری ان کرداروں کے ذریعے صرف جذبات کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ زندگی کے معنوی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ جب یہ کردار کھلتے ہیں، تو ان کی کہانیوں میں زندگی اور فلسفہ ایک دوسرے میں گندھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ کردار انسانی وجود کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، اور ان کی کہانیوں کے ذریعے قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ فلسفہ اور زندگی الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ایک اچھے شاعر کے کردار نہ صرف خیالی دنیا کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ حقیقی زندگی کے بھی عکاس بن جاتے ہیں، جہاں فلسفہ انسانی تجربے کو ایک گہری اور مکمل شکل میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح شاعری کے کردار قاری کے دل و دماغ میں ایک فلسفیانہ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

شاعری کے کرداروں میں فلسفیانہ عناصر کی شمولیت ان کی گہرائی اور معنویت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ جب کوئی شاعر اپنے کرداروں میں زندگی کے مسائل، کائناتی سچائیوں اور انسانی احساسات کو بیان کرتا ہے، تو ان کرداروں کے ذریعے فلسفیانہ خیالات کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یہ کردار اکثر سوالات اٹھاتے ہیں، جواب تلاش کرتے ہیں اور قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

بلاشبہ یہ اشعار اور ان کے کردار مختلف انسانی جذبات اور تجربات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کرداروں کو ہم نثری کرداروں سے بھی ملا کر دیکھ سکتے ہیں۔ فکشن نگار کی طرح ہر ایک شاعر نے اپنے کردار کے ذریعے مختلف حالات اور جذبات کی عکاسی کی ہے جیسے محبت، مایوسی، جدائی، امید، اور خودی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ہم اردو شاعری کے کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو بعض اوقات فکشن سے زیادہ شاعری کے کردار گہرے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کرداروں کی گہرائی اور پیچیدگیوں کو سمجھ کر ہم نہ صرف اردو شاعری کے جمالیاتی پہلو کو سمجھ سکتے ہیں بلکہ یہ بھی جان سکتے ہیں کہ کس طرح ہر شاعر اپنے وقت کے سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی مسائل کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاعری کا عمومی طور پر موضوعاتی، فنی اور معنیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے، حقیقت ہے کہ شاعری کو مزید آفاقیت عطا کرنے کے لیے اس کے کرداروں کو کھولنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

■

Dr. Qaseem Akhtar
Assistant Profeesor, Dept of Urdu
Marwari College
Kishan Ganj- 855107 (Bihar)
Mob.:9470120116
qaseemakhtar786@gmail.com

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

محمد اکبر

انیسویں صدی کے آغاز میں انگریز حکمرانوں نے اپنی سیاسی گرفت کو مضبوط اور مستحکم کر لیا تھا۔ مگر تہذیبی اقتدار ابھی تک قائم نہ ہو سکا تھا۔ کیونکہ ہندوستانی اپنی معاشرت اور تہذیبی قدروں سے مطمئن تھے۔ مغربی تہذیب وثقافت اور اس کے معاشی نظام کو اپنانا ہندوستانیوں کے لیے آسان نہ تھا۔ پہلی جنگ آزادی 1857 کے بعد حالات تبدیل ہوئے ہندوستانی عوام اپنے آپ کو مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ انگریزوں کے تہذیبی برتری کا تصور ابھرنے لگا۔ لوگ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ جس سے انگریزی حکومت اور اس کی تہذیب کی حمایت بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگوں کو عہد وسطی کی تہذیب فرسودہ نظر آنے لگی تھی۔ اس میں نئے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور ذہنی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لہٰذا انھیں انگریزوں کی پیروی میں ہی ہندوستان کی ترقی اور کامیابی نظر آنے لگی۔ اس ذہنی کشمکش اور تصادم کے دور میں خواجہ حسن نظامی کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز بستی نظام الدین، نئی دہلی میں ہوا، مولانا اسماعیل کاندھلوی اور مولانا یحییٰ کاندھلوی جیسے اساتذہ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل رہا۔ آپ کی فراغت مدرسہ رشیدیہ گنگوہ سے ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی اردو کے ایک صاحب طرز ادیب اور صحافی تھے۔ انھوں نے بے شمار مضامین، افسانے، انشائیے، روزنامچے، خاکے اور سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ وہ صوفیا کے خاندان سے وابستہ تھے۔ خدا کا خوف، وسیع المشربی، انسان دوستی، کشادہ قلبی، خلوص، رواداری، اور اعلی انسانی قدریں وغیرہ انھیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھیں۔ انھوں نے ان اقدار کو اپنی شخصیت اور مزاج کا جز بنا لیا تھا۔ فطری طور پر ان کی نگارشات میں بھی ان کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے انشائیے کو بام عروج تک پہنچایا اور انشائیہ کے فن کو ترقی دی اور اس کے اسلوب کو نکھارا۔ انشائیے کی جتنی خصوصیات ہیں وہ سب ان کے یہاں موجود ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مجموعہ 'سی پارۂ دل' 134 انشائیوں پر مشتمل ہے۔ جسے پانچ منازل میں منقسم کیا گیا ہے اور ہر منزل کا الگ الگ عنوان مقرر کیا گیا ہے۔ پھر شذرات کے تحت کچھ اور انشائیے دیے گئے ہیں۔ دوسرا مجموعہ 'کانا باتی' جس میں انشائیوں کے علاوہ ریڈیائی تقریریں بھی شامل ہیں۔ اگر تمام انشائیوں کے عنوانات پر غور کیا جائے تو ان میں ایک مخصوص سلسلہ خیال کی جھلک نظر آتی ہے۔

خواجہ صاحب کو اس بات کا ڈر تھا کہ انسان اس سرمایہ دارانہ نظام، مشینی دور اور مادیت کے غلبہ میں زندگی کی اخلاقی اقدار، مذہب بالخصوص تصوف سے بیگانہ ہو جائے گا اس لیے انھوں نے انشائیہ نگاری کا مقصد تصوف کو فروغ دینا بتایا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''میں نے جتنی بھی خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اس لیے کی ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابیں نہیں پڑھتے یا ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف ہی سے غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں۔ میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیف روحانی سے فائدہ اٹھائیں۔''

(سی پارۂ دل، خواجہ حسن نظامی، خواجہ اولاد کتاب گھر، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیائی دہلی، نواں ایڈیشن، ص 15,16)

خواجہ حسن نظامی نے اپنی نگارشات میں تصوف کے نکات کی عکاسی کی ہے۔ ان کے معاصر انشائیہ نگار بھی سماج کے اعلیٰ طبقے کے لیے لکھ رہے تھے۔ ان کی تحریریں اپنی علمی اور فلسفیانہ موضوعات کے باعث عوام کی ذہنی سطح سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں ان کے بر خلاف حسن نظامی نے گہری اور بصیرت افروز باتیں بھی سادہ اور اس قدر عام فہم انداز میں پیش کیں کہ قاری انھیں آسانی سے سمجھ سکے اور ان سے نصیحت حاصل کر سکے۔ ان کا مخاطب سماج کا عام طبقہ ہے یعنی معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں جن میں خاص طور پر ان کے مریدین شامل ہیں جو ان کی ذہنی سطح اور تعلیمی استعداد سے بہت اچھی طرح واقف تھے اسی بنا پر انھوں نے اپنے انشائیوں میں قاری کے لیے مسرت کا سامان فراہم کیا ہے۔ خواجہ صاحب ایسے انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے ماحول اور اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے معاشرے سے موضوعات کا انتخاب کیا۔ چھوٹے چھوٹے موضوعات پر طبع آزمائی کی مثلاً مست الست کی دعا، بھگت کے بس میں آ بھگوان، کعبے والے خدا کو

کیوں کر پاؤں اور جھولی والے فقیر کی بھیک وغیرہ ان سب میں اخلاق کا کوئی نہ کوئی درس، معرفت کا کوئی نہ کوئی گوشہ اور عبرت کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ الو، مکھی، مٹی کا تیل، لالٹین، دیا سلائی، فٹ بال یہ سب عام سے موضوعات ہیں۔ لیکن خواجہ حسن نظامی ان میں بھی افادیت کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ ہے ان کے عنوانات کا نرالا پن۔ ان کے عنوان سے ہی انبساط کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ انھوں نے عام رنگ سے ہٹ کر اپنا راستہ اختیار کیا ہے۔ حسن نظامی بہت غور وفکر کے بعد اپنے انشائیوں کے عنوان رکھتے تھے۔ اس لیے کہ عنوان ہی کسی انشائیے کی جان ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جھینگر کا جنازہ، گرفتار شدہ خطوط، کانا باتی مکھی وغیرہ کو اپنے انشائیوں کا موضوع بنا کر ایسے نثر پارے تخلیق کیے ہیں جن میں فنی خوبیاں موجود ہیں۔

ہندوستان کی ثقافتی اور تہذیبی کاموں میں خواجہ حسن نظامی نے جس طرح دلچسپی لی ہے وہ ناقابل بیان ہے یا یوں کہیں کہ انھوں نے ان میں اپنی تحریروں کے ذریعے جان ڈال دی ہے۔ اہل علم اسے بھلا نہیں سکتے، وہ ہر مذہب وملت کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی ان کے عقیدت مند تھے۔ وہ ہمیشہ فرقوں اور مذاہب میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو عوام کی زندگی کے دھارے سے کبھی دور نہیں کیا ان کا قلم معمولی سے معمولی موضوع کے لیے اٹھتا رہا۔ وہ جھینگر کی موت اور مچھر کی بھنبھناہٹ کو بھی ادب کا روپ دینے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ اس طرح کا تنوع صرف نظیر اکبر آبادی کے یہاں نظر آتا ہے۔ جنھوں نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کی عوامی زندگی، تہواروں، تقریبات، پیشہ وروں، معمولی چیزوں، کیڑوں مکوڑوں اور دیگر مختلف چیزوں کی حقیقی انداز میں مرقع کشی کی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی طرح خواجہ صاحب کی نظر بھی مکھی، مچھر، الو اور جھینگر وغیرہ پر پڑتی ہے۔ انھوں نے حقیر سے حقیر شئے کو عزت و وقار عطا کر کے اس میں معرفت اور تصوف نیز دیگر امور کے نہ جانے کتنے گوشوں کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ اپنی زبان سادہ عام فہم اسلوب اور عوامی کلچر کے قریب رکھتے ہیں۔ اردو

”
خواجہ حسن نظامی نے صوفیانہ عناصر کو اپنے انشائیوں میں براہ راست پیش کیا ہے۔ وہ بغیر کسی تمہید کے اصل موضوع کو بیان کرنے لگتے ہیں عموماً روزمرہ کی کسی مانوس شئے کی ظاہری شکل وصورت کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں گہری معنویت کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔
“

کو مقامی احساسات اور ثقافتی مزاج کا ترجمان بنانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر آدم شیخ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

”حسن نظامی کے انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی ان کے بظاہر معمولی عنوانات ہیں جن پر انھوں نے بڑی سلاست اور شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ الو، دست پناہ، آغوش مچھر میں شب عید اور تنکے کا سلوک جیسے انشائیوں میں اس فقیر ادیب نے غور وفکر کے زبردست خزانے پوشیدہ کیے ہیں یوں تو حسن نظامی اپنی تحریروں میں خانقاہ کی فضا سے فرار حاصل نہ کر سکے لیکن اس چہار دیواری میں رہ کر بھی انھوں نے اپنے افکار واظہار کے ذریعے انشائیوں کی ایک ایسی دنیا پیدا کی ہے جس پر ان کی شخصیت اور فطرت جھلکتی ہے۔ خدا پرستی اور انسانی ہمدردی ان کے مضامین میں بنیاد کا کام کرتے ہیں کہ ان کا ہر لفظ دل میں اترتا معلوم ہوتا ہے۔“

(ڈاکٹر آدم شیخ، انشائیہ، بمبئی رائٹرس امپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ، تیسرا ایڈیشن، 1925، ص 68)

خواجہ حسن نظامی نے صوفیانہ عناصر کو اپنے انشائیوں میں براہ راست پیش کیا ہے۔ وہ بغیر کسی تمہید کے اصل موضوع کو بیان کرنے لگتے ہیں عموماً روزمرہ کی کسی مانوس شئے کی ظاہری شکل وصورت کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں گہری معنویت کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ سگنل کی آنکھ، لیمپ اور مٹی کا تیل ان کی نظر میں صرف اندھیرے کو دور کرنے اور گھر کو روشن کرنے والا محض ایک مائع نہیں بلکہ روح کی تاریکیوں کو زائل کرنے والا حقیقت شناس کی شمع روشن کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسا کہ وہ خود اپنے انشائیے میں رقمطراز ہیں:

”اے خاک نشیں تیل! ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلۂ زار بن کر مقبول ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے۔ پہاڑوں دریاؤں میں سرگرداں پھرتا ہے۔ مگر وہ تجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔“

(سی پارۂ دل، خواجہ حسن نظامی، خواجہ اولاد کتاب گھر، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیائی دہلی، نواں ایڈیشن، 1965، ص 154,155)

ان کی نگارشات کا مطالعہ انسان کو قدرت خداوندی پر غور کرنے، بنی نوع کے ساتھ ساتھ دیگر ذی روحوں سے محبت کرنے اور اپنی اخلاقی تربیت کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں سے ایک ایسا ماحول بنا دیتے ہیں کہ قاری ان کی باتیں بلا چوں چرا تسلیم کر لیتا ہے مثال کے طور پر ’گلاب تمہارا کیکڑ ہمارا‘ میں خود بیان کرتے ہیں:

”کیکڑ کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجے اچھا۔ گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ میں کمہلا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکڑ کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور آج کل تعریف اسی کی ہے جو دشمن کے مقابلے میں زندہ سلامت رہے۔“ (سی پارۂ دل، ص 209,210)

کہیں کہیں خواجہ صاحب کے عنوانات خالص ہندوستانی سماج کی عکاسی کرتے ہیں مثلاً ہم بالک ایک پتا کے، مدنی شیام سندر کی مرلی، پردیسی پیتم دیکھی تہاری پریت، رس کے بھرے تورے نین، گیان کتھا، چنبیلی کے پھول پر شبنم، ہری دواری گنگا کے کنارے چنتامن مورتی، من کہہ ایک دھوبی کا غذی گھاٹ پر اور رام اپدیش وغیرہ۔ ان سب انشائیوں میں خالص ہندوستانی تہذیب کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مدنی شیام سندر کی مرلی، میں بے قرار دل کی پکار کو حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی نے مختلف صنعتوں کو اپنی نثری اسلوب کا جامہ پہنا کر ایک خاص وصف بخشا ہے۔ ان میں سے ایک تمثیلی بیانیہ ہے جس کی وجہ سے ان کا بیانیہ رمزیہ کے ذیل میں آجاتا ہے۔ جھینگر، مچھر اور مکھی کا انسانوں کی طرح باتیں کرنا، اجمیری پہاڑی کا بولنا، آنسو کا اپنی کہانی سنانا اور دیا سلائی کا انسان سے تکرار تو تو میں میں کرنا دوا کی شیشی کا باطنی اشارے کرنا وغیرہ ان کے انشائیوں کو تمثیلی نثر کا نمونہ بنا دیا ہے۔

نے کس طرح الفاظ کا جامہ پہنایا ہے:

''مگر اب زمانہ گزر گیا، راتیں بیت گئیں، شیام سندر کی مرلی کی آواز سنائی نہیں دیتی، جنگل کے ہرن، باغوں کے مور، آم کی ٹہنی کی کوئل سب اس پیاری اور سریلی صدا کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ جس کی کوک کلیجہ میں ہوک پیدا کرتی ہے۔ برسات کا موسم قریب آیا، کالی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آئیں گی اور کرشن کنہیا کی بانسری کو ڈھونڈیں گی۔''

(سی پارۂ دل، نواں ایڈیشن، 1965، ص 102)

خواجہ حسن نظامی نے مختلف صنعتوں کو اپنی نثری اسلوب کا جامہ پہنا کر ایک خاص وصف بخشا ہے۔ ان میں سے ایک تمثیلی بیانیہ ہے جس کی وجہ سے ان کا بیانیہ رمزیہ کے ذیل میں آجاتا ہے۔ جھینگر، مچھر اور مکھی کا انسانوں کی طرح باتیں کرنا، اجمیری پہاڑی کا بولنا، آنسو کا اپنی کہانی سنانا اور دیا سلائی کا انسان سے تکرار تو تو میں میں کرنا دوا کی شیشی کا باطنی اشارے کرنا وغیرہ ان کے انشائیوں کو تمثیلی نثر کا نمونہ بنا دیا ہے۔

ایک دیہاتی عورت جس کا شوہر پردیس میں ہے اسے ہچکی آتی ہے تو اسے اس کا شوہر یاد آتا ہے۔ اس کو حسن نظامی نے اپنے انشائیہ 'ہچکی' کے ذریعہ بہت ہی اچھے انداز میں پرویا ہے وہ محبوب کے خیالوں میں کس طرح کھو جاتی ہے:

'' تو کیوں آئی ہے؟ میرا سجنا تو یاد نہیں کرتا؟ مرے من موہن سندر کے دل میں میرا خیال تو نہیں آیا؟

پھر آئی ہچکی نہ ستا۔ میرا سینا ناتواں ہے۔ اس میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اس کے زخم دکھنے لگتے ہیں۔ سانس رکا جاتا ہے۔ جب تو آتی ہے گردن کو جھٹکا دیتی ہے اور ناف سے سر تک پٹھوں اور رگوں کو ہلا ڈالتی ہے۔ میرا جی سانس سے گھبراتا ہے اور پیا پیارے کی یاد میں بے قابو ہوا جاتا ہے۔

ہائے میں نے کیسے کیسے درد بھرے خط بھجوائے۔ لکھنا نہ آتا تھا دوسروں سے لکھوائے، مگر اس نے کاغذ کا ایک پرزا نہ بھیجا۔ دو حرفوں میں بھی بخیلی کی کس سے کہوں میری نہ کوئی سکھی ہے نہ سہیلی ہے۔ اپنا ہے نہ پرایا ہے۔ کاش مجھ پر کوئی لعن طعن ہی کرنے والا ہوتا۔ اسی بہانے سے دل بہلتا اس کا ذکر سننے میں آتا۔ میں نے اس کی خاطر رسوائیاں برداشت کی دنیا نے کیا کچھ نہ کہا لیکن اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ میں بھی کوئی ہوں۔ اب ہچکی آئی ہے کیا (موہنے واسنیہا) پیام یار لائی ہے۔ اگر اس کا خط ہے تو کس سے پڑھواؤں، خیال کے ڈاک میں سانس کا ڈاکیہ لایا ہے۔ وہی پڑھے گا۔ مگر آہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے آتے ہیں۔ تلھ (پیارے) مجھے بتا تو کیوں روندا (روتا) ہے۔ میرا ساجن تو اچھا ہے۔'' (ایضاً، ص 38-137)

ہچکی کے بہانے اس انشائیے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے کتنا گہرا اور عمیق مشاہدہ ہے۔ اس انشائیے میں بھرپور ہندوستانی تہذیب کی عکاسی نظر آتی ہے۔ حسن نظامی کے بہت سے انشائیے مکالموں کے بل بوتے پر آگے بڑھتے ہیں مثال کے طور پر شروع کے چند جملے دیکھیں:

''جاری جا میں روٹی نہیں کھاتا، چاولوں کی چچ ادھر کنارے پر رکھ دے اور ایک چلم بھر کر لا۔ دم لگاؤں دھواں اڑاؤں غم مٹاؤں۔

چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

کیوں ری نندا کی ماں دریا کا پانی گدلا، صابن کم، میں کیوں کر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں، چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔

دیکھ درخت کا پتا سوکھ کر گرا، ہوا اڑا کر لے چلی۔ اب خبر نہیں یہ بچھڑا ہوا کب ملے گا۔ چھوا چھو، چھوا چھو، چھوا چھو۔'' (ایضاً، ص 103)

حسن نظامی نے ہندوستانی آہنگ کو تصوف میں ڈھالا ہے۔ اور اپنے انشائیوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور تاریخی تلمیحوں کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ہندی کے ہلکے پھلکے نرم اور مترنم الفاظ کے استعمال سے ان کے اسلوب میں مٹھاس اور رس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایجاز و اختصار حسن نظامی کے انشائیوں کی ایک خاص خوبی ہے۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے انشائیے لکھے ہیں جو تکنیک اور معنویت کے اعتبار سے بڑے مکمل اور بھرپور ہوتے ہیں، جیسے 'آیار چل کر دیکھیں'، ''برسات کا تماشہ' اور 'مرغ کی اذان' وغیرہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہوتے ہیں جن میں تشنگی کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا۔

خواجہ حسن نظامی کو اپنے عہد کے بدلے ہوئے سماجی ومعاشی حالات کی تیز رفتاری کا احساس تھا۔ ان کا ایک انشائیہ 'مچھر' تہذیبی وثقافتی صورت حال اور ذات کائنات کے مسائل کا اشاریہ بن گیا ہے۔ جو سرعت پذیر ثقافتی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مچھر کا کردار

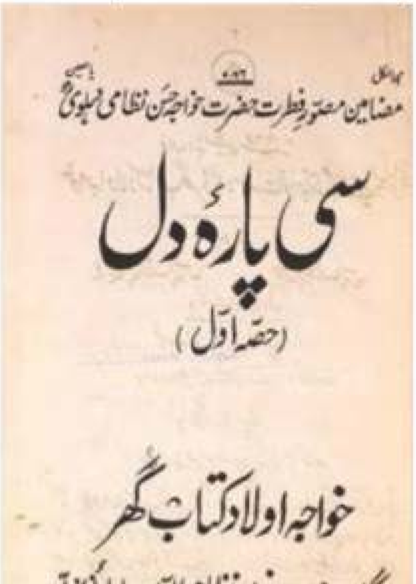

انسانوں سے کم نہیں، مچھر کو طنز کا آلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے اس کو عاشق مزاج بتا کر اس زمانے کے نوابوں، راجاؤں کے تعیش پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس کا ایک اقتباس دیکھیے:

’’یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔یہ تم اپنی عادت کے موافق سراسر نا انصافی کرتے ہو۔حضرت میں تو کان میں آکر الٹی میٹم دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہو جاؤ۔اب حملہ ہوتا ہے۔تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔زمانہ خود فیصلہ کرے گا کہ میدان جنگ میں کالا بھتنا لمبے لمبے پاؤں والا بے ڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔‘‘ (ایضاً،ص،173)

خواجہ صاحب کے ان انشائیوں کو پڑھتے ہوئے ہنسی بھی آتی ہے اور قاری بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔فضابندی اور بیانیہ اسلوب کے ذریعہ تہذیب و ثقافت کی حقیقی تعبیر پیش کرنے کا بہت ہی نرالا انداز اپنایا ہے۔اسی طرح جھینگر کو انھوں نے ہم عصر تعلیمی، سماجی اور ثقافتی صورت حال پر طنز کا ایک آلہ بنایا ہے۔جھینگر فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں بیٹھا ہوا ہے۔یہ تاریخی سانحہ ہی نہیں بلکہ کسی قوم کی ثقافتی زوال کا نتیجہ ہے۔اس کے ذریعہ انھوں نے ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ترغیب دی۔جھینگر کے پردے میں فرد اور معاشرے کے رویوں پر گہرا طنز کیا ہے اور مختلف سماجی برائیوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے مختلف مذاہب اور مختلف صوبوں کے لوگوں کی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔انھوں نے جہاں ہندو مسلم اور سکھ کی بات کی ہے وہیں یوپی والے، پنجابی اور دلی والے جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھائے ہیں۔ان کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے کہ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں کسی انشا پرداز نے اتنے مختلف موضوعات پر نہیں لکھا۔سیاسی، سماجی، اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل سے لے کر چھوٹی چھوٹی چیزوں تک کو موضوع بنایا ہے۔انھیں زندگی سے بے پناہ محبت تھی اپنے گرد و پیش کی ہر چیز انھیں عزیز تھی وہ عالم تھے اس لیے ان کا علم وسیع تھا۔آنکھیں اور دماغ کھلا رکھتے تھے اس لیے ان کا مشاہدہ غیر معمولی تھا۔وہ گوشہ نشین نہیں تھے بلکہ خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے والے تھے۔’’ٹھنڈا سانس کھجور کی ٹہنی کے نیچے‘‘ کے ایک اقتباس کو دیکھیں:

’’میرٹھ میں شام تھی، ابر تھا ہوا کا سکوت تھا، آسمان و زمین پر اداسی تھی جھینگروں کا شور تھا۔مینڈک جگہ جگہ بول رہے تھے۔میں نے کھجور کے نیچے کھڑے ہو کر قدرت کے اس نظارے کو دیکھا اور میرے سینے نے ایک ٹھنڈا سانس باہر بھیجا۔زمین کہتی تھی میں ٹھنڈی ہوں۔بارش کے پانی نے مجھ کو سیراب کر دیا۔دیکھو میرے جسم پر پانی بہنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں جو بل کھاتا ہوا مجھ پر سے گزرا ہے۔‘‘ (ایضاً،ص112)

خواجہ صاحب کے انشائیے مادّی قدروں کی براہ

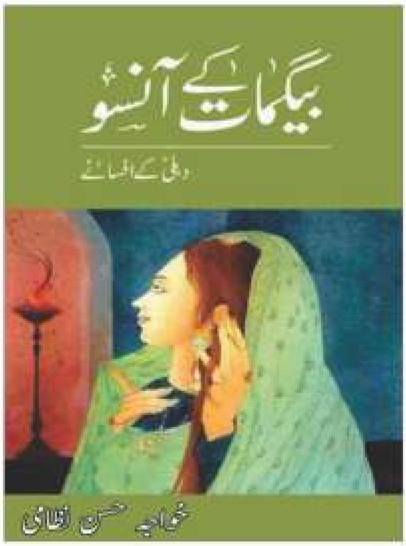

راست مخالفت نہیں کرتے ہیں۔مگر رومانی اخلاقی رجحانات کو برقرار رکھنے یا اپنانے اور انسان کا رشتہ کائنات اور فطرت سے استوار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اور اسی پر ان کا زیادہ زور ہوتا ہے۔

حسن نظامی اس بات کو سمجھتے تھے کہ انسان کو زیادہ دیر تک نصیحت اور پند کی باتیں نہیں سنا سکتے۔اس لیے انھوں نے براہ راست نصیحت نہ کر کے نصیحت کی باتیں انشائیے کے نرم پیرائے میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔قاری کو اس طرح کی نصیحت میں تاثیر آنے لگتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی ایک وسیع النظر شخص تھے بلا امتیاز وہ سبھی کو ایک خدا کی مخلوق سمجھتے تھے اور سبھی سے پیار کرتے تھے۔تکریم آدم ان کا شیوہ تھا۔وہ کسی کو حقیر نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی نے ہندوستان کے موسم، یہاں کے پہاڑ، یہاں کی ندیاں، لوک تہذیب، پھلوں اور پھولوں کا بیان، برسات کا موسم غرض مناظر قدرت کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔’’مدنی شیام سندر کی مرلی‘‘ انشائیہ میں ہندوستانی ثقافت کی جھلک بہت نمایاں ہے۔اس سلسلے کا ایک اقتباس دیکھیے:

’’شیام سندر مرلی لیے بن سے نکلے۔وہ ہمارے سینا پتی تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے۔اب کوئی دم میں دم مرلیا باجے گی اور نین کی بدلی برسے گی۔ندی نالے سوکھے تھے۔گنگا جمنا پیاسی تھیں۔گھاٹ کے تیرتھ سونے تھے، بھگتی کا تھا کال پڑا۔ست کے گلے جنجال پڑا۔اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی اور جنتا من کافور ہوئی اب ہر ہر کی آمد ہے۔‘‘ (ایضاً،ص103)

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے اپنے عارفانہ جذبات کو ہم آہنگ کیا ہے۔جہاں جہاں عشقیہ بیان ہوئے ہیں وہاں بھی ہندوستان کی ایک الگ جھلک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔بالخصوص عشق و محبت اور سوز و گداز کے بیان میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔انھوں نے مسلمانوں کی اخلاقی اقدار اور اصلاح کے لیے قرآن کی تعلیمات اور تصوف کا سہارا لے کر انشائیے لکھے۔ہندوستان کے درپیش مسائل سے خواجہ صاحب کا فکری پس منظر تیار ہوا پھر مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتابیں کسی مقصد کے تحت لکھ ڈالیں جو آج بھی معاشی اور معاشرتی سطح پر قوم کی اصلاح اور فلاح و بہبود میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے اونچ نیچ دیکھے تھے جن سے ان کی بصیرت میں تیزی پیدا ہوئی۔ان کے مزاج کا ضبط اور ان کی سادگی ان کے اسلوب میں نمایاں ہے۔وہ اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں جنھوں نے عام فہم زبان میں طریقت کے رازوں کو عوام تک پہنچایا ان کی ٹکسالی اور شیریں زبان اس وقت تک قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی جب تک اردو بولنے والے موجود رہیں گے۔

■

Dr Mohd Akbar
Assistant Professor
CPDUMT,MANUU,
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mb.8373984391
akbarjnu79@gmail.com

غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری

عبدالرزاق زیادی

غیاث احمد گدی (1986-1928) کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد اردو فکشن بالخصوص اردو افسانے کو اپنے فکر وفن اور طرز اسلوب کے ذریعے جن تخلیق کاروں نے بہت متاثر کیا اور اس میں اپنا نمایاں نقش ثبت کرنے میں کامیاب رہے۔ ان میں ایک اہم اور معتبر نام غیاث احمد گدی کا بھی ہے۔ غیاث احمد گدی نے چوتھی کلاس پاس ہونے کے باوجود نہ صرف اردو زبان وادب کی بیشتر کتابیں پڑھ لی تھیں بلکہ بہت جلد ان کی کہانیاں اس عہد کے بیشتر رسائل وجرائد کی زینت بن چکی تھیں۔ غیاث احمد گدی کی پہلی کہانی 'دیوتا' کے نام سے 1947 میں 'ہمایوں' میں لاہور سے شائع ہوئی۔ پھر یکے بعد دیگرے ان کے متعدد افسانے چھپتے چلے گئے۔ بابا لوگ (1969)، پرندہ پکڑنے والی گاڑی (1977) اور سارا دن دھوپ (1985) غیاث احمد گدی کے تین افسانوی مجموعے اردو فکشن میں غیر معمولی اضافے ہیں۔ غیاث احمد گدی نے کن حالات میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے جمشید قمر لکھتے ہیں:

''غیاث احمد نے زندگی کرنے کے لیے جس راہ کا انتخاب کیا، اس کا ایک سرا تو حالات کے آگے جھکنے کے بجائے ان کے خلاف نبرد آزمائی سے جا ملتا ہے۔ ان جاں گسل حالات نے ان کی شخصیت میں دردمندی اور جاں گدازی کی ایسی صورت کو پیدا کیا جس نے ان کی تخلیقات کی باطنی ساخت میں مستقل عنصر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ میرے خیال میں اپنے خاندان کے سفاکانہ رویوں نے ہی ان کی زندگی کے حالات کو جاں گسل بنا دیا تھا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ یہاں کے رہتے ہوئے بھی ان کے بھاگے بھاگے پھرنے کے احساس کی تہہ میں وہی محرومیاں اور نا آسودگیاں ہیں، جن کا سامنا انھوں نے اپنے خاندانی ماحول میں کیا۔ ان کے بیشتر افسانوں میں افرادِ قصہ کی زندگی کے تجربے کی نوعیت اور اس کی تہہ میں یہی عناصر موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بیانیہ کی تہہ میں نرم و مدھم، گھلتا پگھلتا جو لہجہ پوشیدہ ہے، اس کے عواقب میں وہی دردمندی اور جاں گدازی کے مستقل عناصر ہیں، جن سے غیاث کی زندگی اور فن دونوں کا خمیر اٹھتا ہے۔ ان کے تخلیقی ذہن کی سرشت ومزاج میں موجود ان عناصر کی تعمیر ان ہی اسباب وعوامل کے رہین منت ہیں جن سے غیاث زندگی میں برسرپیکار رہے۔''[1]

مذکورہ اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگانا قطعی دشوار نہیں کہ غیاث احمد گدی کے فکر وفن کا خمیر کن حالات اور کس پس منظر میں ہوا تھا۔ چونکہ غیاث احمد گدی کی پوری زندگی مصائب و آلام اور پریشانیوں سے گھری ہوئی تھی اس لیے ان کی بیشتر کہانیوں میں بھی ہمیں وہی فضا نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ان مسائل ومعاملات کو موضوع بنایا ہے جن کا تعلق ان کے گرد وپیش سے تھا مگر ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ ان میں کسی ایک شخص یا علاقے تک محدود نہیں۔ ان کی کہانیاں خواہ وہ ظلم واستحصال کی ہو، احتجاج وانحراف کی ہو، جنسی احوال کی ہو، غریبی ومفلسی کی ہو، سماجی پستی و افلاس کی ہو ہر ایک میں انسانی ہمدردی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں انسان دوستی اور اس کے تحفظ کا اظہار قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ غیاث احمد گدی کے فکر وفن کا ذکر کرتے ہوئے وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''غیاث کا سنجیدہ قاری ایک نظر میں محسوس کرے گا کہ وہ انسان دوستی کے بہت بڑے علمبردار رہے ہیں۔ ان کا دل انسانی ہمدردیوں کی شیرینی سے بھرا ہے، اس حد تک کہ وہ ایسے افسانے میں بھی جہاں جارحانہ اور تشدد کی فضا تعمیر کرنے میں مجبور ہوتے ہیں وہاں بھی انسانی ہمدردی کی ازلی جبلت ان پر حاوی ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک Idealist کہہ دینا آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مثال پسند تو کسی نہ کسی نقطۂ نظر کا پابند ہوتا ہے۔ کسی ازم کی حدوں میں اسیر ہوتا ہے۔ حیات وکائنات کے بارے میں اس کا موقف واضح ہوتا ہے اور اس کی نگارشات اسی موقف کی ترویج واشاعت کا آلۂ کار ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے کہا ہے کہ غیاث کسی ازم کے پابند نہیں تو پھر ان کی مثال پسندی کا کیا جواز ہے؟''[2]

وہاب اشرفی نے غیاث احمد گدی کے حوالے سے جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں ایک بڑی بات ان کا ہر طرح کے ازم سے آزاد ہونا ہے۔ حالانکہ ان کے بعض افسانوں پر منٹو کا اثر ہے۔ کرشن چندر اور بیدی، انتظار حسین اور قرۃ العین کے طرز پر بھی انھوں نے اپنی کہانیاں لکھی ہیں۔ غیاث احمد گدی کے بعض افسانوں میں ترقی پسندیت کا رنگ غالب ہے تو کسی میں جدیدیت کے اثرات۔ لیکن ان سب کے باوجود غیاث احمد گدی کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے خود کو کسی ازم یا تحریک کا پابند نہیں بنایا بلکہ اس کے برخلاف انھوں نے ہمیشہ اپنے تجربات ومشاہدات کو اپنا رہنما بنایا اور فنی سطح پر اپنے مشاہدات وتجربات کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ غیاث احمد گدی کا جو اسلوب ہے اس میں قدم قدم پر فطری پن اور اورجنلٹی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''میں اس خوشبو کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتا ہوں بے بی؟ کیسے زندہ رہ سکتا ہوں...؟''

باہر ایک بنگولے کے ساتھ جیپ کے رکنے کی

آواز سنائی دی۔ بڑھا انکل نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کچھ پاتے پاتے اس نے کھو دیا۔ پھر اس کے کانوں میں جوتے کی آواز آئی۔ وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیچڑ بھری ہوئی آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے نم ہو رہے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آستین سے آنکھیں پونچھ لیں۔

برآمدے کو عبور کر کے نئی میم صاحب اس کے سامنے آ گئی۔ ''یو بڑھا۔ تم اور میں کیا کرتا۔'' اس نے نفرت سے بڑھا انکل کو گھورا۔ ''کیا چوری کرنا مانگتا''۔

''مو میم صاحب ایسا اپھک نہیں۔ ادر بے بی ہے نا... وہ رک گیا۔ کیا وہ سچ کہہ دے؟ نہیں! نئی میم صاحب ابھی بے بی کو بہوت گالیاں دے گی۔ بہوت جھگڑا کرے گی۔ سوتیلی ماں ہے نا! بہت تکلیف دے گی... اس کا دل لرز گیا۔''3

اس اقتباس کے ہر لفظ اور جملے سے غیاث احمد گدی کی حقیقت نگاری اور فطری پن کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی 'بابا لوگ' ہو یا اس کے علاوہ دیگر کہانیاں مثلاً پہیہ، افعی، سائے ہم سائے، خانے تہ خانے وغیرہ میں غیاث احمد گدی کے فطری پن اور حقیقت نگاری کے عمدہ نمونے دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی اور فن کاری کے ساتھ انسانی زندگی کے مسائل و موضوعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں علاقائی رہن سہن، معاشرت و معیشت، لباس و پوشاک اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ وہاں کے فطری و قدرتی مناظر کی بڑی خوبصورت پیش کش موجود ہے۔ ان کہانیوں میں ہم غیاث احمد گدی کے یہاں ترقی پسند عناصر دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے اولین افسانوی مجموعہ 'بابا لوگ' کی بیشتر کہانیوں میں بھی وہی رنگ اور فضا موجود ہے، لیکن جوں جوں ان کا سفر آگے بڑھتا گیا ان کے فن میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی اور اس کا دائرہ ذات سے کائنات تک پھیلتا چلا گیا۔

اس سلسلے میں الیاس احمد گدی لکھتے ہیں:

''شروع میں ان کا فن اس ندی کی طرح تھا جو پہاڑ سے اتر رہی ہو۔ سرکش، تندخو، پتھروں سے سر ٹکراتی، چٹانوں سے الجھتی، جھاگ اڑاتی۔ مگر اب جیسے یہ ندی کھلے میدان میں اتر آئی تھی۔ اس میں وسعت بھی آ گئی تھی اور گہرائی بھی۔ اور ایک طرح کا وقار بھی۔ انھوں نے غم ذات کو غم کائنات تک پھیلا دیا تھا۔'' 4

اس میں شامل افسانوں میں صرف موضوعات و مسائل کے بیان میں ہی انفرادیت موجود نہیں ہے بلکہ ان میں ہیئت اور تکنیک میں تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ان افسانوں میں ایک طرف جہاں موضوعات و مسائل کی پیش کش میں ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، مادہ پرستی، سیاسی کشمکش، سماجی استحصال، غریبی و مفلسی جیسے مسائل کو بڑی حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہیں ان میں کہیں کہیں جدید تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے علامت نگاری اور اساطیری اسلوب کو بھی اپنایا گیا ہے۔

غیاث احمد گدی کے فن کا یہی ذات سے کائنات تک کا پھیلاؤ ان کے پہلے اور بعد کے افسانوں میں فکری و فنی اعتبار سے کافی فرق و امتیاز نظر آتا ہے۔ مجموعہ 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کے بیشتر افسانے اس کی عمدہ مثال ہیں۔ اس میں شامل افسانوں میں صرف موضوعات و مسائل کے بیان میں ہی انفرادیت موجود نہیں ہے بلکہ ان میں ہیئت اور تکنیک میں تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان افسانوں میں ایک طرف جہاں موضوعات و مسائل کی پیش کش میں ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، مادہ پرستی، سیاسی کشمکش، سماجی استحصال، غریبی و مفلسی جیسے مسائل کو بڑی حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہیں ان میں کہیں کہیں جدید تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے علامت نگاری اور اساطیری اسلوب کو بھی اپنایا گیا ہے۔ مجموعے میں شامل کہانیاں مثلاً تج دو تج دو، ڈوب جانے والا سورج، ایک خوں آشام صبح، افعی، پر کاشو، دیمک، کیمیا گر، کالے شاہ، اندھے پرندے کا سفر اور پرندہ پکڑنے والی گاڑی وغیرہ اس کی اہم مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان کہانیوں میں تخلیق کار نے بڑی خوبصورتی اور فن کاری کے ساتھ علامت نگاری سے کام لیا ہے۔ افسانہ 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ روز مرہ کا دستور ہوتا۔ دوکان دار دوکانوں میں ہوتے، راہ گیر راہ چلتے رہتے، موٹر کاریں تیزی سے پوں پاں کرتی گزرتی ہوتیں، جوتا گانٹھنے والا گانٹھتا رہتا، خرید و فروخت جاری رہتی، شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی دیتی، لین دین کا بازار اتنا جواں ہوتا کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اٹھتی، لیکن ان میں سے کسی کی نظر اٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا... کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلہ سے اٹھتا، گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے تو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے، پھر وہ آدمی سکے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھوں اور چہروں سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں، یہ عمل کچھ زیادہ دیر نہیں رہتا، فقط چند منٹ، دس یا بیس منٹ تک، پھر حیرت کا یہ وقفہ کم ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے محض چند سکنڈ رہ گیا تو، اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندے پکڑنے والی گاڑی آ گئی ہے، اور پرندہ پکڑتی چلی جا رہی ہے اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔''5

یہ افسانہ در حقیقت ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس کے ذریعے غیاث احمد گدی نے اپنے اس مظلوم و لاچار سماجی زندگی کو پیش کیا ہے جس میں ہر طرح کی آزادی چھین لی گئی ہے۔ اس افسانے میں جہاں ایک طرف پرندہ پکڑنے والی گاڑی کی خوبصورتی اور دلکشی کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف اس سماج و معاشرت کے نظام کو بیان کیا ہے جو حد درجہ ظالم و جابر ہے۔ اس افسانے کا ہر ہر لفظ اپنے آپ میں ایک علامتی پیکر لیے ہوئے ہے۔ موجودہ عہد کے پس منظر میں بھی اگر اس افسانے کو دیکھیں تو اس کی معنویت بڑھ جاتی ہے جہاں ظلم و زیادتی کا رویہ اپنایا جاتا ہے اور حکومتی انتظام و انصرام ہی نہیں بلکہ اعلیٰ افسران بھی اس کی پشت پناہی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے میں کچھ ایسے افسانے بھی شامل ہیں جن میں غیاث احمد گدی نے عام علامت نگاری سے ہٹ کر بھی کام لیا ہے۔ اس میں انھوں نے انسانوں اور حیوانوں کو کردار نہ بنا کر بے جان چیزوں کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ افسانوی مجموعہ 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کا انتساب غیاث احمد گدی نے نہ صرف 'منی بائی طوطے کے نام' کیا ہے بلکہ اسی نام سے افسانے

میں منی بائی کے طوطے کو ایک زندہ جاوید کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ غیاث احمد گدی کے علامتی افسانوں میں 'تج دو تج دو' بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے ایک فرد کو علامت بنا کر پورے سماج کی عکاسی کی ہے۔ غیاث احمد گدی نے کچھ افسانے جدیدیت کے زیر اثر بھی لکھے ہیں بلکہ ایک زمانے میں ان کا رجحان ترقی پسندی سے ہٹ کر اس جانب غیر معمولی حد تک ہو گیا تھا، ممکن ہے یہ اسی کا نتیجہ ہو۔ مگر اس میں بھی غیاث احمد گدی کا فن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ اس کے مرکزی کردار کے سہارے تحلیل نفسی کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے لیکن اس میں بھی کہانی پن اور بیانیہ کا اس طرح خیال رکھا گیا ہے کہ موضوع محض کسی ذات یا فرد تک محدود نہیں رہ جاتا ہے بلکہ یہ ہر فرد، خاندان، اور سماج کو احاطے میں لے لیتا ہے۔ اس کہانی میں ایک دم کٹے کتّے کا بطور علامت واستعارہ استعمال ہوا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ رو رہا تھا اور اس کے کان بج رہے تھے۔ لگا تار وہی منحوس الفاظ گونج رہے تھے اور جب وہ رو رہا تھا، اس نے دیکھا وہ دم کٹا کتا جسے وہ دروازے کے باہر چھوڑ آیا تھا اور اندر آ کر دروازہ بند کر لیا تھا، وہ پتہ نہیں کیسے اندر آ کر اس کے لحاف میں آگھسا تھا۔ اس نے دیکھا دم کٹا کتا اس سے تقریباً چمٹا اس کے گال سے اپنے تھوتھنے لگائے تھا اور اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کتا اس کی گردن کو ہولے ہولے چاٹ رہا تھا.. اور اس کے کان بدستور بج رہے تھے اور آنسو بہہ رہے تھے۔''6

اس کہانی میں غیاث احمد گدی نے دم کٹے کتے کو ضمیر کی علامت بنانے میں حد درجہ فن کاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔

افسانوی مجموعہ بابا لوگ ہو یا پرندہ پکڑنے والی گاڑی یا پھر سارا دن دھوپ میں شامل غیاث احمد گدی کے آخری دور کے افسانے ہیں۔ ان کے مطالعے سے جہاں قاری پر ان کے فکر وفن کے امتیازات کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں فکری وفنی گہرائی بھی آتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آخری دور کے افسانوں کے موضوعات میں ہمہ گیری و آفاقیت کے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار بھی کسی خاص سماج ومعاشرے اور ملک وخطے تک محدود نہیں ہوتے۔

گرچہ ان کہانیوں میں ہندوستان کے پس منظر میں کہانیاں بنی گئی ہیں اور اس کے واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے مگر اس کے جزئیات اور داخلی کینوس اس قدر وسیع ہیں کہ اس میں قومی و بین الاقوامی مسائل دیکھے جاسکتے ہیں، نیز ان میں علامتی، استعارتی اور تمثیلی انداز کے ساتھ ساتھ ہیئت وتکنیک کے تجربے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ معروف فکشن ناقد مہدی جعفر لکھتے ہیں:

افسانوی مجموعہ بابا لوگ ہویا پرندہ پکڑنے والی گاڑی یا پھر سارادن دھوپ میں شامل غیاث احمد گدی کے آخری دور کے افسانے ہیں۔ ان کے مطالعے سے جہاں قاری پر ان کے فکر و فن کے امتیازات کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں فکری و فنی گہرائی بھی آتی چلی گئی۔

''غیاث احمد گدی کے یہاں عموماً شعور کی رو کی تکنیک استعمال ہوئی ہے۔ سوچنے کے عمل میں غواصی اور دروں بینی جزوی طور پر ان کی پہچان بنتی ہے۔ افسانوں میں شعور اور تحت الشعور دھوپ چھاؤں کی طرح جھلملاتے ہیں۔ چنانچہ عصری ماحول کے شعوری پس منظر میں یادوں کا استغراق ایک چونکا دینے والا اثر رکھتا ہے۔ اس کے باوجود افسانوں میں فکری عنصر حاوی نظر آتا ہے۔ فکر، احساس اور جذبے کے ساتھ خمیر ہو کر سامنے آتی ہے اور تمثیل نگاری، پیکر تراشی اور اسطور سازی کے عمل سے گذرتی ہے۔ گدی کا لہجہ نرم ہے اور انداز پرسکون۔ ان کی زبان الجھاؤ اور پیچیدگی سے گریز کرتی ہے اور الفاظ، زبان و مکان، جذبات اور احساسات کے تسلسل سے ہم آہنگ ہو کر ڈھلتے ہیں۔ ان کے جملوں کی تشکیل اور تراش وخراش پر شعوری حکمرانی صاف نظر آتی ہے۔ چنانچہ غیاث احمد گدی اپنے اسلوب پر اس درجہ قادر ہیں کہ وہ نئی حسیت کو بھی پرانے اسلوب میں داخل کر کے زبان کو تازگی بخشنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔''7

گرچہ غیاث احمد گدی نے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال شعوری طور پر اپنے افسانوں میں نہیں کیا ہے لیکن جا بجا ان میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں اور اس تعلق سے ان کی متعدد کہانیاں مثلاً طلوع، کوئی روشنی، صبح کا دامن، چہرے پہ چہرہ، سایے ہم سایے، سرنگ، بھیگا ہوا لب وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس طرح آزادی کے بعد اردو فکشن بالخصوص اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں اپنا نام رقم کرانے والے تخلیق کاروں میں غیاث احمد گدی ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف اردو فکشن کے سرمایے میں قابل قدر اضافے کیے بلکہ موضوعات و مسائل اور اسلوب وتکنیک کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سطح پر بھی اسے وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ غیاث احمد گدی ایک ذہین اور اوریجنل تخلیق کار تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بھی ان کی تخلیقات کے فطری پن اور اوریجنلٹی نے انھیں ادب میں ایک انفرادی شناخت عطا کی ہے اور اسی کی بدولت وہ ادب کی دنیا میں ہمیشہ امر رہیں گے۔

حواشی

1. غیاث کا تخلیقی ذہن، جمشید قمر، مشمولہ غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار، احتساب پبلی کیشن، بوکارو، 2000، ص 100-99
2. غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری، وہاب اشرفی، مشمولہ غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار، احتساب پبلی کیشن، بوکارو، 2000، ص 147
3. کہانی 'بابا لوگ'، غیاث احمد گدی مشمولہ غیاث احمد گدی کے افسانے، جمشید قمر، ایمن پبلیکیشنز، رانچی، 1991، ص 88
4. گمدہ پوری کا داستان گو، الیاس احمد گدی، بحوالہ غیاث احمد گدی، نسیم احمد نسیم، ساہتیہ اکادمی، دہلی 2017، ص 28
5. کہانی 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی'، غیاث احمد گدی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1977، ص 10
6. تج دو تج دو، غیاث احمد گدی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1977، ص 38
7. نئی افسانوی تقلیب، مہدی جعفر، ماہنامہ 'جواز' (مالیگاؤں) جنوری تا مارچ، بحوالہ غیاث احمد گدی، ساہتیہ اکادمی، ص 25-24

■

Dr. Abdur Razzaque Ziyadi
House No.D-14/7 Johari Farm
Noor Nagar Extn. , Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob.: 9911589715
E-mil: arziyadi@gmail.com

سید محمد

خلیل علی خاں اشک

فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں ہی ایک ایسے مولف ہیں جن کی کتاب تو بے حد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ اس کی بدولت مشہور ہونے کے بجائے بالکل پردۂ گمنامی میں رہے۔ 'قصۂ امیر حمزہ' کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس زمانے میں بھی جب کہ اردو زبان نے ترقی کے کئی مدارج طے کرلیے ہیں اور اس میں ناولوں، قصوں، مختصر افسانوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ امیر حمزہ کے شائق اکثر جگہ نظر آتے ہیں اور اب بھی اس کتاب کو تھوڑی بہت مقبولیت حاصل ہے مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خلیل علی خاں کی محنت شاقہ نے ان کو نام و نمود سے اب تک بالکل محروم رکھا اور شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ان کا نام ان کے اپنے کارناموں کے ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جارہا ہے۔ انھوں نے جس کاوش و محنت سے داستان امیر حمزہ سی ضخیم کتاب جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے لکھی ہے اس کی داد دینا تو کجا آج تک کسی نے اس خصوص میں ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔[1]

ہم نے اردو شاعروں کے تقریباً تمام تذکروں کی ورق گردانی کی مگر ان کا حال کسی میں نہیں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے حالات وغیرہ کے متعلق بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ ان کی مولفہ کتابیں بھی ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتیں۔[2] جہاں تک ہمیں معلوم ہے مولوی عبدالحق صاحب مدیر رسالہ اردو نے 'اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی' کے عنوان سے جو مضمون فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں پر لکھا ہے اس میں خلیل علی خاں کا ذکر ہے مگر صرف اتنا ہی کہ انھوں نے 1809 میں کپتان ٹیلر کے حکم سے 'اکبر نامۂ علامی ابوالفضل کو' واقعات اکبر' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہیں ہوا۔ (رسالہ اردو نمبر 151، ص 485)

پھر مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب میں ان کا جو ذکر کیا ہے وہ سراسر مولوی عبدالحق صاحب کے بیان کی نقل ہے اور اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ (سیر المصنفین، ص 136) ان دونوں نے خلیل علی خاں کو خلیل اللہ خاں لکھا ہے مگر ہمارے پیش نظر ان کی جو کتاب ہے اس میں صاف طور پر خلیل علی خاں مندرج ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔[3] ہم آگے کسی موقعے پر اشک کا وہ بیان نقل کردیں گے جس سے ان کا اصل نام معلوم ہوسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اشک نے اپنے آبا واجداد اور مولد وطن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ان کی تاریخ ولادت، مقام پیدائش اور تعلیم و تربیت تک کا حال معلوم نہیں۔[4] بہر حال صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ابتداً کالج کے تنخواہ یاب منشی نہیں تھے۔ غالباً ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما سے اپنے طور پر پہلے یہ کتاب مرتب کی ہوگی اور پھر کالج کے متوسل ہوگئے۔

چار کتابیں ان کی یادگار ہیں۔[6] ان میں سے پہلے قصہ امیر حمزہ ہے۔ یہ طولانی اور ضخیم قصہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما سے 1215ھ (1801) میں لکھا گیا۔ اس قصے کے اصل مصنف کے متعلق مختلف خیالات ہیں اور کوئی قطعی و یقینی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ یہ قصہ سلطان محمود غزنوی (998 تا 1030) کے خوش کرنے اور اس فاتح کو ملک گیری و کشور کشائی کے لیے آمادہ و تیار رکھنے کے لیے کئی ایک راویوں اور داستان گویوں نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا۔ ایک اور موقعے پر اشک نے ہی اس کو ملا جلال بلخی سے منسوب کیا ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک فارسی نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں اس کا مصنف شاہ ناصر الدین احمد کو بتایا گیا۔ اسی میوزیم میں دوسرا نسخہ ابوالعلائی کے نام سے منسوب ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو فیضی کے تخلیقی دماغ کی پیداوار بتایا ہے۔ غرض وہ مثل ہے جتنے منھ اتنی باتیں۔ ہماری دسترس میں اصل فارسی نسخے نہیں ہیں اور شاید ہندوستان میں بہت ہی کم جگہ فارسی نسخے موجود ہوں گے۔ ایسی صورت میں ہم اس کے اصل مصنف کے متعلق کوئی صحیح اور معتبر بات بلا تحقیق کے نہیں بیان کرسکتے۔ پھر یہ بھی شبہ ہے کہ یہ قصہ ابتداً عربی میں بھی لکھا گیا یا فارسی ہی میں تصنیف ہوا۔ خلیل علی خاں اشک اور دیگر ہندوستانی مولفین کے نسخے جو دستیاب ہوئے ہیں ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اصل نسخہ فارسی میں اتنا طویل نہ تھا۔ ان لوگوں نے اس میں ہندوستانی عنصر کو داخل کرکے اپنالیا ہے اس پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

جیسا ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے اشک نے اس کو 1215ھ (1801) میں مرتب کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے اردو میں کسی نے توجہ نہیں کی تھی اور سب سے پہلے اشک نے ہی اس کو صاف زبان میں نوآموزان اردو کے لیے تالیف کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانہ میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات ایک داستان حضور میں سناتے تھے انعام واکرام پاتے تھے۔ اب شاہ علی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق 1215 ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں جو متخلص بہ اشک ہے حسب خواہش

مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا پر آموز ان زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلی میں لکھا تا کہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔''

اشک کے نسخے پر بحث کرنے سے قبل ایک نظر مروجہ اور جدید نسخوں پر بھی ڈال لینی ضروری ہے۔ مروجہ نسخوں میں سب سے پہلے منشی نول کشور کا مرتب کرایا ہوا نسخہ ہے۔ اس کو حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے ترتیب دیا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت سے تعقید عبارت دور کر کے اردوئے معلی کا جامہ پہنایا۔ یہ نسخہ بہت مقبول ہوا۔ چنانچہ چند ہی مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا پھر دو ایڈیشن اور شائع ہوئے، چوتھی مرتبہ نول کشور پریس کے مشہور مصحح سید تصدق حسین مرحوم نے جو عربی فارسی کے بڑے عالم تھے اور جن کی یادگار فارسی کی متداولہ و مشہور لغت 'لغات کشوری' اب تک مقبول خاص و عام ہے، اس کی نظر ثانی کی۔ تصدق حسین لکھنؤ کے باشندے تھے اور ان کی زبان عربی و فارسی سے اس قدر متاثر تھی کہ ان کی ہر عبارت سے عربیت اور رنگینی ٹپکتی ہے۔ انھوں نے نظر ثانی میں اس کو تکلفات و آرائشات لفظی سے 'فسانۂ عجائب' کا جواب بنا دیا اور جا بجا اپنی طرف سے اضافے کیے اور خود بھی بڑے افتخار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ بطور نثر 'فسانۂ عجائب' ترتیب دیا۔'' اس سلسلے میں انھوں نے در پردہ خلیل علی خاں کی عبارت کو تعقید سے معمور کہا ہے اور اس کو صاف زبان میں لکھنے کا سہرا حافظ سید عبداللہ بلگرامی کے سر باندھا ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ اشک کی عبارتیں بے حد صاف و سلیس ہیں۔ آگے ہم دونوں کی تھوڑی تھوڑی عبارت جو ایک ہی مضمون سے متعلق ہے نقل کر کے اس غلط بینی کا پردہ فاش کر دیں گے جس سے اصل حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

تصدق حسین کا مصحح نسخہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا طرز بیان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بالکل فسانۂ عجائب کی تقلید ہے اور ان کو خود بھی نہ صرف اعتراف بلکہ اس پر افتخار ہے۔ اس میں سادگی اور صفائی نام کو نہیں۔ اس نقص کے بعد بھی اس کا مقبول ہونا قوم کی تکلف پسندی اور بگڑے ہوئے مذاق کی دلیل ہے۔ ہر ملک اور قوم کی تاریخ ادبیات میں ایک دور ایسا ضرور ملتا ہے جب کہ ادب سے اصلیت دور ہو جاتی ہے اور بجائے معنوی خوبیوں کے لوگ ظاہری محاسن اور لفظی آرائشات کو پسند کرنے لگتے ہیں، صفائی اور سادگی پر تکلفات اور صنائع بدائع کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسا زمانہ حقیقی ادب کی پیداوار سے محروم رہتا ہے اور اس کا لٹریچر ادب عالیہ نہیں بن سکتا۔ اس کی بہار صرف چندروزہ ہوتی ہے اور کاغذی پھولوں کی طرح وہ بھی ایک محدود عرصے تک پبلک کو مرغوب طبع رہ کر فنا ہو جاتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں پوپ اور اس کے مقلدین کی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ فارسی کے متاخر غزل گویوں کی بھی یہی کیفیت ہے، خیالات میں اصلیت سادگی اور جوش مفقود ہے

رسالہ کائنات

مؤلفہ

خلیل علی خاں اشک

مرتبہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
استاد شعبۂ اردو و ثقافت ہند و پاکستان
اسکول آف اوریئنٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
یونیورسٹی آف لندن

شایع کردہ
اردو دنیا، کراچی

صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جس میں تاثیر نہیں۔ اسی طرح فارسی کے متاثر نثر نویسوں کے کارنامے بھی اصلیت سے دور ہیں۔ چہار مقالہ، نظامی عروضی، سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور رسائل طغرائے مشہدی کو ہمیشہ ہرگز فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک میں بقائے دوام کے آثار ہیں اور دوسرے میں چندروزہ لطف اور وقتی پسندیدگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اردو میں سرور کے 'فسانۂ عجائب' اور تصدق حسین کی مصحح داستانِ امیر حمزہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ جس طرح اردو شاعری کا مذاق بگڑتے بگڑتے صرف لفاظی اور نقالی رہ گئی۔ نثر نویسی بھی اس قعر میں گر پڑی اور چونکہ ایک زمانہ میں رنگینی طبع اور غفلت سے یہی طرز بیان مقبول تھا اور ان کتابوں کو بھی مقبولیت مل گئی مگر اب علوم جدیدہ کی ترقی کے ساتھ قوم کے مذاق میں بھی تبدیلی پیدا ہو چلی ہے اور اس قسم کی کتابوں سے عوام کو وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اسی داستان امیر حمزہ کو لیجیے اب سے گیارہ سال پیشتر اس کا بارہواں ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ دوبارہ اب تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اگرچہ اب قدیم قصوں کی طرف سے ان کی فوق العادت اور خلاف فطرت باتوں کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے مگر اشک کے 'قصۂ امیر حمزہ' اور اس کے ساتھ کی بعض دیگر کتابوں میں ایسے جوہر ضرور موجود ہیں جو پھر ایک بار ان کو مقبولیت دلا سکتے ہیں۔ جب افسانہ کا احیا ہوگا تو بہ لحاظ اصلیت و سادگی ان قصوں کو بعد کی مرصع اور پر تکلف کتابوں پر ترجیح حاصل ہو جائے گی اور خود اس وقت بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آج کل 'فسانۂ عجائب' کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو 'باغ و بہار' کو ہے۔

خلیل علی خاں کا طرز بیان نہایت سلیس اور بے تکلف ہے۔ انھوں نے میر امن اور شیر علی افسوس کی طرح دہلی کے ٹھیٹ محاوروں اور روزمرہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ سنجیدہ عبارت آرائی کی ہے۔ زبان میں گھلاوٹ بھی ہے اور سادگی بھی، ہندی اور فارسی الفاظ کا استعمال نہایت مناسب تناسب کے ساتھ کیا گیا ہے اور اکرام علی کی طرح زبان میں روانی اور صفائی بے حد ہے۔ کوئی فقرہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں معلوم ہوتا۔ بعض الفاظ جو اب تک متروک ہو گئے ہیں اس میں بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے دیگر معاصرین کے مقابلہ میں اشک کے ہاں ایسے متروکات کی تعداد بہت کم ہے۔ بعض جگہ فارسی ترکیبیں اور چھوٹے چھوٹے فارسی ٹکڑے بھی رکھے گئے ہیں مگر ایسی طویل کتاب میں ان سب کا استعمال برا نہیں۔ اس سے بجائے مصنوعیت پیدا ہونے کے اصلیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

امیر حمزہ کی داستان اردو ادبیات میں عجیب اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے ہی یہ قصہ چار جلدوں میں لکھا گیا تھا۔ منشی محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر نے اس کے مضمون کو طوالت دے کر اور حاشیے چڑھا کر کئی جلدیں طلسم ہوش ربا کی تیار کیں، پھر دوروں نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا اور شدید قلم کی جولانیوں سے طلسم ہفت پیکر، طلسم نوروزی جمشید، ایرج نامہ، اختر نامہ وغیرہ خدا جانے کتنے ناموں سے اس سلسلے کی جلدوں پر جلدیں تیار کیں۔ 7 غرض انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا (قاموس العلوم برطانیہ) کی طرح اس سلسلہ کا ایک اچھا خاصا کتاب

خانہ بن گیا اور داستان پسند پبلک کی ضیافت طبع کے لیے اتنا وافر ذخیرہ جمع ہوگیا کہ عمر کا بہت بڑا قصہ اس کے مطالعہ کی نذر ہوجائے۔

قصۂ امیر حمزہ کے رجال داستان میں عرب وعجم کی مشاہر ہستیوں کی عجیب آمیزش ہے۔ ایک طرف امیر حمزہ، عمرو عیار اور مقبل کی سیرتیں عربی ہیں تو دوسری طرف بزرجمہر، بختک، قباد اور نوشیرواں وغیرہ خالص ایرانی ہیں۔ پھر تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کو عجیب انداز سے مدغم کیا گیا ہے۔ بعض رسمیں اور طریقت خالص ایرانی ہیں جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ابتداً فارسی ہی میں تصنیف ہوا تھا۔ جیسے اڑتے ہوئے پرندوں میں سے کسی خاص پرندے کو تاک کر تیر مارنا اور اگر تیر اسی کے لگے تو اس سے اپنے مقصد میں کامیابی وموافق مرام نتیجے کی فال لینا، جس کو فال گوش کہتے ہیں۔ یہ خالص ایرانی دستور ہے۔ اس کے علاوہ ساری داستان میں بہت سی باتیں خالص ہندوستانی بھی ہیں جن سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اردو میں منتقل کرتے وقت مترجم کے دماغ رسا نے یہ اضافے کیے ہیں اور اصل قصے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ مثلاً مدرسہ میں عمرو عیار کی شرارتوں کی جو تفصیل دی ہے وہ سب ایسی شرارتیں ہیں جو نہ صرف ہندوستانی طلبہ میں پائی جاتی ہیں بلکہ خاص اسی ملک کی چیزیں ہیں یا عمرو عیار ایک دفعہ نوشدارو حاصل کرنے کے لیے مدائن جاتا ہے یا وروہاں اپنے آپ کو گاؤں کا باشندہ بتاتا اور نوشیرواں سے دیہاتی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ اس موقعے پر قصہ نویس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صوبۂ اودھ کے ایک گاؤں کی ہے۔ عمرو عیار کا ایک دفعہ سمندر میں ایک کشتی سے ٹاپو پر کود پڑنا اور پھر ایک موقعے پر ساحل پر اترتے ہی تسمہ پا اشخاص کا نظر آنا، یہ ٹکڑے الف لیلہ سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح سراندیپ کے بادشاہ لندھور سے لڑنے جانے سے قبل امیر حمزہ کا محل نوشیرواں میں بلایا جانا اور ان کی اس شرط پر کہ فتح وکامیابی کے بعد مہر نگار دختر نوشیرواں سے ان کا عقد کردیا جائے ان کو شربت پلانا اور پان کی گلوریاں دینا خالص ہندوستانی رسمیں ہیں، جن کو ایران سے کچھ علاقہ نہیں۔ قصہ نویس نے الفش وزیر کے اس تخت کی ساخت کا تخیل جو اس نے بادشاہ قباد کے لیے بنایا تھا، شاہ جہاں کے تخت طاؤس سے لیا ہے۔ غرض پوری داستان میں ایسی بیسیوں باتیں ہیں جن سے بخوبی واضح ہے کہ یہ مترجم کے حواشی ہیں اور اس نے قصہ کو اپنا لیا ہے۔

یوں تو اس قصہ کے اکثر و بیشتر رجال داستان میں فوق العادت اور بعض مرتبہ خلاف عقل باتیں بھی دکھائی گئی ہیں مگر ساری داستان میں سب سے زیادہ اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔ عمرو عیار اس قصے کی جان اور مرکز ہے۔ اس کے کردار میں عجیب وغریب گل کاریاں کی گئی ہیں اور اس کو ایسا چال باز مبارز طلب اور مہم باز بتایا گیا ہے کہ اس کے آگے یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ کے جنگجو نائٹ اور اڈونچرر کوئی حقیقت نہیں رکھتے، مگر اس کے کردار میں شروع ہی سے بری خصلتیں اور طمع اور چال بازی کے عناصر شامل کرکے اس کو نیکی سے دور بتایا ہے۔ غرض اس، سردار عیاران، سے ایسے ایسے کارنامے منسوب کیے گئے ہیں کہ عقل انسانی سے باہر ہیں۔

ذیل میں ہم ایک ہی مضمون کے متعلق اشک اور تصدق حسین دونوں کے نسخوں سے ایک بیان نقل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل، اصلی پھول اور کاغذی پھول میں ہوتا ہے۔ ایک سرتاپا صفائی، سادگی اور اصلیت کا نمونہ ہے اور دوسرا بالکلیہ مرصع مسجع، تکلف اور مصنوعیت کا مظہر ہے۔

حکایت: ''یہاں سے دو کلمہ داستان ملک الفش کے ملاحظہ فرمایئے، جب کہ وہ باغ تیار رہوا۔ ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی، غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہوکر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت واز دیاد خانہ زاد ہے۔ مصرع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

فرمایا کہ مضائقہ تم جاکر تیار کرو ہم بھی آتے ہیں۔ الفش حضور سے رخصت ہوکر واسطے تیار کے آگے گیا۔ بعد اس کے جانے کے بادشاہ بھی زمرد کے تخت پر سوار ہوکر اور تمام وزرا وامرا ہمراہ لے کر طرف باغ بیداد کے رونق افزا ہوئے۔ جب کہ سواری باغ کے قریب آئی ملک الفش نے ایک تخت ہوادار واسطے بادشاہ کے ایسا تیار کیا تھا کہ اس میں گل بوٹے لعل اور الماس کے تھے اور چاروں کونوں پر اس کے چار طاؤس زمرد کے بنائے گئے تھے جنھوں کے پیٹ میں لخلخے خوشبو کے رہتے تھے اور واسطے تخت کی شان کے طاؤس کے پہلو میں دونوں طرف ایک ایک نرگس دان رکھا تھا جن کے کونے مرصع کے مثل زمرد سرسبز تھے اور الماس کے پھول جنھوں کی زردی پکھراج کی سی تھی۔ اس کو معہ ہودجوں اور چالیس ہاتھیوں جن پر جھولیں زربفت کی پڑی ہوئیں اور عماریاں کارزری و جواہر نگار انھوں کی پیٹھ پر کسی ہوئی اور دو سو گھوڑے عربی، عراقی، ترکی، تازی معہ جواہر مرصع اور کئی اونٹ بغداد کے دوکوہانی کہ جن کے کجاؤں پر کارچوبی زربفت کی چادریں کسی ہوئی تھیں اور کتنے خیمے کتنی کشتیاں سلاح اور جواہرات کی اور پارچہ جات سوتی اور ریشمی اور پشمینے اپنے ساتھ لیے اور باہر کے جلوخانے تک استقبال کرکے بادشاہ کو یہ سب نذر گزرانا اور تخت کا پایہ پکڑ کر بوسہ دیا اور ہمراہ ہوا۔ جب کہ بادشاہ باغ کے اندر گئے دیکھا تو عجب گلزار ہے کہ شاید کہیں ایسا نہ ہوگا۔ اس کی وہ چار دیواری سنگ مرمر کی جس میں تمام فیروزے کی تحریر اور طرح بہ طرح کی بیل ہے اور نیچے زمرد کے اور خوشے موتیوں کے لگے ہوئے ہیں، اور وہ صاف روشنی سبزے کا عالم ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں کی خوشبو ہر دم جس سے دماغ کو قوت ہوتی تھی۔ کیاریاں اقسام اقسام کی، گلزار ہر قسم کے پھول جس میں پھولے ہوئے مثل گل لالہ نافرمان بابونہ گیندا، جوہی سوسن چنبیلی، موتیا، موگرا رائے بیل، گلاب، سیوتی، کلغا، گل مہدی، گل شبو، نرگس، داؤدی ہر ایک طرح کلی بہار تھی اور دونو ں طرف روش کے دو بڑے پیڑ چمپا اور مولسری کے بہت خوبصورت پھولے جن کی تمام ٹہنیوں پر اور شاخوں پر غرارے بادلے چڑھے ہوئے۔ وہ مہندی اور رائے بیل کی ٹہنیوں پر شان، وہ چوپڑ کی نہر مثل لوح الماس بلب پانی کے چہار طرف گئی کہ جس کے فوارو ں پر ہزارہ کی جا طوطے، بلبل، فاختہ، مور، عندلیب جواہرات کے بنے ہوئے، جن کے پروبال سے ہزارہ چھٹا ہوا ایک لطف دیتا تھا اور سفید عالم عمارت کا جس میں سنہری روپہلی الماس تراش استادوں پر تمام تمامی کے سائبان کھنچے ہوئے کہ جن میں سراسر موتیوں کی جھالر تھی اور سونے کی تیلیوں کی چلمنیں مینے سے رنگی ہوئیں۔ پوٹی داروں پر کلابتوں کی ڈوریوں کی زربفت کے پردوں کے ساتھ بندھی ہوئی۔ غرض بادشاہ اس باغ کو دیکھ کر اپنے باغ کو بھول گیا۔ (قصۂ امیر حمزہ از اشک، ص ۷)

''حکایت: نخلبندان بوستان اخبار، چمن پیرایان گلستاں اظہار، تختہ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ

موقع موقع پر نصب فرماتے ہیں۔ صحن شفاف قرطاس کو گل و ریاحین مضامین رنگارنگ سے یوں رشک تختہ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا نمونہ بہشت شداد نمودار ہوا۔ الفش خوشی سے پھول گیا۔ فکر دارین بھول گیا۔ فرط مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جامہ تن سے باہر ہوا جاتا تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ غلام نے حضور کی بدولت و اقبال ایک باغ تیار کیا ہے۔ انواع انواع کے درخت ثمردار اور گل بوٹے کے لگائے ہیں۔ دور دور سے بہ صرف زر کثیر نادر نادر درخت منگوائے ہیں، باغبان نادر کار نخلبندی میں ہوشیار بہم پہنچائے ہیں۔ ہزار ہا روپے صرف کر کے سیکڑوں استاد اس فن کے بلوائے ہیں، ہر ہر شخص یکتائے زمانہ ہے اپنے ہنر میں یگانہ ہے۔ بیل بوٹے ایسے لگائے ہیں کہ مانی و بہزاد اپنی صنعت سے شرمائے ہیں مگر جاں نثار کی نظروں میں سماتا نہیں خزاں کا رن باغ میں معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی کا قدم مبارک اس میں جاتا نہیں۔ ناسخ

سرسبز ہو جو سبزہ تیرا پائمال ہو
ٹھیرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

امیدوار ہوں کہ حضرت خاقان جہاں نوشیرواں زبان بطریق گل گشت کبھی اس طرف توجہ فرمائیں۔ خانہ زاد موروثی کا رتبہ فلک اعظم تک پہنچائیں۔ حضرت کے قدموں کی برکت سے باغ میں بہار آجائے ہر گل غنچہ اپنا اپنا رنگ دکھائے۔ از راہ غلام نوازی اگر دو ایک میوے نوش جان فرمائیں غلام کو ثمر مراد حاصل ہو۔ اشجار امید بار لائیں۔ بادشاہ نے اس کے التماس کو قبول فرمایا۔ معروض ہے اس کا درجہ اجابت میں لایا۔ الفش نے تسلیم بجالا کر نذر گزرانی۔ رخصت ہوا باغ میں آکر سامان دعوت کرنے لگا۔ آناً فاناً سب اسباب ضیافت کا مہیا ہوگیا۔ اقسام اقسام کے کھانے تیار ہونے لگے۔ طرح طرح کے کھانے کشتیوں میں چنے گئے۔ ارباب نشاط کو حاضری کا حکم ہوا۔ آتش بازوں نے آتش بازی کا موقع ڈھونڈھ رکھا۔ روشنی کا سامان ہونے لگا۔ ہزار ہا گلاس چڑھ گیا۔ جھاڑ فانوس دیوار گیریاں صاف ہونے لگیں۔ مومی کافوری شمعیں چڑھائی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ جم جاہ فلک رفعت خورشید طلعت دادگر انصاف پرور معہ ارکان دولت واعیان سلطنت بہار افزائے باغ بیداد ہوا الفش کا شجر مقصود بار لایا۔''

(داستان امیر حمزہ از تصدق حسین، ص 15)

اشک کے نسخے سے اوپر ہم نے جو حکایت نقل کی ہے وہ ان کی رنگین بیانی کا بہترین نمونہ ہے اور ساری کتاب میں اس سے زیادہ مصرع اور رنگین بیان کوئی نہ ملے گا مگر تصدق حسین کے نسخہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے ہم نے قصداً اسی پر اکتفا کیا اور یہ بھی طویل ہے۔ اس کے بعد تخت اور باغ کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے اور اتنا طویل ہے کہ ہم کو بہ خوف طوالت چھوڑ دینا پڑا۔ اس کی رنگینی و آرائش کے لیے یہ کہنا کافی ہے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

خلیل علی خاں کے تخلص اشک سے معلوم ہوتا ھے کہ ضرور شاعر ہوں گے۔ اس زمانے میں شاعری کا گھر گھر چرچا بھی ان کے شاعر یا ناظم ہونے کا خیال پیدا کرتا ھے۔ اول تو ان کا ذکر ھی کسی تذکرہ میں نہیں۔ پھر انتخابی اشعار ملیں تو کہاں سے۔ ان کا کوئی دیوان ھی نہیں، جس سے دو چار شعر مل سکیں۔ قصۂ امیر حمزہ میں کھیں کھیں ایک آدہ ان کا طبع زاد شعر مل جاتا ھے مگر وہ ان کی شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہوسکتا۔

واقعات اکبر

اشک کا دوسرا اور قابل قدر کارنامہ 'واقعات اکبر' ہے۔ انھوں نے 1809 میں کپتان ولیم ٹیلر کے ایما سے علامی ابوالفضل کی مشہور کتاب 'اکبرنامہ' کا اردو میں اس نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ بدقسمتی سے شائع نہیں ہوا۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے یا مسودہ موجود نہیں ہے۔ اکبرنامہ جیسی مفید اور اہم کتاب ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا یہ ترجمہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہے یا نہیں۔ اگر یہ کتاب دریافت و شائع ہوجائے تو ہماری تاریخ کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے میں اشک کی دو اور کتابیں ملی ہیں:

(1) قصہ گلزار چین (2) رسالہ کائنات

ان میں سے پہلی کتاب چین کے شہزادہ رضوان شاہ اور روح افزا پری زاد بادشاہ اجنہ کی لڑکی کے معاشقے کی داستان ہے۔ یہ فارسی کے ایک مشہور قصے کا ترجمہ ہے۔ اشک نے اس کو ہنری بولٹ کے لیے 1229ھ (1804) میں مرتب کیا ہے۔ اس قصے کو قطب شاہی شاعر فائز 1094ھ (1683) میں اور پھر مولانا باقر آگاہ نے 1211ھ (1797) میں نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ اشک کے ترجمہ کا نمونہ عبارت یہ ہے:

''بلاد چین میں ایک بادشاہ عادل و باذل، رعیت پرور، غریب نواز داد گستر ایسا تھا کہ اقلیم سبع آفتاب مہتاب کی شکل اس کے فیض سخاوت وعداوت سے روشن تھی۔ جناب باری نے اسے ہر ملک کی شہریاری دی تھی۔ روز و شب عیش وعشرت میں رہتا تھا۔ اس کے شہر میں دن عید اور شب شب برات تھی۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا۔ بادشاہ کو سدا ایک غم فرزند رہتا تھا۔ اس کے گھر میں اولاد نہ تھی۔''

رسالہ کائنات جو ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ 1217ھ مطابق 1803 میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش سے مرتب کیا گیا، جس کی مصنف نے دیباچہ کتاب میں صراحت کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس کا کوئی نمونہ نقل نہیں کیا۔

خلیل علی خاں کے تخلص اشک سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور شاعر ہوں گے۔ اس زمانے میں شاعری کا گھر گھر چرچا بھی ان کے شاعر یا ناظم ہونے کا خیال پیدا کرتا ہے۔ اول تو ان کا ذکر ہی کسی تذکرہ میں نہیں۔ پھر انتخابی اشعار ملیں تو کہاں سے۔ ان کا کوئی دیوان ہی نہیں، جس سے دو چار شعر مل سکیں۔ قصہ امیر حمزہ میں کہیں کہیں ایک آدھ ان کا طبع زاد شعر مل جاتا ہے مگر وہ ان کی شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہوسکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ بہت ہی پست درجہ کے شاعر تھے اور ہم ان کو ناظم یا قافیہ پیما کہہ سکتے ہیں۔ ان کا یہ حال معلوم ہوتا ہے کہ تفنن طبع کے طور پر بھی کچھ کہہ لینا اور کسی موقع پر قافیہ پیمائی کر دی۔

■

ماخذ: ارباب نثر اردو، **مصنف:** سید محمد، **مرتب:** رحیل صدیقی، **دوسری طباعت:** 2019، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اسرار اللہ انصاری

منفی رویوں کا نکتہ چیں

اختر آصف

صوبہ مدھیہ پردیش میں واقع اور مہاراشٹر کی سرحد پر واقع شہر برہان پور، جہاں اردو زبان و ادب کی ابتدا سے ہی تخلیقی سرگرمیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں بڑے مراکز کی طرح اسے تاریخ ادب میں مقام ومرتبہ خواہ نہ ملا ہو، لیکن اس علاقہ کے قلم کاروں کی خدمات کی چمک کبھی ماند نہیں پڑی۔عبدالرحیم خان خاناں، سعدی دکنی، ہاشم علی، متین برہان پوری، بالاجی تریمبک نائک ذرہ، سعد اللہ گلشن اور ولی دکنی وغیرہ متعدد شعرا وادبا کی اس علاقے سے وابستگی کے ذکر سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح عہدِ حاضر تک چلا آتا ہے۔

ماضی قریب میں اس سرزمین کے استاد شاعر اختر آصف کا نام اہمیت کا حامل ہے، جن کی شعری وادبی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ اصل نام اختر حسین تھا لیکن اختر آصف کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔موصوف کی ولادت یکم جنوری 1939 کو برہان پور میں ہوئی۔ آپ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی، ساتھ ہی شہر کے مشہور استاد مولوی محمد محسن سے فارسی زبان سیکھی۔ 1958 شعروسخن کا شوق پیدا ہوا تو استاد الشعرا فاضل انصاری کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ پارچہ بافی کی صنعت سے متعلق مختلف ہینڈلوم اور پاورلوم کوآپریٹو سوسائٹیوں میں کلرک کی ملازمت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں برہان پور سے ہفت روزہ 'برہان پور ٹائمز' جاری ہوا جس کے آپ معاون مدیر رہے، بعد ازاں ہفت روزہ 'الم نشرح' کے مدیر کی ذمے داری بھی بحسن وخوبی انجام دی۔ اس طرح شاعری کے ساتھ ساتھ میدانِ صحافت میں بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ اختر آصف نے تقریباً چار دہائیوں تک ملک بھر کے مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے پرسوز ودلکش ترنم سے سامعین کو محظوظ کیا۔ استاد فاضل انصاری کی جانب سے فارغ الاصلاح قرار دیے جانے کے بعد متعدد نو واردانِ سخن کی اصلاح کا ذمہ لیا۔ موصوف کی عمر بھر کی شعری کاوشات سے منتخب کردہ کلام کو 2005 میں شعری مجموعہ 'آزاد پرندے' کی شکل میں شائع کیا گیا۔ 16 اکتوبر 2008 میں اختر آصف اس جہاں سے رخصت ہوئے۔

اختر آصف کا نام دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے، مشاعروں کے توسط سے انھیں ملک گیر شہرت ومقبولیت ملتی رہی ہے۔ شاعری کے لحاظ سے دیکھیں تو زبان وبیان کے ستھرے مذاق نیز پرسوز اور دل نواز ترنم کے باعث موصوف نے سامعین میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ شعروزبان کے رمز سے آشنائی اور شاگردوں کے وسیع حلقے کی تربیت کے سبب برہان پور و اطراف کے استاد شعرا میں آپ کا شمار ہوا۔ تا دمِ آخر شعری محفلوں سے وابستگی اور مشغلۂ فکرِ سخن سے وابستہ رہتے ہوئے شعری سلسلے کو آگے بڑھانے میں بھی آپ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اشاعتِ کلام کے طور پر آپ کے ہاں ایک عدد مجموعہ 'آزاد پرندے' ہے، جسے اختر آصف صاحب کے محتاط انتخاب کے مدِ نظر کل کائنات یا نمائندہ کلام کہا جاسکتا ہے، اسے موصوف نے اپنی حیات میں شائع کروایا تھا۔

اختر آصف کا مجموعۂ کلام چند ایک نظموں اور تقدیسی کلام بطور خاص غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں موصوف نے الگ الگ مضامین وموضوعات کے سہارے شاعری بنانے کی سعی کی ہے۔ جذبات واحساسات، حالات وواقعات، تجربات ومشاہدات اور عہدِ حاضر میں رونما ہونے والے مناظر وغیرہ سبھی کو موصوف نے اپنی شاعری کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

دیکھا جاتا ہے شعرائے کرام حسن وعشق کے مضامین کے ساتھ بطور خاص اپنے افکار کو قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ اختر آصف کے یہاں بھی حسن وعشق کی حکایات ہیں، مگر یہ حکایات آٹے میں نمک کی طرح ہیں۔ البتہ عصری حسیت اخلاقیات جیسے موضوعات پر مشتمل اشعار سوا ہیں۔ معاملاتِ انسانی پر آپ کے ہاں کثرت سے منظوم انداز میں رائے زنی ملتی ہے۔ اسی ضمن میں معاشرے میں موجود افراد کے منفی رویے سے متعلق موصوف نے اپنی شاعری میں متعدد مقامات پر اپنا اعتراض درج کیا ہے، فی الحال یہی ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔

انسان مختلف طور سے معاشرے میں اپنے وجود کا احساس کراتا ہے۔ سیاست داں، رہنمائے قوم، فردِ خانہ، ہم نشیں، ہم سایہ اور ایک دوست وبہی خواہ وغیرہ کے روپ میں انسان اپنا کام کرتا چلا جاتا ہے۔ اختر آصف کے ذخیرۂ اشعار میں ان رشتوں اور کرداروں کے ذریعے سلوکِ انسانی کے نباہ کا خوبصورت انداز میں ذکر ہے۔ تعلقات کی بنیاد پر ہر شخص دوسرے شخص کی جانب پر امید نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنے گہرے تجربے کے باعث اسے بعض اوقات اپنا سب کچھ چھن جانے کا خدشہ بھی لگا رہتا ہے۔ ایسے موضوعات سے اختر آصف کو گہری انسیت رہی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

میں نے کیا ہے جس پہ بھروسہ دغا نہ دے
وہ میرے اعتماد کی مسجد گرا نہ دے
سب کچھ تو اس نے لوٹ لیا اک مکان ہے
اس پر بھی اپنے نام کی تختی لگا نہ دے

اختر آصف کے کلام میں متعدد اشعار ایسے بھی ہیں جن میں معاشرے میں موجود افراد کے نازیبا برتاؤ اور ناروا سلوک پر اعتراض اور ردعمل نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے، اس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کا ردعمل دکھائی دیتا ہے۔ رشتوں کا اعتبار اور تقدس دوطرفہ برتاؤ پر منحصر

ہوتا ہے، مثبت عمل کے منفی ردِعمل سے یہ پامال ہو جاتا ہے، ایسی صورتِ حال میں منفی طرزِ عمل کو برداشت کرنے والا شخص اپنی شکایت لازمی طور پر درج کرواتا ہے جو ہمیں اختر آصف کے یہاں ذرا واضح اور تیکھے انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں احباب کی طبیعت میں وفاداری اور بیوفائی دونوں طرح کا برتاؤ اور رویہ پایا جاتا ہے، اختر آصف کی شاعری میں اس قسم کے جو مضامین نظم ہوئے ہیں ان میں انسان کا ایک طرفہ رویہ اور ایک ہی روپ بکثرت دیکھنے کو ملتا ہے، یعنی، سفاکی، دغا وفریب جیسے چلن کے بیان کا مجموعہ غزلیات میں نمایاں ہے۔ چند اشعار دیکھیں۔

کیوں جلاتے ہو مکاں میرا مرے بھائی بھی ہیں
یہ مکاں تو یوں ہی بے دیوار و در ہو جائے گا

ایسے تو نہیں لوگ کہ گرتے کو سنبھالیں
ایسے ہیں کہ گرتے کو سنبھلنے نہیں دیتے

یہ انسانی وجود اور شخصیت کا ایک منفی پہلو ہے، انسانوں کو پرکھنے اور ان پر رائے زنی کرنے کا اگرچہ یہ اک طرفہ طرز معلوم ہوتا ہے، لیکن ایسے اشعار کی قرأت سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عہدِ حاضر کا انسان بکثرت ایسی خصلتیں اپنے اندر لیے پھرتا ہے جن میں خیر کا پہلو کم اور شر کا پہلو زیادہ ہے۔ شاعر کے اپنے تقاضے کے مطابق لوگوں کا رویہ حسبِ توقع نہیں ہوتا، گویا یہ اس دور کا المیہ ہے۔ حالانکہ انسان خدا کا شاہکار ہے لیکن یہ اپنے کردار و اخلاق سے نیک و بد دونوں طرح کی خصلتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس معنی میں اختر آصف کا تجربہ تلخ رہا ہے، یار دوستوں سے انھیں آسودگی و مسرت غالباً کم کم ہی میسر آئی ہے، جس کا منظوم اظہار شاعر موصوف کے یہاں الگ الگ غزلوں میں الگ الگ انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں۔

کاغذ کے پھول جیسے ہو گل دان میں سجے
ایسا ہی کچھ خلوص کا جذبہ دلوں میں ہے

بے وفاؤں سے رکھی ہم نے وفا کی امید
جیسے پتھر پہ کوئی پھول اگانا چاہے

احباب جو زندگی کے سفر میں شجرِ سایہ دار کی مانند ہوتے ہیں، ان سے گہرے رشتے کے باعث آدمی بعض اوقات ضرورت سے زیادہ تعاون اور نیک نیتی یا احسان کے بدلے احسان کی توقع رکھتا ہے، بعض اقربا اس پر پورے

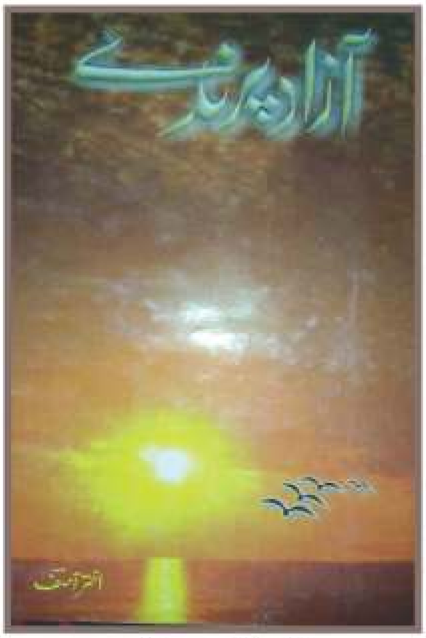

اترتے ہیں اور بعض توقع کے مطابق نہیں ہوتے۔ امید کے برخلاف برتاؤ سے انسان تڑپ اٹھتا ہے، اختر آصف نے ان کیفیتوں کو بھی بڑی خوبی سے اپنے اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔

ساتھی ہیں اجالوں کے ظلمت میں پرائے ہیں
احباب نہیں شاید احباب کے سائے ہیں

احباب کا حلقہ ہے کہ جنگل میں گھرا ہوں
ہے ناگ یہاں کوئی، کوئی ناگ پھنی ہے

غم خوار بن کے آئے دل آزار سے لگے
سارے عزیز اپنے اذکار سے لگے

ایسا بھی اک شفیق مرے دوستوں میں ہے
جس کے کرم کا عکس مرے آنسوؤں میں ہے

تو نے دغا جو دی تو تعجب کی بات کیا
تیرا شمار بھی تو مرے دوستوں میں ہے

جب بدلے میں انسان کو مسلسل غیر تسلی بخش جوابات نیز توقع سے پرے اور ناز یبا برتاؤ ملتے ہیں تو، ایسی صورت میں ایک نازک مزاج اور سنجیدہ شخص کے دل پر ایسے گہرے زخم لگتے ہیں جن کی کسک وہ زندگی بھر محسوس کرتا ہے اور بالآخر کسی نتیجے پر پہنچتا ہے تو اس کی زبان سے جملے ادا ہونے لگتے ہیں'' یہ دنیا گویا انسانیت اور انسانوں سے خالی ہو چکی ہے۔ یہاں بھلائی کی امید عبث یا ایک سراب کی سی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ اشعار دیکھیں۔

آدمی برتر فرشتوں سے مگر
آدمی کہلائے ایسا کون ہے

مجھ سے انساں کا پتہ پوچھنے والے لوگو
میری مانو تو مزاروں کا پتہ لے جاؤ

انسان راہِ وفا میں چلتے چلتے کس قدر چوٹ کھاتا ہے، کتنے زخم سہتا ہے، سب کچھ سہہ کر بھی وہ ضبط و برداشت کا ملبوس سینۂ جسم سے لگائے رکھتا ہے لیکن اپنے اصول، ایثار، ثابت قدمی اور نیک نیتی پر قائم رہنے کی اپنی ضد کی خاطر اپنے حسنِ سلوک سے متنفر نہیں ہوتا، زمانہ کیا سوچتا ہے اس بات کی بھی پروا نہیں کرتا، حتیٰ کہ وہ اس راہِ حق میں اپنے وجود کو لہولہان کرتا رہتا ہے، اور یہی عظمتِ انسانی کی دلیل ہے۔

وفا کی راہ کے سب پھول ان قدموں سے لپٹے ہیں
زمانہ یہ سمجھتا ہے مرے پیروں میں چھالے ہیں

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اچھا تخلیق کار ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے، وہ درد و غم، محرومیوں اور تلخیوں کو اس وجہ سے بھی موضوعِ گفتگو بناتا ہے کہ انسانوں کے درمیان تحمل و برداشت کے رویے کے ذریعے رواداری اور ایک دوسرے کو قبول کرنے والے ماحول کی آبیاری ہو سکے۔ انسان کے مزاج و معیار اور اخلاق کو بلندیِ فکر کی طرف مبذول کیا جائے، فکرِ انسانی کو ذہنی، جذباتی اور قلبی، ہر قسم کی کشادگی کی جانب موڑا جائے۔ شخصیت سازی کا امر بھی فن کار کی ترجیحات میں شامل ہوتا ہے، کیونکہ شاعر بھی سماج کی اکائی ہے۔ اختر آصف کی شاعری کے مطالعے سے یہ احساس مزید گہرا ہو جاتا ہے کہ وجودِ انسانی کے ان منفی و تخریبی پہلوؤں سے انسانوں کے دل کس قدر مجروح اور داغ دار ہو جاتے ہیں۔

آیا یہ کہ اختر آصف نے اپنے اشعار میں افراد کے جن منفی رویوں کا الگ الگ انداز سے اظہار کیا ہے وہ بظاہر ہمیں گلے، شکوے جیسے محسوس ہوتے ہیں، لیکن یہ عمل ایسے ہیں کہ اس کے ذریعے انسانی عادات و اطوار اور اقدار کی اصلاح اور تعلقاتِ انسانی میں اخلاص و خیر خواہی کی فضا ہموار کرنے کی طرف ایک طرح کی پیش قدمی بھی ہے، ساتھ ہی ساتھ منفی برتاؤ سے ناپسندیدگی کا اظہار کر کے اس رویے سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش بھی ہے۔ الغرض آدمی، آدمی کی راہ کا پھول بنے نہ کہ خار۔ اس نظر سے دیکھیں تو اختر آصف کا یہ اقدام یقیناً لائقِ ستائش محسوس ہوگا۔

■

Dr. Asrar Ullah Ansari
Head, Dept. Of Urdu
Swami Vivekanand Govt. PG College
Neemuch 458441 (MP)
9753210869
asrar1607@gmail.com

مطالعہ واہی کی چند جہتیں

حذیفہ شکیل

اردو شعر و ادب میں طنز و مزاح کی روایت قدیم بھی ہے اور معیاری بھی۔ اس روایت کی پاسداری کرنے والوں میں اکبر الہ آبادی، ظریف لکھنوی، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، مجید لاہوری وغیرہ کے ساتھ ایک اہم ترین نام رضا نقوی واہی (2002-1914) کا ہے۔ طنز اور مزاح کے الفاظ عموماً ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں لیکن ان دونوں کے مفہوم و مقصود اور اظہار و اسلوب میں گہرا فرق ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی ادب پارے میں طنز ہو مزاح نہ ہو یا اس کے برعکس، اور دونوں صفات کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے۔ بہت سے ادیب و شاعر ایسے ہیں جنھیں یا تو صرف مزاح نگار ہی کہا جا سکتا ہے یا طنز نگار۔ ایسا کم ہی ہوگا کہ ایک ہی شخصیت ان دونوں کی جامع ہو اور انھی معدودے چند شخصیتوں میں رضا نقوی واہی بھی ہیں۔

شاعری خواہ رومانی ہو یا منظری، قومی ہو یا فکری، سنجیدہ یا ظریفانہ، ان سب کے لیے ضروری اور اہم چیز یہ ہے کہ وہ بہر حال شاعری ہو۔ اشعار کا تعلق شاعری کی کسی قسم یا صنف سے ہو، وہ کامیاب اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ فن کے بنیادی تقاضوں کو پورا نہ کر سکے، ساتھ ہی اس میں شاعرانہ لطافتوں اور نفاستوں کا اظہار بھی ہونا چاہیے تاکہ اس سے لطف اندوزی بھی کی جا سکے اور اس کی سحر انگیزی بھی برقرار رہے۔ گویا ان مسلمات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ظریفانہ شاعری میں اگر ظرافت کی بہتات ہو لیکن شعریت ہی مفقود ہو تو اسے ظرافت کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے مگر کم از کم معیاری شاعری تسلیم کر لینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ مختصر یہ کہ شاعری کی دیگر قسموں کی طرح اچھی ظریفانہ شاعری کے لیے ظرافت اور شعریت دونوں کا حسین امتزاج بے حد ضروری ہے۔ جناب واہی کی شاعری کے امتیازات پر خامہ فرسائی سے قبل معیاری ظریفانہ شاعری سے متعلق ان کا نظریہ پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''اعلی اور معیاری ظریفانہ شاعری کے لیے صرف طنز و مزاح کی حسین آمیزش ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اس میں فکری عنصر کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک شاعر اسی وقت معیاری اور ظریفانہ شاعری کا خالق ہو سکتا ہے جب طنز و مزاح کی آمیزش فکری بنیادوں پر کی جائے۔ معاشرے کی برائی، بدعنوانی اور کمزوریوں کے خلاف ردعمل کا نام ظریفانہ شاعری نہیں کیونکہ اس طرح کا رد عمل انتہا پسندانہ ہوتا ہے اور ایک انتہا پسندی دوسری انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں ردعمل کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جو اصلاح حال کے بدلے حالات کو پیچیدہ اور غیر صحت مند بنا دیتا ہے، لیکن اگر فکر کی بنیادوں پر طنز و مزاح کی آمیزش ہوتی ہے تو ظریفانہ شاعری میں ہمدردی کے عناصر شامل ہوتے ہیں اور شاعر معاشرے کی کمزوریوں کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس انداز میں اس کو پیش کرتا ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ظریفانہ شاعری میں پایا جانے والا ہمدردی کا یہی جذبہ اس صنف ادب کی افادیت اور مقصدیت کا ضامن ہوتا ہے۔''[1]

طنز و مزاح کا تعلق معاشرتی مسائل سے ہے، اس کے لیے بالغ نظری اور گہرے شعور و ادراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان اس وقت تک طنز و مزاح کی روح کو سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ اس کا شعور بالغ نہ ہو۔ طنز یا مزاح محض بے معنی ہنسی کا نام نہیں، یہ گہرے عرفان ذات یا معاشرے کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔

رضا نقوی واہی نے شعر گوئی کا بیس سالہ سفر طے کرنے اور فن کی بھٹی میں تپ کر کندن ہونے کے بعد شعوری طور پر میدان ظرافت میں قدم رکھا اور اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں ظریفانہ شاعری بے حد معتدل و متوازن ہے۔ نہ طنز اس قدر ہے کہ تنقید برائے تنقیص کا شائبہ ہونے لگے اور نہ ہی مزاح کا اتنا غلبہ کہ قاری محض ہنسی اور ٹھٹھے پر ہی اکتفا کرنے کو کافی سمجھے، بلکہ انھوں نے طنز و مزاح کی مناسب آمیزش کے ذریعے بیچ کی ایک ایسی راہ نکالی ہے کہ کسی کی دل آزاری کے بغیر پیغام کی ترسیل خوشگوار انداز میں ہو جاتی ہے، پڑھتے وقت لطف اندوزی بھی بحال رہتی ہے اور پڑھ کر عمل کا داعیہ بھی کسی نہ کسی درجے میں پیدا ضرور ہوتا ہے۔ میدان ظرافت کے انتخاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہم نے معاشرے اور سماج میں قدم قدم پر پھیلی ہوئی بدعنوانیوں پر اور اسی طرح کی ناہمواریوں پر نظر رکھنے کے بعد دیکھا تو یہ محسوس ہوا کہ اگر ہم ان ناہمواریوں کو سنجیدہ شاعری کے پیکر میں ڈھالیں تو یہ اتنے متاثر کن نہ ہوں گے جتنا طنزیہ انداز میں کہنے کا اثر ہوگا۔ ہنستے ہنساتے کچھ کام کی باتیں ہو جاتی ہیں۔''[2]

واہی کے کلام میں موضوعات کا تنوع اور فراوانی

کلامِ واہی میں ظرافت، شائستگی کے ساتھ موجود ہے۔ ان میں سطحیت، ابتذال اور سوقیانہ الفاظ و انداز سے مکمل اجتناب دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ چوں کہ دل دردمند اور طبع حساس کے مالک ہیں، اس لیے وہ اپنی بصیرت و آگہی اور روشن دماغی کے ذریعے سماجی بے راہ رویوں کو طشت ازبام تو کرتے ہیں لیکن وہ اپنے دل میں خود بھی بے قراری محسوس کرتے ہیں۔

ہمیں اس امر کا احساس دلاتا ہے کہ اگر فنکار کی نگاہ دور رس، قوت مشاہدہ وسیع، تخیل بلند و بالا اور ساتھ ہی اخذ نتائج کا ملکہ بھی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی خاص پیرائے میں لکھنے کے باوجود بھی موضوعات کی کمی جیسے مسائل درپیش ہوں۔ احمد جمال پاشا رقم طراز ہیں:

''واہی کے یہاں موضوعات کی ایک وسیع کائنات ملتی ہے جس میں وہ زندگی کے سیاسی، سماجی، انسانی، معاشی، قومی، اجتماعی اور ادبی مسائل کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں... ان کی زبان مہذب اور شستہ ہے، ان کا لہجہ باوجود شوخی اور شرارت کے شریفانہ اور قابل داد ہے، ان کے انداز بیان میں سادگی اور پرکاری ہے۔ ان کا ہمدردانہ انداز نظر، صحت مند والہانہ پن، خوش طبعی، ظرافت، شگفتگی، توازن، رکھ رکھاؤ، طنز اور تیکھا پن ان کی طنزیہ نظموں کو عام طنزیہ شعری ادب کی سطح سے بلند کر دیتی ہے۔''[3]

ان کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے جنھیں وہ بلا تکلف اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں۔ کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ محض تعداد میں اضافے کے لیے اشعار کہے گئے ہوں، یعنی ہر شعر معنویت سے بھرپور ہوا کرتا ہے۔ مخمور سعیدی نے کلامِ واہی پر اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کا کلام پڑھتے ہوئے کسی ایک مقام پر بھی یہ گمان نہیں گزرتا کہ شاعر نے آورد سے کام لیا ہے، الفاظ کا ایک رواں دواں میل ہے جس میں قاری خود بھی بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ گردوپیش میں پھیلی ہوئی زندگی کے تضادات اور اس کے قابل گرفت پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے اور ان میں کم ہی پہلو ایسے ہوں گے جو ان کے طنز نگار قلم کا ہدف نہ بنے ہوں۔ مذہب، سیاست، اخلاق، ادب سبھی شعبوں تک ان کی نظر رسا ہوئی ہے اور اس ریا کاری اور بددیانتی کا پردہ چاک کر گئی ہے جس کے دم بدم بڑھتے ہوئے نفوذ نے زندگی کے ہر مثبت قدر کو غیر معتبر بنا دیا ہے۔''[4]

واہی کو واقعہ نگاری، منظر کشی اور قصہ طرازی میں درک و کمال حاصل ہے۔ ان کی نظمیں اوصاف مذکورہ سے پُر نظر آتی ہیں۔ ان کی شاہکار نظم جس کا عنوان 'انتقال کے بعد' ہے، ان تمام جزئیات کے بیان کا بہترین مظہر ہے۔ مکمل نظم سے گریز کرتے ہوئے صرف اخیر کے دو اشعار جنھیں بطور نتیجہ انھوں نے لکھا ہے، پیش کرتا ہوں۔

کر دیا اس موت نے ثابت یہ ہم پر کم سے کم
زندگی سے موت بہتر ہے، پئے اہل قلم
اہل فن کو موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہیے
بلکہ ممکن ہو تو کوشش کر کے مرنا چاہیے

کلامِ واہی میں ظرافت، شائستگی کے ساتھ موجود ہے۔ ان میں سطحیت، ابتذال اور سوقیانہ الفاظ و انداز سے مکمل اجتناب دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ چوں کہ دل دردمند اور طبع حساس کے مالک ہیں، اس لیے وہ اپنی بصیرت و آگہی اور روشن دماغی کے ذریعے سماجی بے راہ رویوں کو طشت ازبام تو کرتے ہیں لیکن وہ اپنے دل میں خود بھی بے قراری محسوس کرتے ہیں۔ اس کیفیت کی ترجمانی کے لیے ان کا یہ شعر دیکھیں۔

خود آگہی نے کیا ہے دماغ کو روشن
کسی کو درد ہو دل بے قرار اپنا ہے

واہی کے تیسرے مجموعہ کلام 'نشتر و مرہم' پر ڈاکٹر اختر اورینوی نے ایک مبسوط اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے اور واہی کی شخصیت و شاعری کا بہترین محاکمہ پیش کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''واہی کی شخصیت اور شاعری میں ہمیں یہ خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کی ظریفانہ شاعری کہیں پر رکیک اور سوقیانہ نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں نہ بھونڈہ پن ہے اور نہ کھردراپن۔ واہی کی شاعری میں کسی پہلو سے ناتراشیدگی نہیں ملتی۔ ان کی نظمیں شائستہ اور مہذب ظرافت کا نمونہ ہیں، ان میں نشتریت ضرور پائی جاتی ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ زخم پر مرہم بھی ضرور لگاتی ہے۔ مختصر یہ کہ واہی کی شاعری قدر اعلیٰ کی چیز ہے۔''[5]

ان کا ایک قابل ذکر امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے منظوم خطوط نگاری کی کمزور اور معدوم ہوتی روایت کو تواتر و تسلسل کے ساتھ لکھتے ہوئے بار دگر زندہ و پائندہ کر دیا۔ واہی کے مکتوب الیہم زیادہ تر علم و ادب سے تعلق رکھنے والی باکمال شخصیتیں ہیں، مثلاً انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی، مظفر حنفی، پروفیسر عبدالمغنی، مظہر امام، دلاور فگار، مجتبیٰ حسین، جگن ناتھ آزاد، وفا ملک پوری، وغیرہم کے نام منظوم خطوط لکھے ہیں۔ ان کے

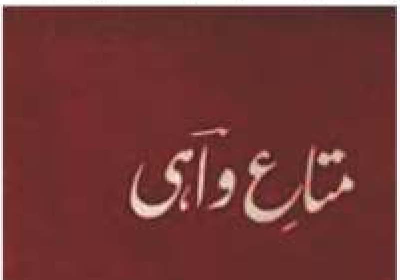

خط کا اسلوب انتہائی سادہ اور تکلف سے خالی ہوا کرتا ہے۔ حال احوال، شکوہ و شکایت، ادب و سیاست، روزمرہ کے واقعات، عالمی صورتحال، سماجی ناہمواریاں، غرضیکہ تمام موضوعات کو معقول انداز میں وہ اپنے خطوط میں برتنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر عبدالمغنی کے نام لکھے گئے ایک خط کے چند اشعار کے ذریعے ان کی منظوم خطوط نگاری کے

رنگ وآہنگ کا اندازہ لگائیں۔

اے حضرت مغنی یہ جزا ہے کہ سزا ہے
کیوں تحفہ مرغ سے محروم رضا ہے
دفتر کی یہ غفلت ہے، کہ ہے ڈاک کی لعنت
یا آپ نے خود ہی نظر انداز کیا ہے
یہ اس لیے کہتا ہوں کہ مدت سے مرا خط
محروم جواب آپ کے بستر پہ پڑا ہے

کلام واہی کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں محض زور تخیل کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کی نقاب کشائی اور سماجی مسائل کی عکاسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ روزمرہ کے واقعات و حالات کو اس انداز میں اپنی شاعری کے ذریعے پیش کرتے ہیں کہ باذوق قاری اور حساس طبع انسان بیک وقت دو کیفیتوں سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ان کا ذوق شعر وادب انھیں مسکرانے، ہنسنے اور بسا اوقات قہقہہ لگانے پر آمادہ کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی حساس طبیعت انھیں رونے، بلکنے اور سر پیٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'نشتر ومرہم' اور 'طنز وتبسم' محض ان کے مجموعوں کا نام نہیں بلکہ فکر وخیال اور طرز وانداز کا حقیقی مظہر ہے، جنھیں بامعنی طور پر قلم کو قابو میں رکھ کر اپنے کلام میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے ادبی اور سماجی زندگی کی شعبدہ بازیوں کو جولان گاہ بنایا ہے۔ کہتے ہیں۔

میرے کلام کی تلخی میں شہد کی ہے مٹھاس
گرفت میں قلم خوش عیار اپنا ہے

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست اور مسلم ہے کہ واہی صاحب نے اپنے تقریباً ستر سالہ شعری سفر کے طویل دورانیے میں نصف صدی سے زائد عرصے کا سفر میدان ظرافت کے ماہر شہسوار کی حیثیت سے طے کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ذریعے اپنے ہم عصروں کو متوجہ کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ واہی صاحب نے فنی چابکدستی، عمق فکر اور اسلوب بیان کی یگانگت سے باذوق قارئین اور ناقدین ادب کو اپنا گرویدہ واسیر بنا لیا ہے۔ اس کا احساس خود واہی صاحب کو بھی تھا، کہتے ہیں۔

خود اپنے ذوق نظر پر مدار اپنا ہے
حریف فن نہ کوئی ساجھے دار اپنا ہے

مجموعی طور پر رضا نقوی واہی کی شاعری، سنجیدگی اور ظرافت کے حسین امتزاج کی عکاس ہے۔ ان کی سنجیدہ شاعری میں فکری گہرائی، کلاسیکی روایات کی پاسداری اور عصری مسائل کی سچی تصویر کشی نظر آتی ہے، جبکہ ان کی ظریفانہ شاعری میں شگفتگی، نکتہ آفرینی اور مزاحیہ پیرایے میں پیش کیے گئے عمیق خیالات کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔

تمام عمر ظرافت کی آبیاری کی
اسی سے باغ ادب مشکبار اپنا ہے

یہ تو تھا فن واہی کا نمایاں ترین پہلو لیکن 'حکایتیں ہیں اور بھی ورق الٹ کتاب کا'۔ ایک اہم گوشۂ واہی جس کی طرف توجہ ناگزیر ہے وہ رضا نقوی واہی کی کم وبیش دو دہائی پر مشتمل ابتدائی زمانے کی روایتی اور سنجیدہ قسم کی شاعری کا گوشہ ہے۔ مطالعہ واہی کے دوران شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ کسی بھی فنکار کی فنکارانہ عظمتوں کا مکمل اعتراف اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کے فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عربی کے مشہور قاعدے 'للا کثر حکم الکل' یعنی اکثر پر حکم کلی نافذ کر دیا جاتا ہے، کے تحت واہی صاحب کو شاعر ظریف تو تسلیم کر لیا گیا لیکن حیران کن اور قابل افسوس امر یہ ہے کہ ان کی شاعری کے دوسرے رخ اور ان کے تقریباً بیس سالہ شعری سفر کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا، جبکہ اس زمانے کی شاعری کا مطالعہ ہمیں ایک الگ انداز کے واہی سے متعارف کراتا ہے اور فن کی پختگی کے اعتراف پر مجبور بھی کرتا ہے، یہ گوشہ نئی نسل کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ ابتدائی زمانے کے شعری سرمائے میں نعت، منقبت، سلام، غزلیں، نظمیں، قطعات، سہرا وغیرہ شامل ہیں۔

مجموعی طور پر رضا نقوی واہی کی شاعری، سنجیدگی اور ظرافت کے حسین امتزاج کی عکاس ہے۔ ان کی سنجیدہ شاعری میں فکری گہرائی، کلاسیکی روایات کی پاسداری اور عصری مسائل کی سچی تصویر کشی نظر آتی ہے، جبکہ ان کی ظریفانہ شاعری میں شگفتگی، نکتہ آفرینی اور مزاحیہ پیرایے میں پیش کیے گئے عمیق خیالات کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ ان کی ظرافت محض سطحی مزاح تک محدود نہیں بلکہ اس میں تہذیبی شعور، معاشرتی ناہمواریوں پر طنز اور انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی موجود ہے۔ وہ اپنے منفرد انداز بیان، چابک دستی اور برجستہ لب ولہجے کے ذریعے قاری کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں، لیکن اس مسکراہٹ کے پس پردہ ایک فکری پیغام بھی ہوتا ہے۔ رضا نقوی واہی کی شاعری اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ان کا تخلیقی سفر، زبان وبیان کی لطافت، عروضی مہارت، اور سماجی رویوں پر ان کی گہری نظر انھیں اردو کے ممتاز شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ نہ صرف لطف فراہم کرتا ہے بلکہ قاری کو سوچنے اور غور وفکر کی نئی راہوں پر بھی گامزن کرتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کی اصل طاقت اور ان کے فن کی انفرادیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن واہی کی عظمت کے معترفین میں کنہیا لال کپور، ڈاکٹر عبدالمغنی، احمد جمال پاشا، اختر اورینوی، مخمور سعیدی اور وامق جونپوری جیسی نابغۂ روزگار شخصیتیں ہیں۔ واہی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف یہ کہ دنیائے شعر وادب کو اپنی موجودگی کا شدید احساس دلایا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہنا چاہیے کہ اس کی عظمتوں کو چار چاند لگا دیا۔

حواشی

1. رضا نقوی واہی آئینہ در آئینہ، مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، 2003، کتابی دنیا، دہلی، ص:133
(۲) ادب نکھار: واہی نمبر۔ مئوناتھ بھنجن، 1983، ص:20
(۳) ز۔ طنز وتبسم، پیش لفظ: احمد جمال پاشا، 1963: مکتبہ ادب، پٹنہ
(۴) حرف چند: مخمور سعیدی۔ نام بنام۔ مرتب: پریم گوپال متل، پی کے پبلیکیشنز، دہلی، 1974، ص:5
(۵) مقدمہ: اختر اورینوی۔ نشتر ومرہم۔ 1968، ص24

■

Hozaifa Shakil
Research Scholar, Dept. of Urdu,
Patliputra University, Patna
At : Ara House, Haroon Nagar Sector 2,
Phulwari Sharif, Patna - 801505
Mob : 8171222390
Email : huzaifashakil1996@gmail.com

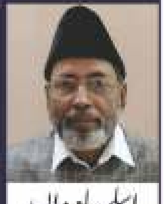

اسلم جاوداں

عابد رضا بیدار

ایک مثالی شخصیت

مشہور دانشور شخصیت ڈاکٹر عابد رضا بیدار اگر چہ عظیم آباد کے نہیں تھے، مگر وہ اتنے طویل عرصے تک اپنی شخصیت کی پوری ہمہ ہمی کے ساتھ یہاں رہے کہ عظیم آباد سے ان کا رشتہ جزولا ینفک ہوگیا۔ آپ کسی سے بھی کہیے 'عابد رضا بیدار'، پھر آپ کو یہ بتانے کی نوبت نہیں آئے گی کہ کون عابد رضا بیدار بلکہ مخاطب خود بخود سمجھ جائے گا کہ یہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی بات کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو یہاں سے سبکدوش ہوئے 30 برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، مگر ع

ذہن میں آج بھی ہیں زہرہ جمالوں کی طرح

ڈاکٹر عابد رضا بیدار اپنے قد و قامت، اپنے حلیے اور اپنے جثے سے بھی منفرد نظر آتے تھے، ان کی زلفیں، ان کا چوڑا خط، ان کی گھنی مونچھیں، ان کی آنکھیں، ان کا چہرہ، ریشمی ڈوری سے بندھا سینے پر جھولتا ہوا چشمہ، خاص انداز کا شرٹ اور پینٹ اور اس پر طرہ یہ کہ سر پر ایک خاص انداز کا کیپ۔ یہ ساری چیزیں انھیں ایک غیر معمولی شخصیت اور بڑے دانشور کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کرتیں۔ ان سے پہلی بار ملنے والا کوئی بھی شخص ان کی ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر ہی ایک قابل رشک تصور قائم کر لیتا تھا۔ گویا عابد رضا بیدار اپنی خارجی شخصیت کے اعتبار سے بھی متاثر کن رہے۔

عابد رضا بیدار کی پیدائش آج سے 91 برس قبل 12 راگست 1933 میں ہوئی تھی۔ تعلیمی اعتبار سے اسلامک اسٹڈیز اور اردو میں ماسٹر ڈگری لینے کے بعد B.Lib. Sc. کیا پھر قانون کی بھی ڈگری لی (بشمول مسلم لا)۔ رضا لائبریری رام پور میں 1959 سے لے کر 1964 تک اپنی خدمات دیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں 1972 سے لے کر اپریل 1996 تک ایک تاریخ ساز ڈائرکٹر کی حیثیت سے مشہور اور معروف رہے۔

عابد رضا بیدار کی علمیت اور لیاقت میں مثالی تھے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور بقدر ضرورت فرانسیسی زبان سے واقف تھے۔ انگلش، عربی فارسی اور اردو میں 40 سے زائد کتابیں تصنیف کیں نیز تقریباً 200 کتابیں ان کی مرتب کردہ ہیں۔ انھوں نے کیمبرج، آکسفورڈ، مانچسٹر، لندن، پیرس، قاہرہ، کراچی، ماسکو اور تہران یونیورسٹی کے دورے کے ساتھ ان کی لائبریریوں کو بھی دیکھا۔

ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیت تھی۔ اتنا اچھا اور کامیاب ایڈمنسٹریٹر میں نے زندگی میں سوائے امتیاز احمد کریمی (سابق ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار) کے نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنی بہترین انتظامی و انصرامی صلاحیت سے خدا بخش لائبریری کو جو رنگ و آہنگ عطا کیا، اس کو جس بلندی کمال تک پہنچایا، اسے بلا خوف تردید تاریخی اور مثالی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے عہد میں لائبریری میں جو نظم وضبط اور انتظام و انصرام کی کیفیت تھی اور اس دور میں لائبریری کے اسٹاف کی جو چستی، مستعدی اور حاضر باشی دیکھی گئی، وہ نہ اس سے پہلے تھی اور نہ اس کے بعد کبھی دیکھی گئی۔ کئی بار ایسا بھی دیکھا گیا کہ بیدار صاحب خود کھڑے ہو کر کسی قاری کی مدد کر رہے ہیں۔ اس کی ضرورت کو سمجھ رہے ہیں، تحقیق کے معاملے میں رہنمائی فرما رہے ہیں یا اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے خدا بخش لائبریری کو ایک نہایت معیاری اور مثالی لائبریری کے مقام تک پہنچا دیا تھا۔ وہ دور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کا عہد زریں تھا۔ میرے اس خیال کی تصدیق بی بی سی لندن کے مشہور عالم اناؤنسر رضا علی عابدی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ:

"عابد رضا بیدار نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کو عالمی معیار کا بنا دیا ہے۔" یہ بات انھوں نے معروف صحافی ڈاکٹر نسیم اختر کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہی تھی اور یہ انٹرویو بہار کے مشہور اردو روزنامے 'سنگم' میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں نسیم اختر نے اس انٹرویو کو اپنی کتاب 'باتیں' میں شائع کیا۔ اس کتاب کے صفحہ 61 اور 62 پر خدا بخش لائبریری سے متعلق رضا علی عابدی کے خیالات درج ہیں۔ قابل ذکر یہ بھی ہے کہ ان کی خوش انتظامی کا اعتراف ان کا بڑے سے بڑا مخالف اس دور میں بھی بڑی خندہ جبینی سے کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے۔

عابد رضا بیدار کی شخصیت کا دوسرا روشن پہلو ان کی علم دوستی اور ادب پروری ہے۔ وہ دانشوروں اور صاحب علم حضرات کے بڑے قدردان تھے۔ پروفیسر حسن عسکری، علامہ واقف عظیم آبادی، تقی رحیم، عطا اللہ پالوی، احمد یوسف، شاہ اسماعیل روح، کامریڈ حبیب

الرحمٰن وغیرہ جیسی شخصیتوں کی انھوں نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ معاونت اور خدمت کی۔ ان کی بے پایاں علمیت، ذکاوت اور صلاحیت کے پیش نظر ان کی ناز برداری بھی کی۔ ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نکالی۔ یہ سب کے سب علم و آگہی کے درجہ کمال کو پہنچے ہوئے باکمال اصحاب تھے۔ ان میں سے کچھ مالی اعتبار سے کمزور اور لائق نگہداشت بھی تھے۔ بیدار صاحب نے ان سب کی علمیت اور صلاحیت کا پورا پورا فیض لائبریری کو پہنچایا اور ان کو بھی۔ اس طرح ان کا یہ فیض دو جہتی تھا۔ اس کو ان کی بہترین حکمت عملی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

محمد حسن عسکری سے انھوں نے نہ جانے کتنے فارسی مخطوطوں کے راز ہائے سربستہ کھلوائے۔ تقی رحیم سے 'ہندوستان کی آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ' جیسی گراں قدر ضخیم تاریخی کتاب لکھوائی اور اس کو شائع بھی کیا۔ علامہ واقف سے انھوں نے ایسی تاریخ لکھوائی جو بڑی مفصل اور بیش بہا ہے۔ ڈاکٹر نسیم اختر نے بتایا کہ انھوں نے 12 جلدوں پر مشتمل 'نگارشات واقف' کے نام سے اس کتاب کا مسودہ دیکھا ہے۔ یہ کتاب شہر آرہ کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے، پھر ریاست بہار کی تاریخ ہے، اس کے بعد ہندستان کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے بعدہٗ اس کا دائرہ وسیع کر کے پورے عالم میں پھیلا دیا گیا ہے۔ (اس کو لوگ عام طور سے بہار کے شہر آرہ کی تاریخ سمجھتے ہیں)۔ یہ طویل ترین مفصل تاریخ ابھی مسودے کی شکل میں خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ دیکھیے تاریخ کا یہ قیمتی سرمایہ علم، کب پکی روشنائی میں منتقل ہوتا ہے۔ مشہور فکشن نگار احمد یوسف سے انھوں نے 'بہار اردو لغت' کی تدوین کا نادر کام لے لیا۔ جناب شاہ اسماعیل روح کی خدمات حاصل کر کے ان کی صلاحیت، ذکاوت اور ذہانت سے لائبریری کو مسلسل فیضیاب کرتے رہے۔ عطا اللہ پالوی نے بھی کئی اعلیٰ علمی اور تحقیقی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ سب عابد رضا بیدار کی غیر معمولی ذہانت اور اختراعی شخصیت کا کمال تھا، جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکا۔

عابد رضا بیدار اس لیے بھی قابل ذکر ہیں کہ ان کے دور میں جو سیمینار اور اجلاس ہوئے وہ تاریخی اور یادگار ہونے کے ساتھ بڑے علم خیز اور فکر انگیز ہوتے تھے۔ ان سے فکر و نظر اور علم و ادب کی جو شعاعیں

پھوٹیں، انھوں نے ہمیں کئی جہتوں سے منور کیا۔ سیمینار کے عنوانات بھی خوب ہوتے تھے اور ان کے شرکا بھی صلاحیت اور قابلیت میں اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے۔

'اردو ریسرچ کانگریس' کے نام سے ان کے چار پروگرام بے حد یادگار اور تاریخی رہے۔ یہ پروگرام غالباً سہ روزہ

ان کے دور میں جو سیمینار اور اجلاس ہوئے وہ تاریخی اور یادگار ہونے کے ساتھ بڑے علم خیز اور فکر انگیز ہوتے تھے۔ ان سے فکر و نظر اور علم و ادب کی جو شعاعیں پھوٹیں، انھوں نے ہمیں کئی جہتوں سے منور کیا۔ سیمینار کے عنوانات بھی خوب ہوتے تھے اور ان کے شرکا بھی صلاحیت اور قابلیت میں اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے۔

ہوا کرتا تھا۔ معیار تحقیق کے عنوان سے 'اردو ریسرچ کانگریس' اپنی نوعیت کا یہ بڑا منفرد اور کامیاب پروگرام رہا۔ پورے ملک کے دانشوران اردو اس میں یکجا ہوئے اور غیر معمولی نوعیت کے مقالے پڑھے گئے۔ ان تمام مقالوں کو جمع کر کے خدا بخش جرنل میں شائع کیا گیا۔

'اردو میں دانشوری' کے عنوان سے منعقدہ ریسرچ کانگریس بھی مثالی رہا۔ اس میں پڑھے گئے مقالے 'اردو مسئلہ' کے نام سے ایک کتاب میں شائع کیے گئے۔

عابد رضا بیدار کے سیمینار اور اجلاس کا معیار کیا ہوتا تھا اور اس میں کیسے کیسے علم و ادب کے لعل و گہر شریک ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ آپ اس فہرست سے لگا سکتے ہیں، جو 1989 عیسوی میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے 'اردو دانشوری' سیمینار کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ چند شرکا کے نام ملاحظہ فرمائیں:

قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، جمنا داس اختر، سید حامد، غلام سرور، گوپی چند نارنگ، شفیع مشہدی، مظہر امام، رشید حسن خاں، خلیق انجم، پروفیسر محمد محسن، نواب رحمت اللہ خاں شیروانی، تقی رحیم، کامریڈ حبیب الرحمٰن، انیس رفیع اور ان جیسے ایک درجن مزید اہم حضرات۔

اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ان کے ذریعے منعقدہ سیمینار کس نوعیت اور کس معیار کے حامل ہوتے ہوں گے۔ اس کا آپ کو مزید اندازہ لگانا ہو تو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے زیر اہتمام اردو دانشوری سیمینار کے مقالوں پر مشتمل شائع شدہ کتاب 'اردو مسئلہ: جڑوں کی آبیاری یا پتیوں پر چھڑکاؤ' کا مطالعہ کر لیجیے۔ عابد رضا بیدار کی مرتب کردہ یہ کتاب اردو کے مسئلے پر اتنی وقیع، علمی، دانشورانہ، معلوماتی اور فکر انگیز ہے کہ اس کا جتنی بار مطالعہ کیا جائے ہمیشہ نئی لگتی ہے اور نئی روشنی دیتی ہے۔ اس میں فکر و نظر کی ایک دنیا آباد ہے۔

میں جب اردو ڈائرکٹوریٹ کے ترجمان 'بھاشا سنگم' کا نائب مدیر تھا، تو میں نے اس کتاب میں شائع شدہ عابد رضا بیدار کی پرسوز اور پرمغز تحریر 'ماں کی ردا: جو دن ہوئے نیلام ہو چکی' شائع کی تھی، نیز اس کتاب کے کئی اہم اقتباسات کو بھی زینت رسالہ کیا تھا۔ اردو کے مداحوں اور خیر خواہوں نے اگر یہ کتاب نہیں پڑھی ہے تو یہ ان کے مطالعوں کے ذخیرے کی ایک بڑی کمی ہے۔ گویا عابد رضا بیدار نے سیمینار، اجلاس اور علمی مذاکروں کے نام پر بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

عابد رضا بیدار کی شخصیت کا ایک قابل رشک اور درخشندہ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ناداروں اور مجبوروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے اندر انسان دوستی بدرجہ اتم تھی۔ اس سلسلے میں کئی واقعات بیان کیے جاتے

عابد رضا بیدار ایک درد مند انسان تھے۔ ان میں انسانی ہمدردی بھی خوب تھی۔ لائبریری کا کوئی اسٹاف اگر کئی دنوں تک بیمار رہتا اور عابد رضا بیدار کو اطلاع ملتی کہ وہ مالی تنگی کا شکار ہے تو بلا تامل خاموشی کے ساتھ کسی کو بھیج کر اس کی مالی اعانت فرما دیتے۔ اکثر خود ڈاکٹر کو لے کر وہاں پہنچ جاتے اور اس کے عیادت اور اعانت دونوں کرتے۔

ہیں۔ جس کی ایک زندہ مثال علامہ واقف عظیم آبادی ہیں۔ جو بہار کے مشہور شہر آرہ کے رئیس خانوادے سے تھے۔ بعد میں جب سب لٹ پٹ گیا تو عظیم آباد چلے آئے۔ دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ رہے تھے۔ دانشوری اور علم کا ایک بہتا چشمہ علامہ واقف عظیم آباد تھے۔ وہ قلندر صفت تھے، بھوکے رہ جاتے، مگر کبھی دست سوال نہیں دراز کرتے۔ عابد رضا بیدار کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ لہٰذا انھوں نے ایک دن علامہ واقف عظیم آبادی کو لائبریری میں بلا کر بڑے احترام کے ساتھ کہا "حضور! آپ کی یادداشت بہت قیمتی ہے، انھیں قلم بند کیجیے اور روزانہ فی صفحے کے حساب سے مجھے نذرانہ پیش کرنے کی اجازت دیجیے"۔ واقف تیار ہو گئے۔ روزانہ جتنے صفحے لکھتے عابد رضا بیدار شام میں حساب کر کے رقم ان کے حوالے کر دیتے۔ دفتری اوقات میں ان کے خورد ونوش کا بھی انتظام کرتے۔ حالانکہ واقف عظیم آبادی عالم جذب میں ایک صفحے پر چند سطور ہی لکھتے۔ اس طرح صفحات کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ مگر عابد رضا بیدار نے کبھی اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ ان کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ عابد رضا بیدار کی اس طرح کی نجیبانہ کفالت کے کئی مثالیں ہیں۔

عابد رضا بیدار ایک دردمند انسان تھے۔ ان میں انسانی ہمدردی بھی خوب تھی۔ لائبریری کا کوئی اسٹاف اگر کئی دنوں تک بیمار رہتا اور عابد رضا بیدار کو اطلاع ملتی کہ وہ مالی تنگی کا شکار ہے تو بلا تامل خاموشی کے ساتھ کسی کو بھیج کر اس کی مالی اعانت فرما دیتے۔ اکثر خود ڈاکٹر کو لے کر وہاں پہنچ جاتے اور اس کے عیادت اور اعانت دونوں کرتے۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر لائبریری کے کسی عملے کے گھر میں کوئی مالی پریشانی ہے تو وہ اس کو چھٹی کے بعد روک لیتے ہیں اور اس سے دو گھنٹے زائد از وقت (Overtime) کام کراتے اور فوراً ہی ضرورت سے زیادہ اجرت ادا کر دیتے۔ یہ تھی ان کی دردمندی اور انسان دوستی اور انداز ایسا حکیمانہ کہ کسی کی غیرت کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

محنت کش کا پسینہ خشک ہونے سے قبل وہ اس کی اجرت دینے کے قائل تھے۔ اس لیے وہ تنخواہ بہ تاکید وقت پر ادا کرتے تھے۔ کسی سے اگر فاضل اوقات میں کام لیا تو اس کی اجرت بھی بہ عجلت ادا کرتے۔ لائبریری کے ایک سابق اسسٹنٹ انور علی وارثی نے بتایا کہ ایک بار عابد رضا بیدار مہینے کے آخری دن دلی کے لیے روانہ ہو گئے اور تنخواہ کے چیک پر دستخط کرنا بھول گئے، جس میں وارثی صاحب کا چیک بھی تھا۔ جب عابد رضا بیدار کی گاڑی پٹنہ مارکٹ کے پاس پہنچی تو انھیں یاد آ گیا۔ انھوں نے ڈرائیور کو گاڑی موڑنے کے لیے کہا۔ پھر وہ لائبریری پہنچے اور تمام چیک پر دستخط کیے۔ اس کے بعد

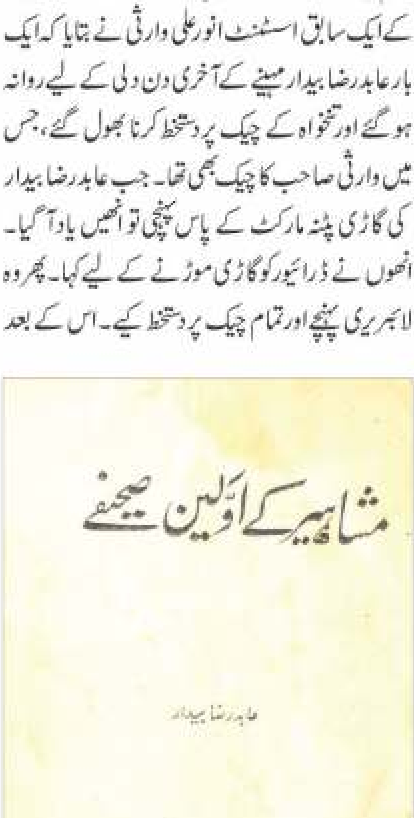

ہی وہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے۔ حالانکہ انھیں دو دن بعد ہی واپس ہونا تھا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ کو وہ مگدھ ایکسپریس سے دلی سے لوٹ رہے تھے۔ گاڑی بہت لیٹ ہو چکی تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ دوسرے دن سنیچر اور پھر اتوار تھا۔ بینک کے بند ہونے کا وقت ہو رہا تھا۔ انھوں نے گاڑی کے پٹنہ پہنچنے سے کچھ قبل ہی اسٹیٹ بینک آف انڈیا، جو ہٹہ برانچ کے منیجر کو فون کیا کہ آپ آج بینک دیر سے بند کریں گے، مجھے کچھ ارجنٹ چیک جمع کرانا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لائبریری کے ایک اسٹاف کو کچھ ہدایت دی اور سیدھے بینک پہنچ گئے، اور ملازمین کی تنخواہ کی رقم جمع کرائی۔ اس قدر اصول پسند تھے ہمارے عابد رضا بیدار جن کی مثال ملنی دشوار ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عابد رضا بیدار کی سخت اصول پسندی اور سخت گیری کے سبب لائبریری میں ان کے مخالفین کی بھی ایک خاصی تعداد تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اہالیان شہر اور اصحاب اردو بھی ان سے ناراض رہا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے خلاف کئی بار تاریخی مورچہ بندی بھی ہوئی۔ بڑے سے بڑا مخالفت کا طوفان بھی آیا، مگر عابد رضا بیدار پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ کبھی نا تو ڈرے اور نہ پیچھے ہٹے، مورچے پر اڑے اور جم کے لڑے۔ بالآخر مخالفین کو خاموش ہونا پڑا۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی ان کو غیر معمولی بناتا ہے۔

عابد رضا بیدار کی شخصیت کے آمیزے میں خوش انتظامی، علم پروری، اصول پسندی اور انسان دوستی بدرجہ اتم شامل رہی اور ان اوصاف نے مجتمع ہو کر انھیں ایک در نایاب بنا دیا۔

28/ مارچ 2025 کو 10 بجے صبح میں اس مثالی شخصیت کا رام پور (اتر پردیش) میں انتقال ہو گیا اور اسی روز رات میں انھیں رام پور کے ہی قبرستان میں دفن کر دیا گیا، لیکن وہ ہمارے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑ گئے، جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

■

Aslam Jawedan
Darul Gheyas
Near Hotel Blue Diamond
Jamunagali, Sabzi Bagh
Patna- 800004 (Bihar)
jawedanaslam@gmail.com

شیخ عقیل احمد

نجمہ رحمانی

ایک چراغ جو بجھ کر بھی روشن رہا

22 مارچ 2025 کی صبح، جب سورج اپنی نرم کرنوں کے ساتھ آسمان کی گہرائیوں میں روشنی بکھیر رہا تھا۔ اچانک فیس بک پر ایک پوسٹ نظر آئی، جو میرے اندر کی گہرائیوں تک ہلچل پیدا کر گئی، جیسے کسی نے میرے دل کو چھو کر ایک زوردار جھٹکا دیا ہو۔ وہ پوسٹ، جس کا ایک جملہ میری آنکھوں کے سامنے آیا، میں نے اسے بار بار پڑھا اور پھر میری نظریں اس ایک جملے پر جا کر ٹھہر گئیں ''شعبۂ اردو کی سابق صدر اور دہلی یونیورسٹی کی سابق ڈین، پروفیسر نجمہ رحمانی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔'' یہ الفاظ، جیسے کسی نے میری روح کو چاک کر دیا ہو، دماغ میں ایک شدید سناٹا چھا گیا۔ اچانک میرے اردگرد کی دنیا ماند پڑ گئی اور میرے اندر کی آواز بھی مدھم ہو گئی۔ وقت کا گزرنا جیسے رک سا گیا ہو اور دنیا کی تمام گردشیں ایک لمحے کے لیے تھم سی گئی ہوں۔ ایک گہری آہ، جو بے بسی اور غم کے طوفان کی نمائندہ تھی، میرے اندر سے گزر کر ایک کرب کی صورت میں جمع ہو گئی۔

میرا ایک بہت عزیز دوست جو اس وقت دوسرے کمرے میں تھا، وہ فوراً میرے پاس آیا، جیسے اس کے قدموں میں کسی انجانے خوف کی سرسراہٹ ہو۔ گھبرا کر اس نے پوچھا، ''کیا ہوا؟ اتنی شدت سے مجھے کیوں پکارا؟'' اس کی آنکھوں میں ایک بے چینی کی لہر تھی، جیسے اسے ایک غیر متوقع آفت کا گمان ہو۔ میری نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں اور زبان جیسے مٹھی بھر کٹھن الفاظ کے درمیان پھنس گئی تھی۔ الفاظ زبان سے ادا کرنا مشکل ہو رہا تھا اور میں جیسے ان الفاظ کو جوڑنے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ بہرحال، کسی طرح سے میں نے اسے وہ خبر سنائی، جو نہ صرف دل کو دہلا دینے والی تھی، بلکہ اتنی بھیانک اور غیر تصدیق شدہ تھی کہ مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہا، جیسے جادو کی کوئی قوت اسے اپنی گرفت میں لے چکی ہو، پھر اس نے کہا، ''یہ جھوٹی خبر ہوگی! کسی سے تصدیق کرو!''

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پروفیسر مظہر احمد کو فون کیا۔ فون کے اس طرف مکمل خاموشی تھی، جیسے فضا میں کوئی آواز نہ ہو، جیسے پوری دنیا میں بس سناٹا پھیل چکا ہو۔ پھر، پروفیسر احمد کی آواز آئی، مگر وہ بھی کچھ ایسی لرزتی ہوئی تھی کہ گویا وہ بھی اس حقیقت کو قبول کرنے میں مشکل محسوس کر رہے ہوں۔ ان کا لرزتا ہوا لہجہ، میری آخری امید کے چراغ کو جیسے ایک دم سے ہوا کے زور سے بجھانے کا سبب بن گیا۔ ''ہاں، یہ خبر سچ ہے... نجمہ نہیں رہیں...'' یہ الفاظ میرے دل پر ایسے گرے جیسے کسی بھاری پتھر کا گرنا اور وہ پتھر میرے دل کی گہرائیوں میں ایک شاک چھوڑ گیا۔ کمرے میں ایک عجیب سناٹا چھا گیا۔ میرا دوست، جو ابھی تک مجھے تسلی دے رہا تھا، وہ بھی اپنے اندر کی گہری ویرانی کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی کا ایک سمندر تھا، جیسے وہ بھی اس تکلیف کا بوجھ اپنے اندر سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکا، بس خاموش ہو کر میرے ساتھ اس غم کی گہرائی میں ڈوب گیا۔ جہاں ہر آواز اور ہر روشنی ختم ہو چکی ہو۔

نجمہ رحمانی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ایک پردے کی طرح گھومنے لگا، جیسے وہ ہر لمحہ میرے ساتھ تھی، جیسے اس کی مسکراہٹ، شفقت اور قہقہے کی گونج اب بھی فضا میں رچی ہوئی ہو۔ اس کی علمی مجلسیں، اس کی نصیحتیں، اس کی پر اثر تقریریں—یہ سب کچھ میری یادوں میں ابھرنے لگا تھا، لیکن اب وہ خود ان یادوں کا حصہ بن چکی تھی۔ یادیں بعض اوقات بادلوں کی طرح ہوتی ہیں، جو بے خبری میں آ کر یکدم ہم پر چھا جاتی ہیں اور ماضی کے دھبے اور پر سکون منظر پر اپنی گہری چھاؤں ڈال دیتی ہیں۔ وہ بادل جو اچانک گھیر کر، آسمان کو بھی سیاہ کر دیتے ہیں، اور پھر ان کی گزرگاہ میں ایک سنسان خاموشی چھا جاتی ہے۔ جیسے ان بادلوں نے میرے اندر ایک طوفان برپا کر دیا ہو اور ماضی کے دریا کی گہرائیوں سے نکل کر، ہزاروں یادیں، بے شمار لمحے، ان گنت مسکراہٹیں اور باتیں، سب ایک ہی وقت میں آنکھوں کے پردے پر ایک فلم کی طرح چلنے لگیں۔ وقت جیسے اپنی رفتار کو الٹ کر، سب کچھ فلیش بیک میں دکھا رہا ہو اور وہ لمحے جیسے دوبارہ جیتے جاگتے سامنے آ گئے ہوں۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں میرا داخلہ 1986 میں ہوا تھا اور نجمہ رحمانی نے 1987 میں وہاں قدم رکھا تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ہماری پہلی ملاقات کس دن یا کس مہینے میں ہوئی تھی، مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ جیسے ہی وہ ہمارے شعبے میں آئی، سب کچھ بدل گیا۔ نجمہ کوئی معمولی طالبہ نہیں تھی۔ اس کی موجودگی جیسے ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھی، جو آتی اور اپنی ہنسی کے ساتھ ماحول میں خوشگوار تبدیلی لا دیتی۔ اس کی ہنسی میں ایک خاص مسرت تھی، جیسے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے جب آپس میں بات کرتے ہیں، یا جیسے بہتے جھرنے خوشی کے ساتھ اپنا راستہ بناتے ہیں۔ نجمہ کی بے فکری اور شوخی اس میں ایک قدرتی دلکشی پیدا کرتی تھی اور وہ ہر لمحہ اس ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس

کی مسکراہٹیں اور باتیں ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں اور اس کا ہر لفظ اپنے اندر ایک نئی دنیا کی تخلیق کر رہا ہوتا تھا۔ وہ شعبہ اردو کے ہر کونے میں اپنی باتوں سے موجود رہتی اور اس کی ہنسی، اس کی باتیں، ہر دل میں ایک خاص گونج چھوڑ جاتی تھی۔ نجمہ کی یہ قدرتی کشش، اس کی محنت اور اس کا دوستانہ رویہ ہر کسی کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اپنے خیالات بانٹنے میں خوش رہتی اور ہر ایک سے دل کی باتیں کرتی، جیسے وہ چاہتی ہو کہ ہر شخص اس کے ساتھ خوش رہے اور ایک دوسرے کا ساتھ دے۔ اس کی باتوں میں ایک خاص محبت اور خلوص تھا، جو اس کے کردار کا حصہ بن چکا تھا۔ اب، جب وہ نہیں رہی، تو اس کی یادیں، اس کی مسکراہٹ، وہ سب اب بس یادوں میں ہے، جو کبھی بھی دم توڑنے والی نہیں ہیں، بلکہ ہمیشہ ایک نرم اور پیاری یاد کے طور پر دل میں باقی رہیں گی۔

نجمہ رحمانی کی یادیں میرے ذہن میں ایک کھلی کتاب کی طرح پھیلی ہوئی ہیں، جس کے ہر صفحے پر ایک الگ کہانی اور ایک منفرد لمحہ چھپا ہوا ہے۔ مگر اب اس کتاب کا ایک بہت اہم باب بند ہو چکا ہے اور اس باب کا اختتام، گویا کسی کہانی کے اختتام کا پیغام دے رہا ہو۔ نجمہ کی ہنسی، جو کبھی پورے ماحول کو خوشی سے بھر دیتی تھی، اب خاموش ہو چکی ہے۔ جیسے کسی پھول کا کھلنا اور پھر خود بخود مٹ جانا، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جسمانی طور پر تو ہمارے درمیان نہیں رہتے، لیکن ان کی یادیں، ان کے الفاظ اور ان کی مسکراہٹیں ہمیشہ کے لیے ہمارے دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ نجمہ بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی، جس کی موجودگی کا اثر ہمیشہ باقی رہے گا۔

دہلی یونیورسٹی کی راہداریوں میں، ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کے دوران ہم نے اپنے تعلیمی سفر کو ایک ساتھ طے کیا۔ وہی کلاس رومز، وہی پروفیسرز، اور وہی تحقیقی دن جب ہم اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شعبۂ اردو کے ریسرچ فلور پر ہم سب گھنٹوں بیٹھ کر اپنے کام میں مگن رہتے، کبھی کسی تھیسس میں غرق، کبھی مقالے کی تیاری میں مشغول اور کبھی کتابوں کے ڈھیر میں کھوئے ہوئے۔ نجمہ کے ساتھ یہ پورا سفر ایک یادگار تجربہ تھا، جیسے ہم صرف علمی دنیا میں ہی نہیں، بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہوں۔ لنچ کے دوران ہم سب مل کر کھاتے، چائے کے وقفے میں ہنسی مذاق کرتے اور پھر دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتے۔ ان لمحات کی خوشبو اور رنگینی ہمیشہ دل کے قریب رہی ہیں، لیکن یہ تعلق ہمیشہ ہموار نہیں تھا۔ کبھی باتوں میں اختلاف آ جاتا، کبھی کوئی غلط فہمی ہمیں چند دنوں کے لیے دور کر دیتی، کبھی مزاج کی سختی یا نرمی ہمارے بیچ آ جاتی۔ اور اس میں صرف نجمہ ہی نہیں، بلکہ مظہر احمد، سراج اجملی، رضی الرحمٰن اور کچھ اور دوست بھی ہوتے تھے جو ہمارے گروپ کا حصہ تھے۔ یہ سب مختلف مزاج رکھتے تھے اور کبھی نہ کبھی آپس میں لڑتے یا جھگڑتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی چھوٹی سی بات بڑی تکرار کا سبب بن جاتی، کبھی مذاق میں کہا گیا کوئی جملہ تلخی کی شکل اختیار کر لیتا۔ ان تمام اختلافات کے باوجود، ہم سب کا تعلق کبھی بھی ٹوٹا نہیں تھا۔ ہم لڑتے تھے، لیکن پھر جلد ہی وہ اختلافات ماضی کا حصہ بن جاتے اور ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے اور بات کرنے کے لیے دوبارہ تیار ہو جاتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک یونہی جاری رہا— کبھی گپ شپ اور مذاق سے بھرا، کبھی تلخ باتوں اور اختلافات کی صورت میں، لیکن آخرکار، کسی نہ کسی طریقے سے ہم سب کا رشتہ برقرار رہتا۔ ان لڑائیوں اور اختلافات کے باوجود، وقت گزرنے کے ساتھ، ہم اپنے مسائل کو حل کر لیتے اور دوبارہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے زندگی کے روزمرہ معمولات میں واپس آ جاتے۔ ہر بار یہی ہوتا کہ اختلافات کے بعد، جب ہم سب ایک ساتھ ہوتے، تو وہ پرانی باتیں اور جھگڑے ماضی کی گزر چکی چیزیں بن جاتے اور ہم سب دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ خوشی سے وقت گزارتے

> **وہ شعبہ اردو کے ہر کونے میں اپنی باتوں سے موجود رہتی اور اس کی ہنسی، اس کی باتیں، ہر دل میں ایک خاص گونج چھوڑ جاتی تھیں، نجمہ کی یہ قدرتی کشش، اس کی محنت اور اس کا دوستانہ رویہ ہر کسی کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اپنے خیالات بانٹنے میں خوش رہتی اور ہر ایک سے دل کی باتیں کرتی، جیسے وہ چاہتی ہو کہ ہر شخص اس کے ساتھ خوش رہے اور ایک دوسرے کا ساتھ دے۔**

اور آج جب ان دنوں کی یادیں واپس آتی ہیں، تو وہ لمحے دوبارہ دل میں زندہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ قہقہے، کبھی وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہونے والی بحثیں، کبھی وہ بظاہر معمولی لڑائیاں اور پھر ان کے بعد دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ ملنا— یہ سب یادیں ہمارے ذہن و دل میں ہمیشہ تازہ رہیں گی اور ان میں شامل تمام دوستوں کی موجودگی، ان کے قہقہوں، ان کی باتوں، ان کی لڑائیوں اور پھر دوبارہ دوستی کے لمحوں کی یادیں ہمیشہ میرے ذہن میں ایک روشن تصویر کی طرح چمکیں گی۔

1994 کا سال میرے لیے ایک نیا موڑ لے کر آیا۔ میرا تقرر ستیہ وتی کالج، دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر کی حیثیت سے ہو گیا اور یوں میں اپنی تدریسی مصروفیات میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ شعبۂ اردو کے ریسرچ فلور پر جانا کم ہو گیا۔ دوستوں کے ساتھ دن رات کی محفلیں، علمی گفتگو اور وہ بے فکری کے لمحات— سب رفتہ رفتہ ماضی کا حصہ بنتے گئے۔ زندگی ایک نئے رخ پر چل نکلی، جہاں طالب علموں کو پڑھانا ہی میرا سب سے بڑا مشن بن گیا۔ ادھر نجمہ رحمانی کے علمی سفر میں بھی ایک نیا باب کھلا۔ کچھ سالوں بعد اس کا تقرر 6 جولائی 2000 میں نیشنل ڈیفینس اکیڈمی، پونے میں ہو گیا، جہاں وہ فوجی افسران کو اردو زبان و ادب پڑھاتی تھی۔ وہ اپنے انداز کی منفرد اور بے حد متحرک شخصیت تھی، جہاں جاتی، اپنی چھاپ چھوڑ جاتی۔ پونے میں بھی وہ خوش تھی، مگر شاید کسی تخلیقی پرندے کی طرح، جو کھلے آسمان میں پرواز کرنا چاہتا ہے مگر محدود فضاؤں میں قید ہو جاتا ہے، نجمہ کو لگتا تھا کہ اس کی صلاحیتوں کا مکمل استعمال وہاں نہیں ہو رہا۔ دو یا تین سال بعد، جب قسمت نے دہلی یونیورسٹی کے دروازے اس کے لیے دوبارہ کھول دیے اور دہلی یونیورسٹی میں 3 فروری 2003 میں شعبہ اردو میں تقرر ہو گیا، تو وہ بے حد خوش ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک بار پھر اپنی حقیقی دنیا میں واپس آ گئی ہو، جہاں اس کے علم، اس کے تخلیقی جوہر اور اس کی تدریسی صلاحیتوں کو پہچان مل رہی تھی۔ دہلی یونیورسٹی اس کے لیے محض ایک تدریسی ادارہ نہیں تھا، بلکہ ایک ایسا میدان تھا جہاں وہ اپنی مکمل توانائی، اپنی ذہانت اور اپنی تحقیقی لگن کے ساتھ جی سکتی تھی، سیکھ سکتی تھی اور سکھا سکتی تھی۔ نجمہ رحمانی کی یہ واپسی نہ صرف اس کی ذات کے لیے خوش آئند تھی، بلکہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے بھی ایک قیمتی اثاثہ

ثابت ہوئی۔ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں، منفرد تدریسی انداز اور گہری علمی بصیرت کے ساتھ اس شعبے میں ایک مضبوط اور روشن مقام بنانے میں کامیاب رہی۔

پروفیسر نجمہ رحمانی کا علمی و تدریسی سفر اس کی محنت، لگن اور علمی بصیرت کی روشن مثال ہے۔ اس کی شخصیت صرف ایک استاد تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ ایک ماہر تحقیق، منتظم اور ادبی دنیا میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے والی دانشور بھی تھی۔ نجمہ کا تدریسی سفر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں شروع ہوا، جہاں اس نے پوسٹ گریجویٹ سطح پر کلاسیکی و جدید شاعری، عروض اور اردو تنقید پڑھانے کا بیڑہ اٹھایا۔ شاعری میں اس کی خصوصی دلچسپی تھی اور اسی محبت نے اسے اردو شاعری میں علامتی رجحانات پر تحقیق کی طرف مائل کیا۔ اس کا ایم فل کا مقالہ آزادی کے بعد جدید اردو شاعری کے رجحانات پر تھا، جب کہ اس کی پی ایچ ڈی کی تحقیق خواتین کی شاعری، خاص طور پر برصغیر میں نسوانیت کے رجحانات پر مرکوز رہی۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان کی شاعرات کا گہرا مطالعہ کیا اور دونوں ممالک میں نسوانی شاعری کے فرق اور ارتقا پر تحقیق کی۔ اس کا ماننا تھا کہ پاکستان میں شاعرات نے اپنی شاعری کو حقوق نسواں کی تحریک کا ہتھیار بنایا، جب کہ ہندوستان میں یہ رجحان اتنا واضح نہیں تھا۔ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید جیسی شاعرات کی تخلیقات کا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے ان کی شاعری میں سماجی احتجاج کے عناصر کو اجاگر کیا۔ نجمہ نے اردو شاعری اور فکشن کے حوالے سے بہت اچھا اور معیاری تحقیقی کام کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی جدید شاعرات پر اس کی کتاب ایک وقیع علمی کاوش ہے اور وہ ہندوستان و پاکستان کی نسوانی شاعری پر ایک تقابلی مطالعہ بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اردو افسانہ جدید دور میں دیگر زبانوں کے مقابلے میں قدرے پیچھے رہ گیا ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ عالمی معیاری افسانوں کے اردو تراجم کی کمی ہے۔ وہ اردو میں ترجمہ کے رجحان کو فروغ دینا چاہتی تھی تاکہ اردو کے تخلیقی افسانہ نگار جدید عالمی ادب سے روشنی حاصل کرسکیں۔

نجمہ نہ صرف ادبیات کی ایک شناور تھی بلکہ ایک کامیاب منتظم بھی تھی۔ اس نے نیشنل ڈیفنس اکیڈمی، پونے میں مختلف انتظامی ذمے داریاں نبھائی، جہاں وہ کیڈٹس کی اہم نصابی سرگرمیوں کی انچارج، ڈسپلن کمیٹی

کی ممبر اور گولف اسکواڈرن کیڈٹ کونسلر کے طور پر خدمات انجام دیتی رہی۔ دہلی یونیورسٹی میں بھی وہ کئی اہم کمیٹیوں کا حصہ رہی۔ وہ پوسٹ گریجویٹ کورسز، آنرز کورسز، ایم فل اور فیکلٹی آف آرٹس کی رکن رہی اور مختلف نصابی اور غیر نصابی منصوبوں میں فعال کردار ادا کرتی رہی۔ مختصر یہ کہ پروفیسر نجمہ رحمانی کا علمی سفر محض ایک استاد کا سفر نہیں تھا، بلکہ یہ اردو زبان و ادب کے فروغ، تحقیق اور تدریسی نظام میں بہتری کے لیے ایک سنجیدہ کوشش تھی۔ ان کی زندگی ہم سب کے لیے ایک مثال ہے کہ ایک استاد کا کردار محض کلاس روم تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے علم و بصیرت سے ایک پورے تعلیمی ماحول کو تشکیل دیتا ہے۔

پونے میں قیام کے دوران بھی نجمہ سے میرا رابطہ برقرار رہا۔ وہ اکثر اپنے تجربات، اپنی تدریسی ذمے داریوں اور وہاں کے ماحول کے بارے میں مجھے بتایا کرتی تھی۔ اس کی گفتگو میں ہمیشہ ایک خاص جوش اور سچائی ہوتی تھی۔ وہ اپنے حالات کی سچائیوں سے بھی پردہ نہیں اٹھاتی تھی اور نہ ہی کسی خوش فہمی میں مبتلا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر جگہ اپنی مشکلات ہوتی ہیں، مگر ان سے نمٹنے کا حوصلہ رکھنے والے لوگ ہی اصل فاتح ہوتے ہیں۔ دہلی واپسی کے بعد، ہماری ملاقاتیں پہلے جیسی تو نہیں رہیں، لیکن ٹیلی فون پر باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

نجمہ کا دل تعلیمی اداروں میں ہونے والی بدامنی سے بے حد دکھی ہوتا تھا۔ جب بھی دہلی یونیورسٹی میں کوئی ناانصافی یا بدنظمی دیکھتی، وہ مجھے فون کرکے تفصیل سے بتاتی۔ اس کے لہجے میں درد ہوتا، مگر ساتھ ہی ایک عزم بھی جھلکتا کہ وہ اس سب کے خلاف آواز بلند کرے گی۔

دراصل، نجمہ ایک بے حد ایماندار اور اصول پسند استاد تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ تعلیمی ادارے، سیاست اور بدنظمی کے چنگل سے آزاد ہوں، مگر یہ جنگ آسان نہ تھی۔ دہلی یونیورسٹی کی سیاست میں وہ نہ صرف سرگرم تھی بلکہ اکثر ایک اکیلی جنگجو بھی تھی۔ وہ ہر غلط چیز کے خلاف بولتی، ہر ناانصافی پر سوال اٹھاتی، چاہے اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ شاید یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی— وہ نہ کبھی ڈری، نہ کبھی جھکی اور نہ کبھی خاموش ہوئی۔ تمام نشیب و فراز کے باوجود، نجمہ رحمانی نے اپنی لگن اور غیر معمولی صلاحیتوں کے بل پر کامیابی کی وہ منزلیں طے کیں، جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ ساڑھے تین سال قبل، وہ نہ صرف شعبۂ اردو کی صدر رہی بلکہ فیکلٹی آف آرٹس کی ڈین کے منصب پر بھی فائز ہوئی۔ یہ اس کی محنت، قابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ راستہ آسان نہیں، مگر وہ ہمیشہ چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ 27 ستمبر 2018 سے 27 ستمبر 2023 کے درمیان، میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت تعلیم، حکومت ہند میں ڈیپوٹیشن پر ڈائرکٹر کی حیثیت سے فائز تھا۔ دوران عہدہ، میں نے کئی بار اسے کونسل میں مدعو کیا، جہاں ہم مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے۔ اس کے علاوہ بھی اکثر شعبۂ اردو اور ڈین کے دفتر میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ ہمیشہ گرمجوشی سے ملتی، گویا برسوں کی رفاقت کا ایک غیر محسوس سا رشتہ تھا جو کسی بھی رسمی منصب سے بالاتر تھا۔

ایک دن، شعبہ اردو میں کلاسیکی غزل پر ایک لیکچر کا انعقاد ہوا، جہاں علی گڑھ یونیورسٹی کے نامور اساتذہ، پروفیسر قاضی جمال اور پروفیسر قاضی افضال مدعو تھے۔ قاضی افضال اس خصوصی لیکچر کے کلیدی مقرر تھے، جبکہ قاضی جمال صدارت کر رہے تھے۔ اس خاص موقع پر، نجمہ نے مجھے بطور چیف گیسٹ مدعو کیا۔ جب میں نے اسے کہا کہ میرے ہی شعبہ اردو میں مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلانا شاید مناسب نہیں ہوگا، تو نجمہ نے مسکرا کر کہا، ''تم اس وقت قومی کونسل کے ڈائرکٹر بھی ہو، اس لیے تمھیں بلانا بالکل درست ہے۔'' اس کی بات میں ایک ایسا خلوص اور گہرائی تھی کہ میں نے فوراً اس کی بات مان لی، کیونکہ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ جب میں نے اپنی تقریر مکمل کی، تو نجمہ نے نہ

صرف میری باتوں کی دل سے تعریف کی بلکہ بعد میں بھی کئی مرتبہ اس خطاب کا ذکر کیا۔ نجمہ کا انداز ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ ہر فرد کی صلاحیتوں کا پورا اعتراف کرتی اور اس کی تعریف کرنے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیتی۔ وہ کسی کی بھی صلاحیت کو نظر انداز نہیں کرتی تھی اور ہمیشہ دوسروں کو اپنی پوری ہمت سے آگے بڑھانے کی کوشش کرتی۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان کی محنت اور قابلیت کو عزت ملنی چاہیے اور اس کے دل میں کسی قسم کی بے انصافی یا کمزوری کے لیے جگہ نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نجمہ صرف ایک استاد یا افسر نہیں، بلکہ ایک تحریک بن گئی تھی، ایک ایسا نمونہ جو ہر کسی کے دل میں اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑ گیا۔ اس کا رویہ، اس کی جدوجہد اور اس کی شخصیت، سب کچھ اس کی انسانیت کی گہرائیوں سے جڑا ہوا تھا۔ وہ صرف علم کی درس دینے والی نہیں، بلکہ زندگی کو جینے کا ایک بہتر طریقہ سکھانے والی شخصیت بن چکی تھی۔

ایک سال قبل کی ایک شام، جب زندگی اپنے معمول کی راہ پر گامزن تھی، اچانک ایک منحوس خبر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا— ''نجمہ کو کینسر ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ میرے کانوں میں زہر گھول گئے، جیسے کسی نے میرے دل پر برف کی سل رکھ دی ہو۔ میں لرز گیا، ایک دم ساکت ہو گیا، جیسے وقت تھم گیا ہو، جیسے کسی نے میری ہنستی مسکراتی یادوں کے دریچے پر زنگ آلود تالے ڈال دیے ہوں۔ میرے ہاتھ میں موبائل تھا، لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں نجمہ کو فون کر کے اس خبر کی تصدیق کروں۔ کیسے پوچھتا؟ کیا کہتا؟ کیا میری زبان یہ کہنے کی طاقت رکھتی تھی کہ ''نجمہ، سنا ہے تم بیمار ہو؟'' یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ میرا دل ماننے کو تیار نہیں تھا اور میرے دل کے کسی گوشے سے یہ آواز آ رہی تھی کہ یہ خبر جھوٹی ہے، افواہ ہے۔ مگر جب میں نے پروفیسر مظہر احمد کو کال کی، تو انھوں نے تصدیق کر دی— ''ہاں، نجمہ کو کینسر ہو گیا ہے، اس کا علاج چل رہا ہے لیکن نہ تم اس کو کال کرنا اور نہ ہی اس کے گھر جانا۔'' یہ سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے وہ ہنستی، کھلکھلاتی نجمہ آ گئی، جو ہمیشہ زندگی سے بھرپور نظر آتی تھی۔ وہ نجمہ، جو کبھی مایوس نہیں ہوتی تھی، جو ہر حال میں مسکراتی تھی، جو لڑتی تھی، ڈٹ کر کھڑی رہتی تھی۔ اور آج وہی نجمہ ایک مہلک بیماری سے جنگ لڑ رہی تھی۔ چونکہ مظہر احمد نے مجھے منع کیا کہ میں اسے کال نہ کروں۔ انھوں نے کہا، ''وہ کسی کا فون نہیں اٹھاتی، نہ کسی سے ملنا چاہتی ہے۔'' ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ایک دن ساتھ چل کر اس سے ملیں گے۔ لیکن وہ دن کبھی نہ آ سکا۔ زندگی کی مصروفیات، وقت کی بے رحم گردش اور ہماری اپنی کوتاہیاں— سب نے ہمیں اس ملاقات سے محروم کر دیا۔ کبھی خبر ملتی کہ نجمہ ٹھیک ہو رہی ہے، شعبہ اردو میں آنا جانا شروع کر دیا ہے۔ کبھی سننے کو ملتا کہ وہ اپنے گھر پر رہ رہی ہے اور ساری سرکاری فائلیں گھر بھیج دی جاتی ہیں تاکہ وہ صدر شعبہ کی ذمہ داری نبھا سکے۔ میں نے سوچا، شاید اب وہ ٹھیک ہے، شاید اب وہ بہتر محسوس کر رہی ہے۔ لیکن حقیقت وہ نہ تھی جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر، دس پندرہ دن پہلے، میرے ایک عزیز دوست، پروفیسر ششی شیکھر سنگھ نے بتایا کہ نجمہ کی طبیعت پھر بہت بگڑ گئی ہے۔ میرا دل دھڑک اٹھا، میں نے فوراً اسے کئی بار کال کیا، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ ہر بار اسکرین پر اس کا نام ابھرتا اور اگلے ہی لمحے وہ خاموشی میں تحلیل ہو جاتا۔ جیسے میری التجائیں کسی صحرائی ہوا میں بکھر رہی ہوں، پریشانی کے عالم میں، میں شعبہ اردو پہنچا۔ وہاں پروفیسر ابوبکر عباد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا، ''وہ آج کل شعبے نہیں آ رہی، آپ ان کے گھر جا کر مل لیجیے۔'' میں امید کی کرن لیے اس کے گھر پہنچا، مگر وہاں دروازہ بند ملا۔ دل بے چین ہو گیا، جیسے کسی طوفان کے آنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہو۔ پھر میں نے دوبارہ مظہر احمد کو فون کیا۔ اس بار ان کی آواز میں بھی وہی بے بسی تھی جو میرے دل میں تھی۔ انھوں نے کہا، ''نجمہ ہسپتال میں ہے۔'' میں نے التجا کی، ''ہم دونوں ایک ساتھ چل کر اس سے ملتے ہیں۔'' مظہر نے کہا، ''ہسپتال سے لوٹنے دو، پھر چلیں گے۔''

نجمہ نہ صرف ادبیات کی ایک شناور تھی بلکہ ایک کامیاب منتظم بھی تھی۔ اس نے نیشنل ڈیفنس اکیڈمی، پونے میں مختلف انتظامی ذمے داریاں نبھائی، جہاں وہ کیڈٹس کی اہم نصابی سرگرمیوں کی انچارج، ڈسپلن کمیٹی کی ممبر اور گولف اسکواڈرن کیڈٹ کونسلر کے طور پر خدمات انجام دیتی رہی۔

جمعہ کا دن تھا، جب وہ ہسپتال سے واپس تو آئی، لیکن اس کی حالت میں ایک ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے کسی طوفان کی گہری خاموشی ہو۔ وہ ابھی ہمارے درمیان تھی، مگر زندگی اور موت کے بیچ ایک بہت ہی باریک سی لکیریں بن چکی تھیں، جنھیں پار کرنے کا فیصلہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی دریا کی گہری لہریں کسی کشتی کو اپنی گہرائیوں میں دبوچ لیتی ہیں، ویسے ہی موت کی یہ لکیریں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں۔ وہ شب بھر زندگی کو تھامے ہوئے تھی، جیسے کوئی آسمان سے گرا ستارہ دوبارہ چمکنے کی کوشش کر رہا ہو، مگر موت نے اس کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے یہ خواب چھین لیا۔ اور میں... میں اس کی آخری جھلک بھی دیکھنے سے محروم رہا۔ اس کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی، وہ اب صرف میری یادوں کا حصہ بن گئی۔

پھر، جیسے فیس بک پر ایک ماتمی جلوس نکل آیا۔ ہر طرف اس کے انتقال کی خبریں آ رہی تھیں، جیسے کوئی گہرا سناٹا چاروں طرف پھیل رہا ہو۔ ہر ایک نے اپنی پوسٹ میں افسوس بھری تحریریں لکھیں، دل کی گہرائیوں سے تعزیت پیش کی اور جیسے اس کے جانے کا نوحہ شروع ہو گیا ہو۔ لوگ اس کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے، مگر میں... میں کچھ نہیں لکھ سکا۔ کیسے لکھتا؟ کیسے مان لیتا کہ نجمہ اب ہمارے درمیان نہیں رہی؟ وہ نجمہ، جو ہمیشہ مسکراتی، زندگی کی خوشبو کو ہر لمحے میں سموئے ہوئے تھی، اب بس ماضی کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، اس کا چہرہ جو زندگی کی تیز دھار پر چل رہا تھا، اب ان سب باتوں کا وجود صرف یادوں میں تھا۔ نہیں، میں نے کچھ نہیں لکھا۔ کیونکہ کچھ بھی لکھنا اس حقیقت کو بدل نہیں سکتا تھا، جسے میرا دل ابھی تک قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نجمہ رحمانی، تمھاری مسکراہٹ، تمھاری باتیں، تمھاری بے باکی، تمھاری سچائی اور تمھاری بہادری ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ تمھارے جانے کے باوجود تم ہمیشہ ہماری یادوں میں مسکراتی رہوگی اور ہم ہمیشہ تمھیں اپنے دلوں میں زندہ رکھیں گے، جیسے ایک کہانی جو کبھی ختم نہیں ہوتی، جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ جو رات کی تاریکی میں ہمیں اپنا نور دیتا رہتا ہے۔

■

Prof. Shaikh Aquil Ahmad
Cottage 42, Shipra Sun City, Indirapuram
Ghaziabad- 201014 (UP)
Mob.:9911796552
aquilahmad2@gmail.com

مٹی کے اوراق کی کتابیں

شایاں قدوائی

انسان کی تہذیبی تاریخ کا جب ہم قدامت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو سب سے قدیم تاریخ ڈاکٹر ہنری اسمتھ ولیم کی دریافت کے مطابق میسوپوٹامیا کی تہذیب کہی جاسکتی ہے جس کا تاریخی زمانہ سات ہزار سال ق م یا آج سے تقریباً نو ہزار سال ق م پہلے سے شروع ہوا۔ سابق میسوپوٹامیا، دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان ایک نہایت شاداب اور زرخیز علاقہ تھا۔ اس سرزمین نے یکے بعد دیگرے کئی تہذیبیں پیدا کیں اور بہت عروج تک ان کو پہنچانے کے بعد اپنی گود میں چھپالیا۔

سمیری تہذیب

چار ہزار سے تین ہزار سال ق م تک: میسوپوٹامیا میں سب سے پہلے سمیری قوم کے نشانات ملتے ہیں۔ جو مشرق کے کسی حصے سے ترکِ وطن کرکے آئے تھے اور دریائے فرات کے کنارے چلتے ہوئے خلیج فارس کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ غالباً سب سے پہلے وہ خلیجی علاقے میں آباد ہوئے۔ یہ سرزمین انھیں اس قدر سازگار ہوئی کہ وہاں انھوں نے اپنی خانہ بدوش زندگی کو ایک اعلیٰ قبائلی معاشرے تک ترقی دی اور اس کے آگے ملوکی نظام قائم کرلیا تھا۔ ان کی تہذیبی ترقی کے نشانات چار ہزار برس ق م سے بھی بہت آگے کے ملتے ہیں۔ انھوں نے بڑے بڑے شہر آباد کیے تھے جن میں اریگاش اور عظیم الشان شہر نپور کے آثار دریافت ہوچکے ہیں۔ ان کی پھولتی پھلتی آبادیاں شمال کی طرف بڑھتی ہوئی دور تک پھیل گئی تھیں۔ چند صدیوں میں ان کی معاشرت تہذیب کے اس اعلیٰ مقام تک پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے اپنا ایک تصویری طرزِ تحریر ایجاد کرلیا تھا۔ لکھائی کا جو سب سے قدیم نمونہ اس خطے سے دستیاب ہوسکا وہ تین ہزار پانچ سو ق م کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تصویری علامتوں (Pictography) کچے پتھر پر ہڈی یا پتھر کے قلم سے لکھی ہوئی لوح جو زرعی پیداوار کی ایک رپورٹ ہے۔

تین ہزار ق م سے دو ہزار ق م تک: تقریباً دو ہزار نو سو ق م میں تحریر کیا ہوا سمیری قوم کا جو کتبہ ملا وہ پہلے کتبے سے کافی ترقی یافتہ ہے۔ پانچ چھ سو سال میں انھوں نے حقیقی تصویری خط (Pictography) سے آگے بڑھ کر تصوری خط (Idiography) ایجاد کرلیا تھا۔ ایک طرف رسم الخط کو ایک منزل آگے بڑھایا، دوسری طرف سمیریوں نے لکھائی کے سامان میں ایک نئی چیز دریافت کی۔ اب تک انسان نے جتنی تصویریں، نشانات اور لکیریں کھینچی تھیں ان کی کافی لمبی فہرست ہے جس میں چھال، پتیاں، ہڈی، سینگ اور پتھر کی چٹانیں اور سلیں خاص طور پر تھیں لیکن اب جو نئی چیز انھیں سوجھی تھی وہ نرم گندھی ہوئی مٹی تھی۔ بمقابلہ پچھلی تمام چیزوں کے اس پر لکھنا کہیں آسان تھا، جلدی بھی لکھا جاسکتا تھا اور خوبصورت نقوش بھی بن سکتے تھے۔ چنانچہ اسے مقبولیت حاصل ہوئی اور زمانۂ دراز تک اس کا رواج رہا۔ سمیریوں نے دجلہ و فرات کے دوآبے میں بافراط چکنی مٹی دیکھی اور اس کے اعلیٰ نفیس مصرف کا انھیں ادراک ہوا۔ انھوں نے مٹی کی ہموار چپٹی تختیاں تیار کیں جن کی سطح خوب چکنی ہوتی تھی۔ ابتدا میں ان تختیوں کا سائز بارہ انچ لمبائی اور آٹھ انچ چوڑائی کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ دریا کے کنارے بکثرت نرکل اور کلک اگا ہوا تھا۔ اس کے نوک دار ترچھے قط سے چکنی مٹی کی تختیوں پر خوبصورت نیم تصویری رسم خط کے تصویری خاکے نفاست سے کھینچنا بمقابلہ پتھر پر نقوش کھودنے کے بہت آسان نظر آیا اور بہت کم وقت میں نہایت عمدہ لکھائی ہونے لگی۔ وہ لوگ لکھائی کے بعد نرم مٹی کی تختیوں کو دھوپ میں خشک کرتے تھے اور پھر بھٹی میں پکا کر اینٹوں کی طرح پختہ بھی کرلیتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تختیوں پر نقش کی ہوئی تحریروں کی انھیں بہت حفاظت مدنظر تھی۔ شاید شروع میں کچی ہی تختیاں کچھ زمانے تک رہی ہوں جو ضائع ہوکر اس زمانے تک نہیں پہنچ سکیں اور یہ مضبوط پختہ تختیاں پانچ چھ ہزار سال کا سفر کرکے یہاں تک آئی ہیں اس عہد کے عجائب خانوں میں مقام کیے ہوئے ہیں۔

اگلے سات سو برس میں سمیریوں نے اس مصوری طرزِ تحریر کو ترقی دے کر ایک بالکل مختلف انداز کے حروف کا اپنے تصویری خط میں اضافہ کرلیا۔ یہ حروف لوہے کی میخ یا برنجی، کیل جیسی شکل سے مشابہت رکھتے تھے۔ ان سے معنی کے علاوہ کچھ صوتی مخرج کی بھی نمائندگی ہوتی تھی جو تصویری شکلوں سے ممکن نہ تھی۔ اگرچہ وہ بہت کم صوتی علامات تھیں لیکن فن تحریر کی ترقی کے لیے ایک عظیم الشان پہلا قدم تھا۔ نئے حروف کی تمام شکلیں ایک میخی نشان سے مرکب تھیں۔

سمیری قوم نے طرزِ تحریر میں تو یہ ترقی کی تھی مگر مٹی کی تختیوں کا کوئی بدل اس قوم کی تاریخ میں دور تک نظر نہیں آتا۔ اسی جسامت کی نقش کی ہوئی بکثرت تختیاں نپور اور دوسرے شہروں کی عبادت گاہوں کے کتب خانوں، تجارتی مرکز اور دفاتر میں اکٹھا ہوتی رہیں۔ چنانچہ ان قدیم ترین شہروں کے کھنڈرات سے موجودہ زمانے میں مٹی کی تختیوں پر کتبوں کا بہت بڑا ذخیرہ برآمد ہوا ہے، یہ کتابیں جو ان کے کتب خانوں سے نکلی ہیں۔ مذہبی عقائد اور طریق عبادت، معبودوں کے بھجن وغیرہ پر بکثرت ہیں، لیکن سیاسی اور مملکتی دستاویزات، تجارتی لین دین اور قرضوں کے بہی کھاتے یا دوا علاج کے نسخے اور دیگر علوم و فنون سے متعلق کتابیں بھی کم نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ نجی خطوط بھی بہت زیادہ ہیں۔

عکاد، بابل اور عاشوری تہذیبیں

زمانہ دو ہزار ق م سے ایک ہزار ق م تک: دو ہزار سال ق م سے کچھ پہلے ہی سمیری قوم کی خانہ بدوش زندگی تہذیب و معاشرت میں ترقی کرتی ہوئی ایک عظیم نظام مملکت تک پہنچ کر زوال پذیر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اسی زمانے میں دریائے دجلہ اور فرات کے شمالی حصے میں عکادی قوم ابھر رہی تھی۔ عکاد سامی نسل سے تھے۔ اس وقت سے ہزاروں سال آگے تک تہذیبی قیادت اور سیاسی اقتدار اسی نسل کے ہاتھوں میں رہا۔ دو ہزار ق م میں وہ سمیری قوم سے بہت کچھ حاصل کرکے اتنے طاقتور ہوگئے تھے کہ جب سمیریوں کا زوال

ہوا تو انھوں نے بحسن وخوبی، ان کی عظیم مملکت کا انتظام سنبھال لیا اور میسوپوٹامیا کے سرسبز علاقے میں ان کا تسلط ہوگیا۔ آگے چل کر ان سے دو عظیم الشان جڑواں تہذیبیں وجود میں آئیں جو بابل اور عاشوری سے موسوم ہیں۔ علم وفن کی ارتقا اور کثیر تعداد میں بابل۔ عاشوری ادب پر کتابوں کی تخلیق ان کا شاندار تاریخی باب ہے۔ ان کی زبان لسانی سائنس اور فن تحریر کے اعتبار سے پندرہویں صدی ق م میں دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مستند قرار دی گئی۔

انھوں نے سمیری قوم سے پائی ہوئی کیونی فارم مخروطی حروف کی چند مختصر شکلوں کو جن کے ساتھ بکثرت تصویری اور تصوری علامتیں شامل تھیں، ترقی دے کر بتیس حروف کے باقاعدہ ایک صوتی رسم الخط کا خیال دنیا میں سب سے پہلے پیش کیا اور تحریر وسماعت کے درمیان پہلا نزدیکی رشتہ پیدا کیا جس سے فن تحریر میں رکن تہجی کا آغاز ہوا۔ ان کی وضع کی ہوئی تحریری علامتوں کو نہ صرف جلد اور آسانی سے نقش کیا جاسکتا تھا بلکہ چھپائی کا امکان بھی پیدا ہوا اور بابل۔ عاشوری عہد میں بکثرت کچی مٹی کی تختیوں پر کتابیں چھاپی گئیں جو چھپنے کے بعد بھٹی میں پکا کر پختہ کرلی جاتی تھیں۔ یہ ابتدائی طباعت لکڑی کے بیلنوں پر مطلوبہ عبارت کندہ کرکے کچی مٹی پر پھیرنے سے عمل میں آتی تھی۔

ان کی وضع کی ہوئی بتیس حروف کی ایک تختی شامی ساحل سے متصل اگارت مقام پر مٹی کی سیکڑوں دوسری تختیوں کے ساتھ 1929 میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران ملی تھی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں وادیِ دجلہ وفرات سے ساحل روم تک پورا علاقہ عاشوریوں کے زیر نگیں تھا۔ مٹی کی تختیوں پر میخی حروف کے رسم خط کی کتابیں نہ صرف بابل اور عاشوری تہذیبوں میں رائج تھیں بلکہ ان کے تہذیبی اثرات ایشیائے کوچک کی حتی قوم نے بھی قبول کرلیے تھے اگرچہ علامات میں کچھ فرق تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں کتاب کے لیے اس سے بہتر چیز کا ادراک کافی زمانے تک انسان کو نہ ہوسکا۔ روز بروز ان اوراق کی تیاری کے لیے زیادہ اچھی مٹی کا انتخاب ہوتا گیا جس سے زیادہ چکنی اور نفیس تختیاں ترقی پذیر ہوتی رہیں۔ آگے ان کی بناوٹ، شکل اور سائز میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔

بابل کے رسم خط میں چھ سو چالیس تحریری علامتیں رائج تھیں اور عاشوریوں کے یہاں پانچ سو دس تھیں جن میں تین سو علامتیں عام طور پر مستعمل تھیں۔ ان کی تحریروں میں سو سے ایک سو بیس تک رکنی علامات رائج تھیں جب کہ سمیریوں کے دور میں چھ سو قسم کی مکمل لفظی علامتیں تحریر میں پائی گئیں۔

بابل اور عاشوریوں کے علمی ذوق وشوق اور فنی تجربات کی سرگرمی نے لکھنے کا مواد اس قدر پیدا کردیا تھا۔ لکھنے کا سامان اتنا ارزاں اور سہل الحصول تھا اور لکھائی اور چھپائی کا طریقہ ایسا آسان اور تیز رفتار تھا کہ تہذیب کے اس ابتدائی دور میں انسان نے جتنی کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کیں اور جس وسیع پیمانے پر کتب خانے تعمیر کیے ان کے بچے کھچے آثار دیکھ کر آج کا انسان بھی حیرت زدہ ہوجاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ میسوپوٹامیا کے علاقے میں صرف تین جگہوں پر کھدائی سے پانچ لاکھ سے زائد مٹی کی تختیاں برآمد ہوئیں جن کی یورپ اور امریکہ کے میوزیم نمائش کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ بیس ہزار تختیاں برطانوی ماہر آثار قدیمہ سر آسٹن لے یارڈ نے عاشوری دارالسلطنت نینوا کے کھنڈروں سے 1853 میں نکالی تھیں جہاں ان کے آخری تاجدار آشربانی پال کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ یہ اب برٹش میوزیم کی بے بہا دولت ہے۔ اس ذخیرے میں اس عہد کا ایک ادبی شاہکار منظوم داستان گلگامیش بھی ہے جس کا انگریزی ترجمہ این کے سینڈرس کے مقدمے کے ساتھ پنگوئن کے ادب عالیہ اشاعتی سلسلے میں بار بار شائع ہوکر مقبول عام ہوا۔ ان کے کچھ علمی جواہر پارے فراعین مصر نے حاصل کرکے اپنے شاہی دفاتر میں جگہ دی تھی جو وادیِ نیل کے قدیم شہر الامرناس کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ کیونی فارم حروف کی مقبولیت پندرہویں صدی ق م سے اس قدر عروج پر تھی کہ وادی فرات سے سواحل روم تک، فلسطین، شام، لبنان اور حتیوں کے دارالسلطنت بوغازکول جو موجودہ استنبول کے قرب میں واقع تھا یا قدیم ایران اور ایلم کے سرزمین ہر جگہ سے اس زمانے کے آثار ان حروف میں لکھی کتابیں برآمد کررہے ہیں۔

حتی قوم (Hittities) **کی تحریریں**

زمانہ پانچ سو سے دو ہزار ق م تک: ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) کے علاقے میں اس قوم کے آباد ہونے کا سب سے قدیم سراغ تین ہزار سال ق م سے ملتا ہے۔ ان کی قومیت اور زبان ہند یوروپی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے ان کی زبان میں اکثر ہندوستانی اور ایرانی الفاظ بہت قدامت سے پائے جاتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے ان کے یہاں دو خط رائج ہوئے، تصویری اور میخی۔ تصویری خط تین دور کا ہے مکمل تصویری خیالات۔ نیم تصویری اور آخری دو تصویری اظہار مطالب۔ ان ادوار کی تحریریں پتھر پر کھدی ہوئی ملی ہیں جن کی ایک سطر دائیں سے بائیں دوسری بائیں سے دائیں ہل چلانے کے طرز پر۔ تصویری خط میں ان کے یہاں چار سو پچاس معنوی علامتیں تھیں جن میں دو سو پچیس کثیر الاستعمال ہیں۔ بعد میں بابل عاشوری اثرات نے یہاں میخی خط رائج کردیا جو بابلی سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر گیلب نے ان کے خط میں ساٹھ رکنی علامات دریافت کی ہیں۔ بابلی خط میں کچھ علامتیں پورے لفظ یا ایک کلمے کے لیے موضوع تھیں اور بعض صرف ایک جز یا صوتی رکن کے لیے۔ پہلی صورت میں حتیوں نے بابلی خط کی علامتوں کو اصلی شکل میں اپنی زبان میں ترجمہ کرکے مستعمل کرلیا لیکن دو یا زائد رکنی علامتوں کے قائم مقام اپنی زبان کے الفاظ کے لیے نئی علامات وضع کیں۔ 1906 میں ڈاکٹر ہیوگو ونکلر (Dr. Hugs Winklar) نے بوغازکول کے کھنڈروں سے کھدائی کرکے میخی خط کی بیس ہزار تختیاں مٹی کی برآمد کیں جن کا زمانہ تحریر 1200 ق م سے 500 ق م تک برآمد ہوتا ہے۔ حتیوں کی تختیاں بمقابلہ بابلی عاشوری تختیوں کے سائز میں بہت بڑی ہیں۔ 717 ق م میں حتیوں کی طاقت کو زوال ہوا اور عاشوری حکمراں سارگون نے ان کو شکست دے کر ان کی سرزمین اپنی مملکت میں شامل کرلی۔ لیکن حتیوں کا خط 500 ق م تک باقی رہا۔

حتی کہ میخی خط کے علاوہ ایشیائے کوچک میں ایک اور پیکانی y خط کے آثار دریافت ہوئے ہیں جو قدیم ایرانی خط سے توسل رکھتا ہے۔ اس کی بہت سی تختیاں قدیم شہر قیصریہ کے آس پاس اور دوسرے مقامات پر ملی ہیں جن کے زمانہ تحریر کا اندازہ دو ہزار تین سو برس ق م کا لگایا جاتا ہے۔ ان میں سوا ایک تختی کے جو قوانین کا کتبہ ہے باقی سب تجارتی کاروبار سے متعلق ہیں۔ یہ تختیاں شامی تاجروں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ رسم خط عاشوریوں سے مشابہ ہے جس مقام پر یہ دستیاب ہوئی ہیں اس کا پرانا نام کیپاڈوشیا ہے۔ ■

ماخذ: کتاب کی تاریخ، مصنف: شایاں قدوائی، دوسرا ایڈیشن: 2019، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

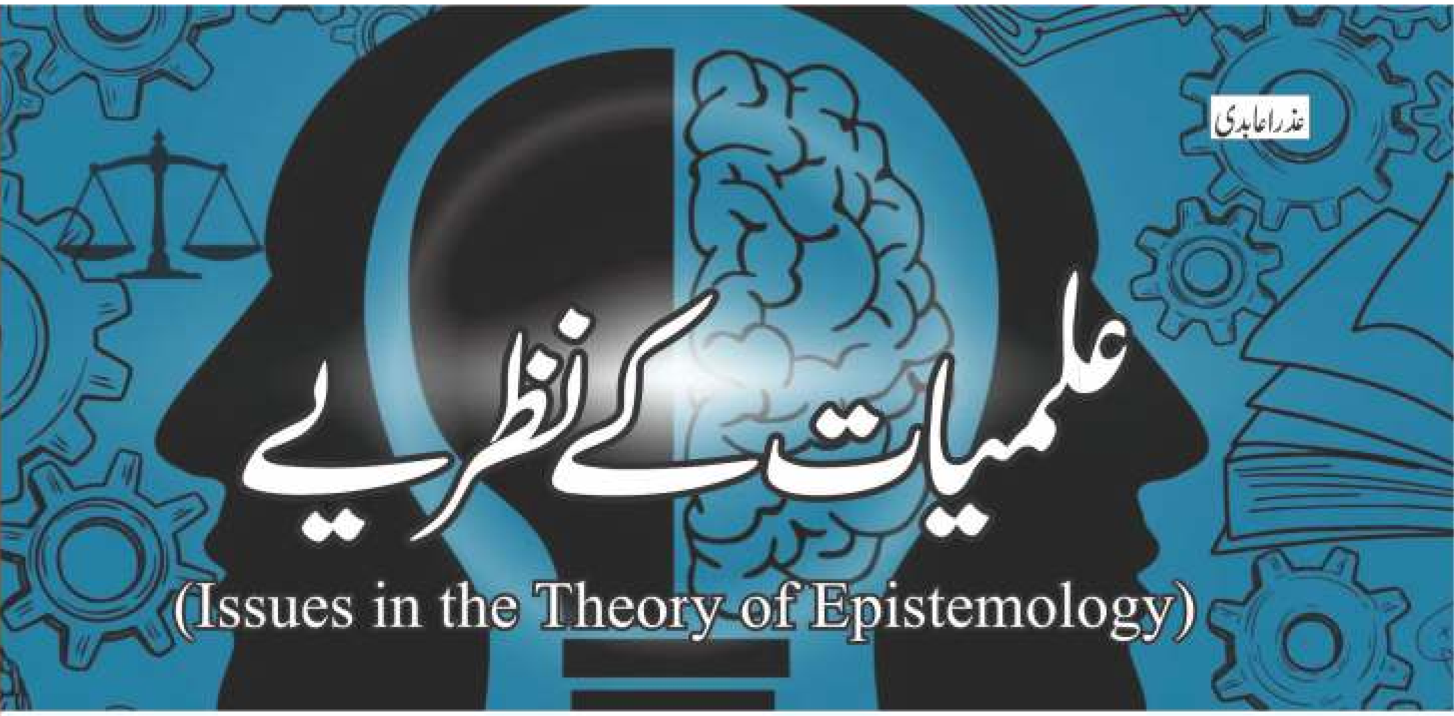

علمیات کے نظریے
(Issues in the Theory of Epistemology)

عذرا عابدی

روایتی طور پر فلسفے کے نفس موضوع میں منطق، مابعدالطبیعیات (Metaphysics)، طبیعیات (Physics)، اخلاقیات اور جمالیات وغیرہ جیسے موضوعات کو شامل کیا جاتا رہا ہے، جدید دور میں فلسفے کے خاص طور پر درج ذیل شعبے متعین کیے جاتے ہیں:

1. مابعدالطبیعیات (Metaphysics) سے مراد فلسفے کی وہ شاخ ہے جو اس بنیادی عنصر کے تفتیش سے متعلق ہے جو اس کائنات کی بنیاد میں مضمر ہے یعنی جس سے مادی دنیا پیدا ہوتی ہے، درحقیقت فلسفے کا تعلق شروع سے ہی اس فلسفیانہ تجسس کو جاننے سے رہا ہے۔ جو دانشور اس بنیادی عنصر کو طبیعی (مادی) مانتے ہیں وہ مادہ پرست کہلاتے ہیں جب کہ جو اسے روحانی مانتے ہیں انھیں روحانیت پرست کہا جاتا ہے۔ فلسفے کے اس شعبے میں بنیادی عنصر کے علاوہ مادہ، من، روح، دوبارہ جنم، خدا وغیرہ پر غور وخوض کیا جاتا ہے، پلیٹو، ارسطو، اور ہیگل نے فلسفے کے اس شعبے کو زیادہ اہمیت دی ہے اور فلسفے کی تعریف اسی بنیادی عنصر کو اساس مان کر کی ہے۔ مثال کے لیے ارسطو کے الفاظ میں 'فلسفہ وہ سائنس ہے جو بنیادی عنصر کی حقیقی شکل کی تلاش کرتا ہے۔''

2. علمیات (Epistemology) فلسفے کا دوسرا شعبہ علمیات ہے جس میں علم کی شکل، علم کے ذرائع اور علم کی سند وغیرہ پر غور کیا جاتا ہے۔ جو عالم علم کا ماخذ عقل مانتے ہیں انھیں عقلیت پسند کہا جاتا ہے، جب کہ تجربے کو علم کا ذریعہ ماننے والے عالم کو تجربیت پسند کہا جاتا ہے۔ کانٹ اور فشٹے نے فلسفے کو علم کے حصول اور اس کی نظر ثانی کو سائنس مانا ہے۔

3. علم الاقدار (Axiology) فلسفے کی یہ شاخ انسانی زندگی کی قدروں سے متعلق ہے اور ان قدروں پر منطقی، اخلاقی اور جمالیاتی نگاہ سے غور کرتی ہے، اس لیے اس شعبے میں منطق، اخلاقیات اور جمالیات اہم اجزا مانے جاتے ہیں۔ منطق سچائی سے متعلق ہے، اخلاقیات فلاح سے جب کہ جمالیات، جمال سے متعلق ہے۔

اگرچہ فلسفے کے درج بالا تینوں شعبے اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں تاہم سماجی علوم میں ہونے والی تحقیق کی نظر سے علم الاقدار کا مقام سب سے اوپر ہے۔ اسے علم کا ماخذ بھی کہا جاتا ہے، جدید دور میں فلسفیوں نے مابعدالطبیعیات اور علم الاقدار سے کہیں زیادہ اہمیت علمیات کو دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا، روح، بنیادی عنصر وغیرہ کو جاننے سے پہلے ہمیں جان لینا ضروری ہے کہ ہماری عقل ان کا علم حاصل کرنے میں اہل ہے یا نہیں، اگر اہل ہے تو کتنی؟ علمیات خاص طور پر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ علم اور صداقت کی سائنس ہے۔

علمیات میں علم کی شکل، علم کے ذرائع اور علم کے وثوق وغیرہ پر غور کیا جاتا ہے۔ جے این فیرر نے اپنی کتاب انسٹی ٹیوٹ آف میٹافزکس (1854) میں علم کے ذریعے، نوعیت اور سند سے متعلق عام جانچ کو علمیات (epistemology) کہا ہے۔ یہ لفظ یونانی زبان کے اپسٹیم اور لوگوز لفظ سے مل کر بنا ہے جس کا مطلب ہے 'علم کا سائنس' یا علم کی تفتیش اس لیے علمیات کو علم کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ کئی دانشوروں نے فلسفے کی تعریف میں علم کے ذرائع اور سند کو ہی بنیاد مانا ہے مثال کے طور پر کانٹ کے مطابق ''فلسفہ علم حاصل کرنے کے فن کی سائنس اور اس کی تنقید ہے۔ اسی طرح، فشٹے نے لکھا ہے کہ "فلسفہ علم کا سائنس ہے (Philosophy is a science of Knowledge) اسی طرح، علمیات میں حقیقت، غیر حقیقت، وثوق، بھرم، علم کی حد اور علم کی نوعیت وغیرہ کی تفتیش کی جاتی ہے۔

جدید علمیات میں یہ سوال کافی متنازع رہا ہے کہ حقیقت کے ذرائع کیا ہیں یعنی ہمیں علم حقیقت کا حصول عقل کے ذریعے یا تجربہ (حسی اعانت) کے ذریعے ہوتا ہے، عقل کو ہی علم کا ذریعہ ماننے والے نظریے کو عقلیت پرست کہا جاتا ہے، جب کہ تجربہ یا حسی اعضا کو ہی علم کا ذریعہ ماننے والے نظریات کو تجربیت پسندی کہا جاتا ہے۔

جدید فلسفے کے نئے دور میں کئی فلسفیوں جیسے ڈیکارٹ، اسپنوزا، لائبنز وغیرہ نے عقلیت پرستی کی تائید کی ہے جب کہ لاک، برکلے، ہیوم وغیرہ نے تجربیت پرستی کی حمایت کی ہے جرمنی فلسفی کانٹ نے دونوں کو یک رخی بتایا ہے اور علم کی تخلیق میں دونوں کو یکساں طور پر ضرور مانا ہے۔ ان کا نظریہ تنقیدی نظریے (Critical Theory) کے نام سے جانا جاتا ہے، اس طرح علمیات علم انسانی کی حد اور کسوٹی کا مطالعہ کرتی ہے۔

آج علم کے نظریے یا علمیات میں درج ذیل تین باتوں کو شامل کیا جاتا ہے:

(i) علم کا ذریعہ، عقلیت پرستی اور تجربیت پرستی کے باہم متضاد نظریوں کا تنقیدی مطالعہ۔

(ii) علم کا وثوق، حقیقت پسندی اور تصوریت یا مثالیت

کے تناظر میں علم کی توثیق کرنے کی کوشش۔

(iii) علم اور حقیقت کا نظریہ۔

درج بالا تفتیش سے واضح ہوجاتا ہے کہ علمیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جس میں علم سے متعلق سوالوں اور امور کی تفتیش کی جاتی ہے۔ اس میں خاص طور پر درج ذیل امور پر غور کیا جاتا ہے:

(i) علم کیا ہے؟ کیا ذی علم کا علم ممکن ہے؟ اگر نہیں تو علم کس کا ہوتا ہے؟ اگر علم شے کا ہوتا ہے تو وہ شے کیا ہے؟ کیا شے کا وجود علم کے بغیر بھی ممکن ہے؟ کیا شے کا وجود ذی علم کے وجود پر منحصر ہے؟ حقیقی اور غیر حقیقی علم کیا ہے؟

(ii) ذی علم کا علم سے کیا تعلق ہے؟

(iii) کیا علم کا مواد حقیقی بیرونی شے کی طرح ہوتا ہے یا ان دونوں میں کوئی فرق پایا جاتا ہے؟

(iv) یہ کیسے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا علم شے کا حقیقی علم ہے؟

(v) علم کے حدود کیا ہیں؟

(vi) علم کے ذرائع کیا ہیں؟

(vii) علم کی توثیق کیسے کی جاسکتی ہے؟ کون سا علم مستند ہے؟

(viii) علم کے عمل میں کون کون سی بھولیں ممکن ہیں؟

(ix) کیا حقیقت میں کوئی متعین علم ہوتا ہے یا علم کو متعین ماننا ہمارے ادراک اور روح پر مبنی ہے۔

(x) کچھ عقیدے دیگر عقیدوں سے زیادہ مستند مانے جاتے ہیں؟

(xi) علم کے مختلف طریقوں، ادراک، راست آگاہی، خیال وغیرہ میں کیا فرق ہے؟

(xii) علم کا سائنس سے کیا تعلق ہے؟

علم کی شکلیں اور اقسام (Forms and Types of Knowledge)

یونانی فلسفے میں علم کو ادراک (Perception) کہتے ہیں، لیکن علم کو ادراک کہنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ یہ مختلف افراد کے لیے لحاتی اور نسبتی ہوتا ہے۔ جو غذا یا پھل صحت مندی کی حالت میں میٹھا لگتا ہے، غیر صحت مندی اور بخار کی حالت میں ویسا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس علم ہمیشہ ہر فرد کے لیے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے، سقراط اور پلیٹو کے مطابق علم وہ ہے جو ہمہ گیر اور مستند ہے یعنی جو ہم آہنگ ہے نہ کہ متناقض (یعنی تضاد سے آزاد) (Knowledge means what is

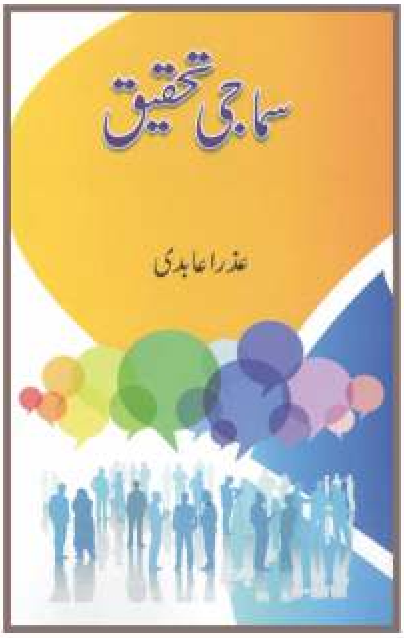

universal and valid that is consistent and free from contradiction) پلیٹو کے مطابق علم مطلق کے بارے میں محض شعور ہے اسے سمجھنے والے ذی علم سے اس کا آزادانہ وجود ہے۔ تجربیت پرستی کے نقطہ نگاہ سے علم کسی باہری شے کے تعین فکر کے نتیجے میں فروغ پاتا ہے۔ علم یا حقیقی ہوتا ہے یا غیر حقیقی، اگر ایک پاگل شخص جو تخیل کرتا ہے یا ایک نوزائیدہ بچہ جو دیکھتا ہے یا بے عقل جانور جو محسوس کرتا ہے اور ایک صحت مند شخص جو احساس کرتا ہے یکساں طور پر حقیقت ہے تو فطری طور پر کیا حقیقت ہے کیا اور غیر حقیقی اس میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر ہم ایک آنکھ کھلی رکھیں اور دوسری بند کرلیں تو ہم ایک آنکھ سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری آنکھ سے نہیں، لہٰذا ایک ہی شخص ایک ہی وقت پر جانتا بھی ہے اور نہیں بھی جانتا ہے، حتمی طور پر جو کسی کو سچ دکھائی دیتا ہے وہ اس کی مخالف شکل کو غیر حقیقی مان لیتا ہے۔ تجربیت پرست اور منطق پرستوں کے مطابق علم عقلی تجربہ یا تنظیمی تجربہ ہے، علم ایک منظم تجربہ ہے اور تجربہ بے جان اور رد عمل دونوں کو ہی شامل کرتا ہے، اس بندوبست کے عمل میں حافظہ، فکر اور منطق یا استدلال وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔

علم کئی طرح کا ہوتا ہے ہر طرح کے علم کے فروغ اور ترسیل کا مخصوص طریقہ ہوتا ہے، ہر ایک کی سماج کے ذریعے تسلیم شدہ قدر ہوتی ہے، سب سے اچھا علم وہ مانا جاتا ہے جو رسمی (باضابطہ) ہوتا ہے اور اس کی ترسیل کتابوں اور فکر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کی اہم شکلیں اور قسم درج ذیل ہیں:

(i) مابعد علم (Meta Knowledge): یہ علم ثقافتی اور فلسفیانہ عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔

(ii) ماحول (Milieu): یہ ماحول کے بارے میں علم فراہم کرتا ہے۔

(iii) اتفاقی علم (Contingent Knowledge): اس طرح کا علم کسی مخصوص ماحول سے نام نہاد اطلاع پر مبنی ہوتا ہے، یہ ایک طرح سے موقع پر سیکھنے لائق علم کی طرح ہوتا ہے۔

(iv) خاموش علم (Tacit Knowledge): اس طرح کا علم روایت اور تجربے پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی منتقلی تربیت کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔

(v) غیر رسمی اور رسمی علم (Informal and Formal Knowledge): غیر رسمی علم خاص طور پر زبانی نوعیت کا ہوتا ہے، لیکن اسے تحریری طور پر ترسیل کیا جاسکتا ہے، اس کے برعکس رسمی علم خاص طور پر نظریات اور فارمولوں کے طور پر تحریری طور پر دستیاب ہوتا ہے۔

(vi) راست اور بالواسطہ علم (Direct and Indirect Knowledge): راست علم وہ ہے جس کے ذریعے ہمیں کسی شے کا سیدھا علم حاصل ہوتا ہے اسے حسی اعضا کے ذریعے حاصل راست علم کہا جاتا ہے۔ بالواسطہ علم وہ ہوتا ہے جو کہ اشیا کے سیدھے رابطے سے نہ ہوکر کسی دیگر علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اندازہ یا شہادت بالواسطہ علم کے دو اہم ذرائع مانے جاتے ہیں۔ بالواسطہ علم کے حصول کے لیے استدلال یا منطق کی ضرورت ہوتی ہے۔

(vii) آلاتی علم (Instrumental Knowledge): اس طرح کا علم آلات اور ساز وسامان سے متعلق ہوتا ہے۔ اس طرح کے علم کی بنیاد غیر رسمی اور رسمی ہوسکتی ہے۔ اس کا استعمال زیادہ جدید تکنیکوں کو استعمال کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

ہیبر ماس (Hebermas) نے اپنے تنقیدی نظریے (Critical Theory) کے ڈھانچہ کے تجزیے کے لیے اپنی دو کتابوں (The Logic of the Social Sciences 1970) اور (Knowledge and Human Interest, 1970) میں علم کی عملی

ضرورتوں اور مفاد کی بنیاد پر درج ذیل تین شکلوں یا اقسام کا ذکر کیا ہے:

(i) تجرباتی، تجزیاتی علم (Empirical Analytical Knowledge): اس میں علم کی ان شکلوں کو شامل کیا جاتا ہے جو دنیا کے اصولوں کے مطابق خصوصیات کو سمجھنے سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح کے علم کا فروغ ماحول پر تکنیکی کنٹرول کے لیے کیا جاتا ہے۔ کام (Work) اسی طرح کے علم کا اہم ذریعہ مانا جاتا ہے۔

(ii) تفسیری تاریخی علم (Hermeneutic Historical Knowledge): اسی طرح کا علم معنی کو سمجھنے سے متعلق ہوتا ہے۔ اس طرح کے علم کا فروغ سماجی تعلقات کے تسلسل کے لیے دیگر افراد کی انفرادی حالتوں کی تفسیر کو سمجھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ زبان (Language) اس طرح کے علم کا اہم ذریعہ ہے۔

(iii) تنقیدی علم (Critical Knowledge): اسی طرح کا علم دباؤ اور غلبہ (Constraint and domination) کی حالتوں کو معلوم کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح کے علم کا فروغ مثالی خواہشات کے نتیجے میں غیر ضروری غلبے سے آزادی کے لیے ہوتا ہے۔ اقتدار (Authority) اسی طرح کے علم کا اہم ذریعہ ہے۔

علم کے ذرائع (Sources of Knowledge)

علم کے ذرائع کے بارے میں کئی رائے ظاہر کی گئی ہے، خاص طور پر انھیں دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا ان ماہرین کا ہے جن کا کہنا ہے کہ کل علم عقل پر مبنی ہوتا ہے۔ عقل پیدائش سے ہی حاصل ہوتی ہے اور اس کی قوت لامحدود ہوتی ہے، عقل کے ذریعہ ہی ہمیں مکمل وجود کا علم ہوتا ہے، کیونکہ وجود کا تعلق بنیادی طور پر عقل سے ہے۔ ڈیکارٹ اسپنوزا، لائبز وغیرہ ماہرین نے عقل کو ہی علم کا اہم ذریعہ مانا ہے، ان کی رائے کو عقلیت(Rationalism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عقلیت پسندوں کے مطابق من بے عمل نہ ہوکر متحرک ہوتا ہے اور سبھی بنیادی علم پیدائشی ہوتے ہیں، صرف عقل کے ذریعے متعین وجود اور ہمہ گیر علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ عقل ہی علم کی آخری سند ہے، مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقلیت علمیات کا وہ نظریہ ہے جس کے مطابق انسان کے حقیقی علم کا واحد ذریعہ عقل کو مانا جاتا ہے، لہٰذا سبھی علم مقدم یا پہلے (Prior) ہوتا ہے۔ عقل خود آگاہ، ہمیشہ سرگرم، تجربے سے عاری اور پیدائشی ہوتی ہے۔ جس طرح ریاضی کے قواعد ہمہ گیر اور لازمی ہوتے ہیں اسی طرح ہمارا سارا عقل پر مبنی علم بھی ہمہ گیر ہوتا ہے، عقلیت پسند ریاضی کو اپنا آئیڈیل مانتے ہیں اور منطق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اس لیے کبھی کبھی اس رائے کو ریاضیاتی عقلیت (Mathematical Rationalism) بھی کہا جاتا ہے۔

> تجربیت پرست اور منطق پرستوں کے مطابق علم عقلی تجربہ یا تنظیمی تجربہ ہے، علم ایک منظم تجربہ ہے اور تجربہ بے جان اور ردعمل دونوں کو ہی شامل کرنا ہے، اس بندوبست کے عمل میں حافظہ، فکر اور منطق یا استدلال وغیرہ سبھی شامل ہوتے ہیں۔

دوسری رائے ان ماہرین کی ہے جو تجربیت کو علم کی اہم بنیاد مانتے ہیں، لاک، برکلے، ہیوم وغیرہ عالموں کے ذریعے فروغ پانے والے اسی نظریہ کو تجربیت (Empiricism) کہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق انسان کے مختلف حسی اعضا کے ذریعہ احساسات حاصل ہوتے ہیں۔ تجربیت پسند پیدائشی علم کو قبول نہیں کرتے، کیونکہ پیدائش کے وقت بچے کا ذہن ایک خالی سلیٹ کی طرح ہوتا ہے جیسے جیسے وہ بیرونی دنیا کے رابطے میں آتا ہے احساس کے طور پر فکری عمل کے ذریعے اسے اشیا کا علم ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ تجربیت پسند کسی بھی ایسے مادے کو نہیں مانتے جو کہ تجربے سے ثابت نہ ہوتا ہو۔ تجربیت کے مطابق اشیا ہمارے تجربے کا موضوع ہیں اس لیے شے اور اس کے علم کے مواد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اشیا جیسی ہیں ویسی ہی دکھائی پڑتی ہیں اور جیسی دکھائی پڑتی ہیں ویسی ہی ہونی چاہیے۔ اشیا کا تجربہ انفرادی ہوتا ہے، سچ کا حصول بھی تجربے کے بعد ہی ہوتا ہے، مختصراً تجربیت علمیات کا وہ اصول ہے جو کل علم کا ذریعے بیرونی حسی اعضا کے ذریعے حاصل تجربے کو مانتا ہے، یہ کل علم کو تجربے کے بعد کا علم مانتا ہے، تجربیت پسندوں کے مطابق ہمارا علم آمد کے نظام سے وضع ہوتا ہے جیسے ہم رام، شیام اور موہن کو مرتے دیکھتے ہیں تو معلومات عامہ کو وضع کر لیتے ہیں کہ رام، شیام اور موہن چونکہ انسان ہیں اور انسان مرنے والی مخلوق ہے۔

درج بالا توضیح سے ظاہر ہے کہ عقلیت اور تجربیت علم کی توثیق کی دو باہم متضاد رائے ہیں۔ ان دونوں میں درج ذیل فرق پایا جاتا ہے:

(i) عقلیت کے مطابق حقیقی علم کا حصول صرف عقل سے ہوسکتا ہے، جب کہ تجربیت کا علم انھیں حسی اعضا سے حاصل کیا جاتا ہے۔

(ii) عقلیت کے مطابق علم کی بنیاد عقل ہے، جب کہ تجربیت کے مطابق علم کی بنیاد تجربیت ہے۔

(iii) عقلیت کے مطابق حقیقت تجربے سے پہلے ہے، جب کہ تجربیت کے مطابق حقیقت تجربے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

(iv) عقلیت کے مطابق علم میں ذہن یا من سرگرم ہوتا ہے، جب کہ تجربیت کے مطابق علم میں من بے عمل ہوتا ہے۔

(v) عقلیت کے مطابق علم کی حد عقل کی حد ہے، جب کہ تجربیت کے مطابق علم کی حد تجربے کی حد ہے۔

ایمینوئل کانٹ نے عقلیت اور تجربیت کے نظریوں کے نقائص کو دور کرکے دونوں کی خوبیوں کو مربوط کرتے ہوئے ایک نیا نظریہ قائم کیا جسے علم کا تنقیدی نظریہ (Critical theory of knowledge) کہا جاتا ہے۔ ان کے مطابق علم کو وضع کرنے میں عقل اور تجربہ دونوں ہی لازم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا کسی طرح بھی کام نہیں چل سکتا۔ عقل اگر لنگڑی ہے اور تجربہ اندھا ہے جس طرح کسی جنگل کو پار کرنے کے لیے اندھے اور لنگڑے دونوں کا ساتھ ساتھ مل کر چلنا ضروری ہے، اسی طرح علم کے میدان میں آگے بڑھنے کے لیے لنگڑی عقل اور اندھے تجربے کا ساتھ ساتھ رہنا ضروری ہے۔

کانٹ کے مطابق باہری دنیا سے ہماری حسی اعضا جو احساسات حاصل کرتے ہیں وہ علم کا کچا مال ہے

یہ احساسات بکھرے ہوئے منتشر اور بے معنی ہوتے ہیں، سب سے پہلے یہ عقل میں واقع دوشکلوں، مقام، اور وقت (مکان و زمان) کی مہر اپنے اوپر لگواتے ہیں اور پھر عقل میں واقع ڈھانچوں میں ڈھل کر مختلف قسم کے علم کو وضع کرتے ہیں۔ اسی لیے کانٹ نے تجربے کو علم کا مواد اور عقل کو دنیا کی شکل میں مانا ہے، ان دونوں سے ہمارے علم کی تخلیق ہوتی ہے، علم کے عمل میں درج ذیل تین قوتیں کام کرتی ہیں:

(i) حساس پذیری کی قوت (The Faculty of Sensibility) جیسے ہی ہم کسی شے کو دیکھتے ہیں تو اس کا مرئی ہونا ایک مخصوص مکان و زمان (Space time) کے حوالے سے ہوتا ہے، اس لیے سبھی دکھائی دینے والی حالتوں مکان و زمان کی دوشکل موجود ہوتی ہے۔

(ii) سمجھنے کی قوت (The Faculty of Understanding) کسی بھی شئے کے بارے میں سبب و اثر کے اصول ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ من میں مطلق طور پر تجربے کی کچھ علامات موجود ہوتی ہیں بیرونی مواد کو شکل خود من کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔

(iii) استدلال کی قوت (The Faculty of Reasoning) استدلال کی قوت کے ذریعے روح، دنیا اور ایشور شعور کے ان تین تصورات کی تشریح کی جاتی ہے۔ ہمارے من کی طاقت بکھرے ہوئے طاقت کا ارتباط کرتی ہے۔

معتبری یہ ثابت کرتی ہے کہ علم قابل اعتبار کلام کے ذریعے معتبر یا یقینی ہوتا ہے مسلک تشکیک کے مطابق کوئی حقیقی عمل ہوتا ہی نہیں، مسلک تشکک میں حافظے کو علم کی سب سے غیر یقینی بنیاد مانا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ علم جو ماضی سے حاصل ہوتا ہے اور مستقبل کی برتری قائم کرتا ہے صرف کورا نام ہے۔ باطنیت یا واصلیت (Mysticism) میں ادراک اور مباحثے پر مبنی فکر کو علم کا ایک اہم ذریعہ مانا جاتا ہے۔ مسلک ذہانت کے مطابق جسے ہم عام طور پر علم سمجھتے ہیں وہ منطقی، ناقابل فہم اور غلط ہوتا ہے۔ علم کے اہم ذرائع ضمنی عقیدے ہوتے ہیں جو فطری طور پر حقیقت کو غلط کردیتے ہیں۔ حقیقت کا علم حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ باطنی فہم ہے۔ منطقی عقلیت کے مطابق ہم علم کی یقینیت دیکھ اور سمجھ سکتے

علم قابل اعتبار کلام کے ذریعے ثابت یا یقینی ہوتا ہے۔ چونکہ انسان فطری طور پر تجویز کو اختیار کرلیتا ہے اور علم کی سبھی باتوں کو ثابت کرنے کی حالت میں نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ نظریہ زیادہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر افراد کی ایک بہت بڑی برادری کسی نظریے کے بارے میں مانتی ہے کہ وہ نظریہ صحیح ہے تو خیال طویل عرصے سے تسلیم ہوتے آئے اور اچھے اقتدار پر مبنی علم مان لیے جاتے ہیں۔ ہمارا زیادہ تر سائنسی علم شہرت پر مبنی ہوتا ہے۔

ہیں۔ علم میں منطقی نتیجے کی توثیق کی علامت ہوتی ہے۔ حسی تجربیت کے مطابق علم کا ذریعہ اور وثوق تجربے کے حسی تجربے کے پہلو سے دیکھا جاسکتا ہے۔

علم کی توثیق (Validation of Knowledge)

علمیات میں جو امور اٹھائے جاتے ہیں ان میں علم کی حقیقت اور توثیق کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم مانا جاتا ہے۔ علم کی توثیق کے بارے میں دو خیال رائج ہیں۔ ایک حقیقت (Realism) اور دوسرا، مثالیت (Idealism)، حقیقت کے مطابق علم ایک ایسی شے کی تلاش ہے جس کا سامنا ہمیشہ ذہن سے ہوتا ہے، اس میں اشیا کے اقدار کو تسلیم کیا جاتا ہے اور علم اور شے کو دو الگ الگ اقتدار مانا جاتا ہے۔ اس رائے کے مطابق ذی علم شئے کا بالواسطہ طور پر مشاہدہ کرتا ہے اور شئے کو ویسا ہی دیکھتا ہے جیسا کہ وہ رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشیا حقیقت میں ویسی یہ ہیں جیسا ہم انھیں دیکھتے ہیں اور ہم انھیں اسی شکل میں دیکھتے ہیں جیسی کہ وہ حقیقت میں ہیں۔ علمیاتی نقطہ نگاہ سے اس رائے کو شے ناوابستگی بھی کہا جاتا ہے۔ ہابس، ڈیکارٹ، لاک، ریڈ وغیرہ اس رائے کے حمایتی مانے جاتے ہیں۔

مثالیت پسند خود کے عنصر کی توثیق کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم ہر شے کے وجود میں شک کرسکتے ہیں، لیکن اپنے وجود کے تعلق سے کبھی شک نہیں کرسکتے۔ سوچنے کا عمل مفکر کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔ علمیاتی نقطہ نگاہ کی بنیاد پر جب مثالوں پر غور کیا جاتا ہے تو اسے اثباتیت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق بیرونی دنیا کی اشیا مادی نہ ہوکر ہمارے ذہن کا محض ادراک اور ہمارے ذہن سے آزاد ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ شے کا علم سے باطنی تعلق ہوتا ہے۔ گرین کے مطابق شعور نہ صرف فطرت کی تعمیر کرتا ہے بلکہ اس کی تخلیق کرتا ہے۔

جواز کاری کے نظریے کے تحت ہم کسی بھی مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کے جملے یا تعارف کی سچائی اور معنویت کی جانچ کرسکتے ہیں۔ یہاں پر کسی جملے کی سچائی کی کسوٹی اس کی بیرونی دنیا میں وجود کی توثیق کرتی ہے۔ سچائی اور غیر حقیقت کے لیے ہمیں بیرونی دنیا کا معائنہ کرنا پڑتا ہے، منطق کی بنیاد پر بھی علم کی حقیقت کی جانچ کی جاسکتی ہے۔

حقیقت اور مثالیت کے درمیان جو دشواری پیدا ہوجاتی ہے اسے کبھی کبھی انا مرکز مخمصہ (Ego-centric Predicament) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق ہم یہ کبھی بھی نہیں جان سکتے کہ اشیا اپنے آپ میں کیا ہوتی ہے۔ ہم صرف یہی جان سکتے ہیں کہ وہ کیسی دکھائی دے سکتی ہیں، جانے جاسکنے کے لیے موضوع، ایک معلوم موضوع ہے جس کا تعلق علم حاصل کرنے والے فرد کے ساتھ اقراری ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے، اس تعلق سے پرے وہ کیا ہوگا، کیونکہ جیسے ہی آپ جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیا ہے وہ آپ کے ساتھ اقراری تعلق قائم کرلیتا ہے۔ وہ ہمیشہ جانے جانے والی شئے ہوتی ہے، کوئی اپنے آپ میں آزاد شئے نہیں ہوتی۔

معتبری کے مطابق علم قابل اعتبار کلام کے ذریعے ثابت یا یقینی ہوتا ہے۔ چونکہ انسان فطری طور پر تجویز کو اختیار کرلیتا ہے اور علم کی سبھی باتوں کو ثابت کرنے کی حالت میں نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ نظریہ زیادہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر افراد کی ایک بہت بڑی برادری کسی نظریے کے بارے میں مانتی ہے کہ وہ نظریہ صحیح ہے تو خیال طویل عرصے سے تسلیم ہوتے آئے اور اچھے اقتدار پر مبنی علم مان لیے جاتے ہیں۔ ہمارا زیادہ تر سائنسی علم شہرت پر مبنی ہوتا ہے۔

■

ماخذ: سماجی تحقیق، **مصنف:** عذرا عابدی، **پہلی اشاعت:** 2018، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

جن کتابوں نے متاثر کیا

شوکت احمد ڈار

کتابیں پڑھنا دنیوی زندگی کا ایک بہترین عمل ہے۔ دنیا میں کچھ ایسی عظیم شخصیات بھی گزری ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کی۔ کتابیں انسانی فکر کو ارتقاء کی بلند منزلوں تک پہنچانے میں نمایاں رول ادا کرتی ہیں۔ کتب بینی سے جہاں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں ان کے مطالعے سے فکر میں بالیدگی، طبیعت میں نشاط و انبساط، نگاہوں میں تیزی اور ذہن و دماغ کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر انسانی ذہن پر گہرا نقش قائم ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ ان کتابوں کی گہرائی و گیرائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے فکر و خیال کی چھاپ ہمارے اوپر مستقل کسی نہ کسی حد تک موجود رہتی ہے۔ کونسل سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'اردو دنیا' نے منتخب کتابوں سے متاثر ہو کر قلمکار کو اپنی آرا دوسروں تک شیئر کرنے کے لیے ایک نیا انداز اپنایا ہے۔ جس میں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جن کتابوں نے آپ کو مطالعے کے دوران زیادہ متاثر کیا۔ ان کے ادبی پہلو اور معنوی محاسن اردو کے عام قارئین تک پہنچائیں۔ راقم الحروف نے بھی کچھ منتخب کتابوں سے متاثر ہو کر اردو زبان کے شائقین کو متعارف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

اگرچہ شعر گوئی اور مضمون نگاری کا ذوق مجھے وراثت میں نہیں ملا تھا، لیکن میں بچپن سے ہی شعر گوئی اور کتابوں کے مطالعے کو ایک بہترین عمل تصور کرتا تھا۔ مجھ میں زندگی میں جن کتابوں نے مطالعے کا شوق پیدا کیا ان میں سب سے پہلے علامہ اقبال کی مایہ ناز تصنیف 'کلیات اقبال' ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی جب میں نے تعلیم و تربیت کے لیے مختلف اسکولوں کی طرف رخ کیا تو وہاں دیواروں پر اقبال کے اشعار جلی حروف میں کندہ پائے۔ اس کے علاوہ جب بھی میں نے کسی استاد یا کسی مذہبی اسکالر کو تقریر کرتے ہوئے پایا تو دوران تقریر ان کی زبان سے علامہ اقبال کے اشعار سننے کو ضرور ملتے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا شیدائی ہونے لگا۔ یہ کتاب ایک صدی سے اردو میں شائع ہونے والی مقبول ترین کتاب ہے اور دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

کلام اقبال کے بعد اردو کے عظیم اور فلسفی شاعر مرزا غالب کے دیوان نے میرے دل کے اندر مطالعے کا شوق پیدا کیا۔ دیوانِ غالب کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے مشہور نقاد عبد الرحمٰن بجنوری نے یہاں تک لکھا ہے کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس اور دیوانِ غالب''۔ غالب کی شاعری میں جو تنوع ہے کسی اور کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے۔ غالب کا کلام آج بھی اتنی مدت گزرنے کے باوجود ایک نئی فکر اور ایک نیا احساس دے کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ غالب نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسے نئے نئے موضوعات بخشے اور اس میں ایک نیا رنگ و ڈھنگ پیدا کر کے اردو شاعری کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات جا بجا ملتے ہیں۔ غالب کا انداز بیان ہی ان کی شاعری کا وہ عنصر ہے جس نے ایک عالم کو گرویدہ کر لیا ہے۔ ان کا ڈکشن منفرد ہے۔ غالب کے ہاں فکر اور موضوع کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ کہ ان کے اسلوب میں تخیل کی بلند پروازی، تہہ داری اور فارسیت کا غلبہ ہونے کے باوجود ان کا کلام قاری کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔

اردو سوانح نگاری میں مولانا حالی نے اردو تنقید کی طرح سب سے پہلے خشتِ اول قائم کی تھی۔ شبلی نعمانی نے بھی کچھ کامیاب سوانح عمریاں لکھ کر اردو ادب میں ایک عظیم مرتبہ حاصل کیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اگرچہ مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کر کے درجنوں کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن ان سب میں نے جس کتاب کو پڑھ کر زیادہ اثر قبول کیا، وہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کی سوانح 'الفاروق' ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہے۔ جس کی مقبولیت اس حد تک ہوئی کہ فارسی، ترکی، انگریزی اور عربی زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ سوانح کے پہلے حصے میں حضرت عمر فاروق کے سلسلہ نسب، ولادت، بچپن، جوانی کے ایام، دور جاہلیت، قبولِ اسلام اور ہجرت، اسلامی خلافت کا انتخاب اور فتوحاتِ خلافت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ان کے انتظام سلطنت، ملک کی تقسیم، عہدے داران کا تقرر، انتظام اور تنخواہوں سے متعلق تفصیلات دی گئی ہیں۔

اردو تنقید نگاری میں اگرچہ حالی کو تنقید نگاری کا موجد مانا جاتا ہے لیکن تقابلی تنقید میں علامہ شبلی نعمانی کو ایک خاص دسترس حاصل ہے۔ شبلی کی تصنیف 'موازنہ انیس و دبیر' پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ اردو میں باقاعدہ طور پر تقابلی تنقید کا آغاز اسی تصنیف سے ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے دو عظیم مرثیہ نگاروں میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کا شاعری کے بعض اہم اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اس میں ان کی بعض اہم خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ شاعری اور معیار شعر کے بعد مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ بھی موجود

ہے۔ بعد ازاں انیس کی خصوصیات کا آغاز ہوتا ہے جس میں فصاحت و بلاغت، تشبیہ و استعارہ، صنائع بدائع، محاورہ کی تعریف کرتے ہوئے ان کا انطباق میر انیس کے کلام پر کیا گیا ہے۔ یہیں محاکات، واقعہ نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری جیسے عنوانات قائم کرتے ہوئے انیس کے کلام سے بحث کی گئی ہے اور دبیر و انیس کے کلام کا موازنہ اور تقابل ان خصوصیات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو سوانح نگاری میں سب سے معتبر نام مولانا الطاف حسین حالی کا ہے۔ حالی ہی کی بدولت اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد پڑی۔ انھوں نے اردو ادب کی تین معتبر شخصیات پر سوانح لکھ کر اردو میں ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔ ان تین سوانح عمریوں میں حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید قابل ذکر ہیں۔ حیات سعدی کو اردو کی اولین سوانح عمری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ 'یادگار غالب' ایسی کتاب ہے جو تقریباً غالب کی زندگی کے سبھی گوشوں کے بارے میں واقفیت فراہم کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ دوسری جانب یہ کتاب سوانحی کتب میں اپنے مواد اور اسلوب کے لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ یادگار غالب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ ان کی زندگی کے واقعات اور حادثات کو پیش کرتا ہے۔ جس میں تاریخ ولادت، خاندان، مسکن، سفر کلکتہ، اہل کلکتہ سے مجادلہ، قیام لکھنو، ملازمت سے انکار، قید ہونا، قلعہ سے تعلق، وظیفہ، قاطع برہان اور اس کا تنازع اور دیگر علوم و فنون کی واقفیت سے بحث ہے۔ اسی حصے کا دوسرا گوشہ مرزا کی شخصیت یعنی ان کے اخلاق و عادات، رہن سہن اور خورد و نوش پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کے اخلاق، شوخی بیان، مروت و خودداری پر خاص زور دیا گیا ہے۔ درمیان میں چھوٹے چھوٹے مزاح سے پر واقعات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اردو فارسی اشعار کو واقعات کے سیاق میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ مرزا کے منتخب کلام اور فارسی نظم و نثر پر ایک مکمل اور جامع تنقیدی تبصرہ ہے۔ حالی نے ایران کے بلند پایہ شعرا کے کلام کا موازنہ اور تقابل بھی غالب کے کلام سے کیا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر ایک مختصر تبصرہ غالب کی حیات اور انشاپردازی سے متعلق موجود ہے جسے حاصل کلام کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

'یادوں کی بارات' میں جوش نے جس انداز سے اردو شعرا کی پیکر تراشی کی ہے وہ شاید کسی اور شاعر نے نہ کی ہو۔ انہوں نے اس کتاب میں ساٹھ سے زائد اشخاص کی قلمی تصویریں کھینچ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جوش کو فن پیکر تراشی کے شرائط، لوازم اور پابندیوں کا بڑی حد تک ادراک حاصل تھا۔ منجملہ یہ کہ 'یادوں کی بارات' ایک ایسی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ جس میں جوش نے اپنی زندگی سے وابستہ ہر قسم کے ڈھکے چھپے احوال و کوائف درج کردیے ہیں اور اس عہد کی تہذیبی و معاشرتی مرقع نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔

اردو خود نوشت سوانح پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور شاید ایک دفتر میں بھی نہ سمائے۔ لیکن جس خود نوشت نے سب سے پہلے ذہن و قلب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی 'خود نوشت' ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ پڑھتے ہی ذہن اس بات کے لیے تیار ہوگیا کہ پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے، کیونکہ اس خود نوشت سوانح میں مولانا کے خاندان، سلسلہ نسب، تعلیم، گھر کے علمی آغوش میں پرورش حاصل کرنا، مولانا کا کتابیں پڑھنے کا شوق خصوصاً جب انھیں سرسید کا لٹریچر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ اس کتاب میں گھر کی تعلیمی سرگرمیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے والد کا حافظہ اور اپنی ذہانت کا احساس دلاتے ہیں۔ خود نوشت سوانح میں جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی بارات' کا مطالعہ کیا۔ جوش نے اس خود نوشت کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے مختلف زاویوں سے نگاہ ڈال کر ایک نیا انداز بیان اپنایا ہے۔ جوش نے اپنی اس سوانح میں اپنے عہد کی تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں کو درج کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی زندگی کے بیشتر واقعات کو موثر کن اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں مبالغے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے جوش کی شخصیت، نظریات اور عقائد کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتاب اردو خود نوشت سوانح عمریوں میں سب سے منفرد اور سب سے زیادہ دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جوش نے اس کتاب میں اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں، گمراہیوں، آوارگیوں، شرارتوں، معاشقوں پر خامہ فرسائی کرنے سے احتراز نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے زوال آمادہ خاندان اور معاشرے سے پردہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ہیں۔ غالباً کتاب کا ایک بڑا حسن قرار دیا جا سکتا ہے۔ 'یادوں کی بارات' میں جوش نے جس انداز سے اردو شعرا کی پیکر تراشی کی ہے وہ شاید کسی اور شاعر نے نہ کی ہو۔ انھوں نے اس کتاب میں ساٹھ سے زائد اشخاص کی قلمی تصویریں کھینچ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جوش کو فن پیکر تراشی کے شرائط، لوازم اور پابندیوں کا بڑی حد تک ادراک حاصل تھا۔ منجملہ یہ کہ 'یادوں کی بارات' ایک ایسی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ جس میں جوش نے اپنی زندگی سے وابستہ ہر قسم کے ڈھکے چھپے احوال و کوائف درج کر دیے ہیں اور اس عہد کی تہذیبی و معاشرتی مرقع نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر جوش کی شخصیت، زندگی، عہد اور ان کے کارناموں سے پوری آشنائی حاصل کی جا سکتی ہے اور ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سطح پر ایک اعلیٰ ترین فن پارے سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ہاتھ آ جاتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری میں مجھے سب سے زیادہ غالب کے بے تکلفانہ لکھے ہوئے خطوط نے متاثر کیا ہے۔

کیونکہ غالب اردو کے وہ عظیم شاعر اور مکتوب نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ایک نئی روش کے تحت اردو مکتوب نگاری کی بنیاد ڈالی۔ نیز غالب نے اپنے اردو خطوط میں جن موضوعات پر لب کشائی کی ہے ان میں کچھ کا تو ان کی ذاتی زندگی سے سروکار ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کے مسائل ومباحث خاص طور پر غدر سے پہلے اور غدر کے بعد دہلی کی ابتر حالت کا جو تذکرہ کیا ہے اس کے سوا کہیں اور نہیں ملتا۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر ان کے اردو مکتوبات میں نقوشِ گزراں کی متحرک تصویریں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ غالب کے خطوط کا شیدائی میں اس وقت ہونے لگا جب درس وتدریس میں مجھے غالب کے خطوط پڑھانے کا موقع میسر ہوا۔ تب ان خطوط کا یہ عالم تھا کہ چند ہی خطوط پڑھانے کے باوجود میں غالب کے دونوں مجموعوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ ان کے خطوط پڑھ کر اس بات کا بین ثبوت ملنے لگا، کہ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے اردو نثر میں بڑی لچک اور وسعت پیدا کر کے کئی اہم موضوعات کو اپنے خطوط میں قید کر لیا ہے۔ انھوں نے خطوط نگاری کے قدیم انداز کو ترک کیا اور اردو نثر کو قافیہ اور مسجع کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے، سادہ سلیس اور راست انداز میں مدعا بیان کرنے کی طرح ڈالی۔ تحریر کو تقریر کے قریب کردیا اور یوں 'مراسلے کو مکالمہ' بنادیا۔ غالب نے اپنے خطوط میں عصری زندگی کی ایسی عکاسی کی ہے۔ کہ وہ اپنے دور کی تاریخ بھی بن گئی ہے۔

اردو مکتوبات کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مایہ ناز تصنیف 'غبار خاطر' سے واقفیت حاصل ہوئی۔ مولانا آزاد کی تصانیف میں مذہبی موضوعات پر ان کی کتابوں میں 'ترجمان القران' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ ادبی اور علمی موضوعات پر سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت 'غبار خاطر' کو ہی حاصل ہوئی۔ مولانا صبح کے وقت اپنے صدیق مکرم کے الفاظ سے ہر خط شروع کر کے مختلف موضوعات پر گفت وشنید کر کے قیمتی جواہر پارے بکھیر دیتے ہیں۔ مولانا نے 'غبار خاطر' کے خطوط کو 'نج کے خطوط' کہا ہے اور ان خطوط میں مولانا نے اپنی زندگی کے تجربوں، قید وبند کی صعوبتوں اور دیگر مسائل سے متعلق شاعرانہ انداز میں بحث کی ہے۔ ان خطوط میں بظاہر مولانا آزاد کا تخاطب ان کے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی سے ہے۔ لیکن یہ تخاطب محض رسما ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو خطوط کی شکل دے دی ہے۔ انھوں نے خطوط میں 'چڑے چڑیا کی کہانی' اور 'حکایتِ زاغ وبلبل' اور چائے جیسے موضوعات کو بھی بہت ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ 'غبار خاطر' کے مطالعے سے مولانا کا وسیع مطالعہ، غیر معمولی قوت حافظہ مختلف علوم کے بارے میں ان کی معلومات، فارسی، عربی اور اردو پر ان کی پوری دسترس کا پتا چلتا ہے۔ بظاہر یہ ایک خطوط کا مجموعہ ہے لیکن اسے اردو ادب کے بہترین تاریخی، سیاسی، سماجی، فنی اور سوانحی مضامین کے ساتھ ساتھ انشاپردازی کا عمدہ نمونہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب میں طنزومزاح کو ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔اس صنف سے تعلق رکھنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے طنزیہ مضامین پڑھنے کاموقع ملا۔ مضامین رشید کے کچھ مضامین جن سے میں بے حد متاثر ہوا ان میں خاص طور پر 'الیکشن' اور 'چارپائی' قابل ذکر ہے۔

اردو ادب میں طنزومزاح کو ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اس صنف سے تعلق رکھنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے طنزیہ مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ مضامین رشید کے کچھ مضامین جن سے میں بے حد متاثر ہوا ان میں خاص طور پر 'الیکشن' اور 'چارپائی' قابل ذکر ہے۔ الیکشن مضمون میں مصنف نے بڑے دلچسپ انداز میں الیکشن کا نقشہ کھینچا ہے۔ جیسا کہ ووٹر کو لبھانے کے لیے امیدوار ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ الیکشن کے دوران مصنف مختلف امیدواروں کے بیچ میں پھنس جاتا ہے اور اس کی حالت بری ہو جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے طنزومزاح کا سارے نقادوں نے اعتراف کیا ہے۔ اور ان کے فن کا زیادہ انحصار ان کے فقروں اور بذلہ سنجی پر ہے۔ وہ دراصل الفاظ کے استعمال اور اپنے اسلوب سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔

پطرس بخاری کی کتاب 'پطرس کے مضامین' کا مطالعہ کیا۔ اس کا اشتیاق پیدا ہوا، اس وقت جب مجھے بارہویں جماعت کے نصاب میں شامل ایک مضمون 'مرحوم کی یاد میں' پڑھایا گیا۔ اس مضمون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا کے پردے میں ہزاروں ایسے چالاک، عیار ومکار اور دھوکے باز لوگ ہیں جو دوستی کی آڑ میں بھولے بھالے لوگوں کو ٹھگ لیتے ہیں اور اپنے دامن سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ اس کتاب میں کل گیارہ مضامین ہیں۔ ان میں 'سنیما کا عشق' اور 'سویرے جو آنکھ میری کھلی' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کا گہرا نقش آج بھی میرے ذہن پر قائم ہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلے انھوں نے اظہار عقیدت کے طور پر اپنے محسن ومربی استاد محترم سعید احمد صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے۔ پھر دیباچہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔ ''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی تو مجھ پر احسان کیا۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے، اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں''۔ غرض ان سارے مضامین کا انداز بیان ہی ایسا ہے کہ قاری پل بھر میں ہی پطرس کی ذہنی اپج اور افتادِ طبع سے واقف ہو کر مضامین کا مطالعہ ایک نئے جوش وجذبے کے ساتھ شروع کر دیتا ہے۔

■

Dr Showket Ahmad Dar
Gaddapora Shopian - 192231 (J & K)
Cell: 9419294917
Email:u.darshowkat@gmail.com

اردو زبان
جدید میڈیا اور نئی نسل

ایم جے وارثی

دنیا میں ہونے والی برق رفتار ترقیوں نے نہ صرف انسانی زندگی کو متاثر کیا بلکہ زبان وبیان اور تہذیب وثقافت کو بھی جدت آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان ترقیوں کے پس منظر میں جہاں طبّی معاملات اور طعام و قیام کے نئے نئے مسائل پر غور وخوض کیا جاتا ہے، وہیں وسائل علوم اور معلوماتی ذرائع کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ کیونکہ گلوبلائزیشن کے اس عہد میں بے شمار ناممکنات، ممکنات کے زمرے میں آچکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شعبہ ہائے زندگانی کے نت نئے مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس دور میں ہمارے زاویہ فکر میں تبدیلی آئی اور ہم مختلف طریقوں سے مستقبل کے مناظر کو بھی ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے مستقبل کے حالات کا جائزہ قیاس آرائیوں سے جڑا ہوگا، مگر جب حال سے مستقبل کو جوڑتے ہیں تو ان قیاس آرائیوں میں بہت سی حقیقتیں نظر آجاتی ہیں۔ اگر ہم گلوبلائزیشن اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے عہد میں فروغ اردو کے امکانات کا تجزیہ کریں گے تو بہت سی باتیں واضح ہوں گی اور ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ آئندہ اردو ٹکنالوجی کے سہارے کس حد تک اپنا مقام متعین کرے گی۔ کیونکہ اردو آج نئی نئی ایجادات کے سہارے فروغ پارہی ہے تو ظاہر ہے مستقبل میں ترقیوں کی رفتار کے پروں پر سوار ہوکر مزید آگے بڑھے گی، مگر اس کے لیے لازمی شرط ہے کہ اہل اردو جدید میڈیا کے بدلتے امکانات پر مسلسل غور وفکر کرتے رہیں۔

میڈیا کا نظام زبان کے معاملات سے جڑا ہوتا ہے۔ کیونکہ میڈیا میں اسلوب سے کہیں زیادہ زبان کا معاملہ مضبوط ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ میڈیا سے منسلک افراد زبان پر خاصی توجہ دیتے ہیں۔ پھر اس توجہ کا تعلق لغت سے کہیں زیادہ سماج سے ہوتا ہے۔ گویا سماج میں جس طرح کی زبان کی اہمیت ہوتی ہے، میڈیا کے افراد اسی طرح کی زبان تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اس کی زبان کو Language of demand کہا جاسکتا ہے۔ یہاں ٹھہر کر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میڈیا کی بگڑتی زبان کے لیے فقط میڈیا کو قصوروار تسلیم کرنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ میڈیا کے افراد اسی زبان کو ترجیح دیتے ہیں جیسی زبان معاشرے کے مطابق ہو۔ اب ہم یہاں ایک بات اور کرسکتے ہیں۔ اردو کی لفظیات کے مسئلے کو سامنے رکھیں۔ جب تک سامعین کو اردو الفاظ سمجھ میں آتے ہیں، اس وقت کہا جاتا ہے کہ یہ اردو ہے۔ اگر اردو سے جڑے ہوئے افراد مشکل لفظ استعمال کرلیتے ہیں تو اسے عربی سے قریب مان لیا جاتا ہے۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ جس سماج کے لیے ہم لکھتے ہیں، اس سماج کے افراد لفظوں سے غیر مانوس ہیں، اس لیے قدرے مشکل لفظ کو دوسری زبان سے جوڑ دیتے ہیں بلاشبہ لفظیات کا تعلق سماج کی نفسیات سے بھی ہوتا ہے۔

میڈیا سے منسلک افراد کو زبان کے تعلق سے ہمیشہ طعن وتشنیع کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ میڈیا والوں کی زبان خراب ہورہی ہے۔ مگر یہاں ٹھہر کر ہم یہ بھی محاسبہ کرسکتے ہیں کہ ہمارے ادیبوں کی زبان بھی خراب ہورہی ہے۔ جب ادیبوں کی زبان میں بازاری پن پیدا ہوجائے تو میڈیا کے افراد سے شکوہ کیسا؟ کیوں کہ میڈیا والوں کو زبان کے فروغ سے کہیں زیادہ کمیونیکیشن سے رشتہ رکھنا ہوتا ہے۔ جب کہ ادیبوں کا تعلق زبان اور ادب کے فروغ سے ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس زبان کی اہمیت ہوسکتی ہے، ویسی ہی زبان میڈیا والے بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ میڈیا سے منسلک افراد کی زبان پر اعتراض غیر منطقی ہے۔

مذکورہ باتوں کو ہم کچھ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میڈیا والوں کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی ہے۔ وہ فقط معاشرے میں رائج زبان سے استفادہ کرتے ہیں اور اسی زبان میں معاشرے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ گویا اگر میڈیا کی زبان کمزور ہورہی ہے اور اس میں نقائص پیدا ہورہے ہیں تو ہم اپنے معاشرے کو بھی سامنے رکھ سکتے ہیں کیونکہ انھیں افہام وتفہیم سے واسطہ ہوتا ہے۔

ایک ادیب کو زبان کی سطح پر بہت آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ جیسے چاہے، جس اسلوب میں چاہے، جن لفظیات کے سہارے چاہے، اپنے اندر کی بات لکھ سکتا ہے۔ اگر ادیب کا اسلوب گہرا ہے تو بھی اس پر کسی کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی ہے، بلکہ زبان کے اس گہرے پن کو ادیب کا اپنا اسلوب تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ادیب اپنی زبان میں آسانی پیدا کرلے تو اسے اس کا اسلوب کہہ دیا جاتا ہے۔ گویا ایک ادیب کا امتحان زبان کی سطح پر کم لیا جاتا ہے، مگر ایک صحافی کو زبان کے امتحان میں ہمیشہ پاس ہونا ہوتا ہے۔ اگر وہ بہت زیادہ نہ سہی، قدرے مشکل زبان لکھ دے تو لوگ اعتراض کردیتے ہیں۔ ایک صحافی کی زبان ادیب کی طرح نہیں ہوسکتی ہے، مگر ادب سے جڑے ہوئے لوگ صحافت کی زبان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں صحافت کی زبان کمزور نظر آتی ہے۔

میڈیا کی زبان میں آرٹ اور کرافٹ کے مسئلے کو بھی ملا سکتے ہیں۔ Art سے فن کاری جڑی ہوتی ہے مگر اس میں بہت زیادہ تجربات کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ جب کہ Craft میں آرٹ سے کہیں زیادہ تجربات کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادب سے جڑے افراد آرٹ پر توجہ دیتے ہیں اور میڈیا کے افراد کرافٹ سے رشتہ استوار کرتے ہیں۔ یہاں ادیب اور میڈیا کے افراد کا موازنہ کچھ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ ادیب کو معلومات فراہم کرنے میں بھی آزادی ہوتی ہے۔ وہ جیسی معلومات فراہم کرے، یا تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرے تو فکشن کہہ کر اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے، مگر میڈیا کے افراد پر یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ سماج کے مطابق زبان بھی بنائیں، ساتھ میں ٹھیک ٹھیک حقائق بھی پیش کریں۔ ظاہری بات ہے کہ ایک ادیب اس بات کا مکلف نہیں ہوتا ہے کہ وہ عوام کے مطابق زبان پیش کرے۔

جدید ٹکنالوجی سے اردو کو جوڑنے میں یونی کوڈ نے اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اسی کے سہارے اردو کا استعمال فیس بک، انسٹاگرام، واٹس ایپ، ٹویٹر، ای میل کے علاوہ دیگر سوشل نیٹ ورکس پر بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آن لائن یونی کوڈ کنورٹر نے بھی اردو کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ ان پیج سے یونی کوڈ اور یونی کوڈ سے ان پیج میں فائل تبدیل کرنے کی سہولت نے اردو کے فروغ کو یقینی بنایا ہے۔ اسی یونی کوڈ کی دین ہے کہ پی ڈی ایف فائل کے علاوہ سافٹ ویئر میں اردو کی کتابیں، خبریں، مضامین اور تقاریر ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اب آپ کو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے استعمال کے لیے کسی اور زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے پورے کمپیوٹر کو اردو میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ای میل، چیٹنگ، براؤزنگ سب اردو زبان میں کر سکتے ہیں۔ اردو یونی کوڈ کی ایجاد نے یہ ممکن کر دکھایا ہے۔ اب آپ گوگل یا کسی بھی سرچ انجن میں جا کر اردو میں ٹائپ کریں اور اردو میں جوابات حاصل کریں۔''[1]

اردو میں قرۃ العین حیدر کا اپنا اسلوب ہے۔ پریم چند کی زبان الگ نوعیت کی ہے۔ بیدی کی زبان میں پنجابیت ہے۔ کسی اور کی زبان میں کوئی اور کیفیت ہے مگر ملک بھر کے صحافیوں کو اپنے معاشرے کے لیے زبان تیار کرنا ہوتی ہے جو کہ ایک مشکل امر ہے۔ انھیں یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے، اپنی زبان بنائیں۔

لسانیات کے ماہروں نے بھی ساختیات اور نظامِ زبان کے مدنظر دو اہم بات میں کہی ہیں۔ ادب کی زبان کا تعلق Expressive سے ہوتا ہے۔ جس میں ہر طرح کے معاملات کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہر ادیب اپنا Narration تیار کرسکتا ہے۔ اپنے بیانیے میں کمی بیشی کرسکتا ہے۔ گویا طرزِ اظہار میں وہ اپنے من کے مطابق جملوں کو ڈھال سکتا ہے۔ مشکل یا آسان لفظوں سے کام لے سکتا ہے۔ مگر میڈیا کے افراد کو اس کی آزادی نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ان کی زبان کو Cognative کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں اطلاع اور ترسیل اہم ہوتی ہے۔ جب کہ ادیبوں کی زبان میں اطلاعات کی اتنی بڑی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ہر زبان میں مشکل سے مشکل اسلوب میں لکھنے والوں کو بھی ادیب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مشکل زبان لکھنے والے ادیبوں کے قارئین کم ہوتے ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے۔ مگر زبان کے تناظر میں کسی طبقے کو ذہن میں نہیں رکھنا ہوتا ہے۔ وہ جیسی زبان لکھ دے، اس کو کوئی نہ کوئی طبقہ ہاتھ آجاتا ہے جو اس کے ادب سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مگر میڈیا والے کے سامنے معاملہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اس تناظر میں یہ اقتباس دیکھیں:

انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کئی سطحوں پر متاثر ہوئی ہے اور اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا ہے۔ یونی کوڈ کے انقلاب کے بعد اردو سیکھنے کا رواج عام ہوا ہے۔ ہمیشہ اردو زبان کے رسم الخط کے متعلق بھی بات ہوئی اور آج بھی ہو رہی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو اپنے رسم الخط سے بھی زندہ ہے۔ کیونکہ اس کی ساخت یونی کوڈ کے عہد میں اسے ممتاز بناتی ہے۔

''اخبار پڑھنے والے علما بھی ہوتے ہیں اور عامی بھی۔ جن کا علم برائے نام ہوتا ہے۔ صحافتی زبان کو نہ اتنا دقیق ہونا چاہیے کہ عام آدمی کی سمجھ سے باہر اور نہ ہی اتنا بازاری کہ عالم کو اسے پڑھنے سے گھن آنے لگے۔''[2]

اس اقتباس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ میڈیا کے افراد کو نصیحت کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے، جس کو نصیحت کی جاتی ہے، اس پر ہمیں اشکال کرنے کا حق بھی ہوتا ہے۔ جب کہ کسی ادیب کو یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے کہ وہ کیسی زبان لکھے۔ اس لیے ادیب کو آزادی ہے کہ جیسے چاہے وہ لکھے، مگر ایک صحافی کو عوام اور معاشرے کے متعلق زبان بنانے میں توجہ دینی پڑتی ہے۔ لفظوں کو بار بار کاٹنا پڑتا ہے اور مناسب لفظ کے استعمال کے لیے غور و فکر کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے فقط یہ کہہ دینا کہ میڈیا کی زبان آسان ہوتی ہے، اس زبان میں ہر فرد لکھ سکتا ہے۔ گویا میڈیا والوں پر حقائق کو چھاننے اور زبان بنانے، دونوں کی ذمے داری ہوتی ہے۔ اس لیے میڈیا کی زبان کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے معاشرے کو نگاہ میں رکھنا لازمی ہے۔ ترسیلی نظام کو چست درست رکھنے میں ادیبوں سے کہیں زیادہ ایک صحافی کا کردار ہوتا ہے۔ یہاں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ترسیل میں ایک مشترکہ علامتی ماحول، سماجی رابطے یعنی اپنے سماج میں جن کے درمیان ہم ایک دوسرے کے ربط میں آتے ہیں، کبھی اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سہل معنوں میں ترسیل، پیغامات، خیالات اور دوسرے کے تئیں رابطے کے تبادلے پر منی ہے۔''[3]

انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کئی سطحوں پر متاثر ہوئی ہے اور اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا ہے۔ یونی کوڈ کے انقلاب کے بعد اردو سیکھنے کا رواج عام ہوا ہے۔ ہمیشہ اردو زبان کے رسم الخط کے متعلق بھی بات ہوئی اور آج بھی ہو رہی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو اپنے رسم الخط سے بھی زندہ ہے۔ کیونکہ اس کی ساخت یونی کوڈ کے عہد میں اسے ممتاز بناتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کے رسم الخط میں خود بہ خود کچھ نہ کچھ نیا ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ آج سوشل نیٹ ورک سائٹس پر بے شمار لوگ رومن رسم الخط میں اردو کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے استعمال سے اردو کا فائدہ کسی نہ کسی سطح پر

ضرور ہورہا ہے، مگر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اردو رومن استعمال کرنے والے تمام افراد ایک طرح سے رومن اردو لکھ رہے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے کہ ہر ایک کا رومن لکھنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ یہ الگ موضوع ہے کہ آخران کے الگ الگ طریقے سے لکھنے سے اردو کا کیا نقصان ہوگا یا بھلا، مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اردو رومن رسم الخط کا سلسلہ جاری ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے عہد میں یہ امکان ہے کہ آئندہ رومن میں اردو لکھنے والوں کا سلسلہ دراز ہوگا۔ اردو کو رومن میں لکھنے کے لیے باضابطہ کوئی کمیٹی تیار نہیں کی گئی، مگر ازخود رومن اردو کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس کے شروع ہونے میں ٹکنالوجی کا بھی عمل دخل ہے۔

اس کے علاوہ ٹکنالوجی کے استعمال سے اردو اسلوب بھی متاثر ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ کاغذ پر اردو لکھنے یا کتاب لکھنے والے اپنے متعینہ قاری کو ذہن میں رکھتے ہیں اور اپنے موضوع ومواد پر دھیان دیتے ہیں۔ اس لیے ایسے لکھنے والوں کا اسلوب الگ ہوتا ہے، مگر جب کوئی فرد سوشل سائٹس پر اردو لکھتا ہے تو اس کا اسلوب الگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسیج کو آسان بنانے اور قابل فہم رکھنے کے لیے اپنی زبان میں لچک پیدا کرتا ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کرتا ہے۔ اس طرح اردو اسلوب بھی متاثر ہوا ہے۔ امید ایسی ہی کی جاسکتی ہے کہ آئندہ سوشل نٹ ورکنگ سائٹس استعمال کرنے والوں کا اسلوب اور بھی زیادہ متاثر ہوگا۔ الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں اردو کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ سوشل سائٹس کے ذریعے اردو سے قریب ہونے کے بعد لوگوں میں اردو تہذیب کو جاننے کا شوق بھی پیدا ہوا ہے۔ گلوبلائزیشن کے عہد میں ہر فرد نئی تہذیب جاننے کا شوقین نظر آتا ہے۔ تہذیب کے تئیں لوگوں کو شوقین بنانے میں انفارمیشن ٹکنالوجی کا اہم کردار رہا ہے۔ ظاہر ہے جب عالمی سطح پر اردو کے تئیں لوگ متجسس ہوں گے تو اردو کا دائرہ وسیع ہوگا۔ میڈیا کے حوالے سے بھی لوگ اردو سے قریب ہوں گے۔ ادب اور تہذیب کے حوالوں سے بھی لوگ اردو کی طرف متجسس نظروں کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔ اس صورت حال میں اردو مزید فروغ پائے گی۔ گویا اکیسویں صدی میں اردو کے امکانات بہت ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کچھ مثبت ومستحکم

ادب سے جڑے لوگ صحافت سے قریب نہیں آتے ہیں۔ ظاہر ہے جب ادیب صحافت سے قریب نہیں آئیں گے تو صحافت سے بہترین زبان کی امید بھی فضول سی بات لگتی ہے۔ گویا آج کی اردو صحافت ادیبوں سے محروم ہوگئی ہے۔ اس لیے صحافت سے جڑے لوگ اپنی زبان پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔ جب تک ادب وصحافت کا اختلاط نہ ہوگا، اس وقت تک صحافت کی زبان میں معیار کی بات کرنا قدرے مشکل ہے۔

طریقے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔

اپنے اندر کی بات کو دوسرے تک آسانی سے پہنچانے کے لیے ہم تصنع نہیں برتتے ہیں، بلکہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں مفہوم اور ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ سماجی رابطے میں ہم ہمیشہ جیتے ہیں۔ اس لیے ایسی زبان کی اہمیت ہوتی ہے، جس میں بناوٹ نہ ہو۔ ظاہر ہے میڈیا والے جب معاشرے کے مطابق زبان کو ڈھالتے ہیں، اس میں ان کی فن کاری بھی شامل ہوتی ہے۔ گویا ایک اوسط درجے کی زبان میڈیا کی زبان ہوتی ہے۔

خاص طور پر یہاں میں اردو میڈیا کی زبان کی بات کروں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اردو میں زبان کو بہتر بنانے کے کیا طریقے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ ادب کے طالب علموں کی زبان بہتر کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔ ادب کے طالب علم بھی بھونڈی بھونڈی غلطیاں کررہے ہیں۔ ایسے میں میڈیا کی زبان کا محاسبہ بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ میڈیا کا سروکار عوام سے ہوتا ہے۔ عوام جس زبان کو سمجھ جائے، اسے سمجھانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

یہاں ایک بات اور یہ کہی جاسکتی ہے کہ کسی زبان میں صحافیوں کی زبان سن سن یا پڑھ پڑھ کر لوگ اپنی زبان درست کرتے تھے۔ لیکن یہاں مجھے یہ بات کہنے کی جازت ہونی چاہیے کہ اردو صحافت کی شروعات میں ادیبوں کا کردار رہا ہے۔ جو ادیب ہوتے تھے، وہی رسائل وجرائد نکالتے تھے۔ مولانا آزاد ادیب بھی تھے۔ حسرت موہانی ادیب بھی تھے۔ مولانا محمد علی جوہر ادیب بھی تھے۔ گویا ادیبوں نے صحافت کو مضبوطی عطا کی ہے۔

اب محاسبے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہم نے ادیب اور صحافیوں کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ ادب سے جڑے لوگ صحافت سے قریب نہیں آتے ہیں۔ ظاہر ہے جب ادیب صحافت سے قریب نہیں آئیں گے تو صحافت سے بہترین زبان کی امید بھی فضول سی بات لگتی ہے۔ گویا آج کی اردو صحافت ادیبوں سے محروم ہوگئی ہے۔ اس لیے صحافت سے جڑے لوگ اپنی زبان پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔ جب تک ادب وصحافت کا اختلاط نہ ہوگا، اس وقت تک صحافت کی زبان میں معیار کی بات کرنا قدرے مشکل ہے۔ یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا میڈیا والے ایسی زبان کا استعمال کرتے ہیں یا نہیں، جس سے ہم معانی سمجھ سکیں۔ میرا خیال ہے کہ سمجھنے والی زبان میڈیا والے لکھ رہے ہیں۔ یہاں ایک اقتباس دیکھیں:

''اگر لکھنے یا کہنے والے کی بات پڑھنے یا سننے والے کی سمجھ میں نہ آئے یا وہ پوری طرح نہ سمجھے یا غلط سمجھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زبان کے استعمال کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ یا تو لکھنے یا کہنے والا صحیح اور مناسب الفاظ استعمال نہیں کرسکا یا پھر پڑھنے یا سننے والا ان الفاظ کو سمجھ نہیں سکا۔''4

میڈیا والے ہمیں سمجھا پارہے ہیں۔ ہم ان کی باتوں کو سمجھ رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لغوی اعتبار سے میڈیا والوں کے یہاں غلطیاں ہوتی ہیں۔ محاوروں سے ان کی زبان دور ہے۔ ظاہر ہے ان غلطیوں کو دور کرنے کے لیے ایک ادیب کا صحافت سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔

میڈیا کی زبان میں بہتری لانے کے لیے ہمیں دو سطحوں پر کام کرنا لازمی ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ صحافت سے ادیب حضرات دوری نہ بنائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کو علم بیدار بنانا لازمی ہے۔ جب ان دونوں سطحوں پر کام ہونے لگے گا تو ضرور ہمیں میڈیا کی زبان میں سلاست وروانی اور ادبی چاشنی ملے گی۔

حواشی

1. اردو میڈیا، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2012، ص 351
2. سید ضیاء اللہ، اردو صحافت: ترجمہ وادارت، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 1996، ص 23
3. ایم جے وارثی، زبان وترسیل: اردو پرنٹ اور برقی میڈیا کا لسانیاتی مطالعہ، این سی پی یو ایل نئی دہلی 2015، ص 24-23
4. مسکین علی حجازی، صحافتی زبان، سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور 1984، ص 27

■

Prof. M J Warsi
Chairman, Department of Linguistics
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202002 (UP)
Mob.:9068771999
warsimj@gmail.com

مصنف: ماریو برگس یوسا
ترجمہ: نایاب حسن

ادب کیوں پڑھیں؟

ماریو برگس یوسا (Mario Vargas Liosa، پیدائش:1936) ہسپانوی زبان کے اہم ترین و رجحان ساز ادیب، ناول نگار، ڈراما نویس اور مضمون نگار ہیں۔ ان کے دودرجن سے زائد ناول، اتنے ہی مضامین کے مجموعے اور نصف درجن سے زائد ڈراموں کے مجموعے شائع شدہ ہیں۔2010 میں انہیں نوبل انعام برائے ادب سے نوازا گیا تھا۔طاقت و اقتدار کے ڈھانچوں کی بے تعصبانہ نقشہ کشی اور سماجی و سیاسی جبر کے خلاف فرد کی مزاحمت، بغاوت اور شکست وغیرہ کی عکاسی ان کے فکشن کا نمایاں وصف ہے۔ نوبل کے علاوہ انہیں اسپین، آسٹریا، چلی، پناما، امریکہ، فلپائن، اٹلی، چین،فرانس، جاپان، جرمنی، میکسیکو، برطانیہ اور سوئزرلینڈ وغیرہ کی حکومتوں اور ادبی اداروں کی جانب سے بھی درجنوں ادبی و شہری اعزازات مل چکے ہیں۔ان کے فکشن/نان فکشن کے ترجمے دنیا کی چالیس سے زائد زبانوں میں کیے گئے ہیں۔یوسا سیاسی ایکٹیوزم کے حوالے سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں اور1990میں پیرو کے صدارتی انتخاب میں بھی حصہ لیا۔14/اپریل2025 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ زیرنظر تحریر Why Literature? کے عنوان سے مشہور امریکی میگزین 'دی نیو ریپبلک' میں شائع شدہ ان کے مضمون کا ترجمہ ہے۔

میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کتاب میلوں یا کسی بک اسٹور میں کوئی شریف سا آدمی میری طرف بڑھتا ہے اور مجھ سے آٹوگراف مانگتا ہے۔ وہ کہتا ہے: 'میری بیوی، بیٹی یا میری ماں آپ کے آٹوگراف کی خواہاں ہے، وہ بہت مطالعہ کرتی اور ادب سے محبت کرتی ہے'۔ میں فوراً پوچھتا ہوں: 'اور اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ کو مطالعہ کرنا اچھا نہیں لگتا؟'، تو جواب تقریباً ہمیشہ یکساں ہوتا ہے: 'مجھے مطالعہ کرنا اچھا تو لگتا ہے؛ لیکن میں بہت مصروف آدمی ہوں'۔ میں نے یہ اعتذار درجنوں بار سنا ہے، گویا اس آدمی اور اس جیسے ہزاروں دیگر آدمیوں کے پاس زندگی میں اتنے اہم کام، اتنی ذمے داریاں، اتنے مشاغل ہیں کہ وہ کسی ناول، شعری مجموعہ یا ادبی مضامین کے مطالعے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ اس عمومی تصور کے مطابق گویا ادب ایک غیر ضروری قسم کی سرگرمی ہے۔ یہ فی نفسہ بلند مرتبت، حساسیت اور اچھے اخلاق کو فروغ دینے کے لیے مفید تو ہے؛ لیکن بنیادی طور پر یہ ایک تفریحی عمل ہے، سامانِ آرائش ہے، جو تفریح و تزئین کا ذوق رکھنے والے لوگوں کے لیے ہی مناسب ہے۔ یہ فلموں، برج یا شطرنج جیسے کھیلوں کے ضمن میں فٹ ہونے والی چیز ہے اور کشاکشِ زندگی کی دوسری ناگزیر ترجیحات سے جب اس کا ٹکراؤ ہو تو اسے بلا کسی جھجھک قربان کیا جا سکتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ادب زیادہ سے زیادہ خواتین کی سرگرمی بن گیا ہے۔ کتابوں کی دکانوں میں، کانفرنسوں میں یا ادبا کی عوامی مطالعاتی محفلوں میں، یہاں تک کہ یونیورسٹیز کے علوم انسانی کے شعبہ جات میں واضح طور پر خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اس صورتِ حال کی روایتی طور پر یہ توضیح کی جاتی ہے کہ متوسط طبقے کی خواتین زیادہ پڑھتی ہیں؛ کیونکہ مردوں کے مقابلے میں ان کے کام کا دورانیہ کم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مردوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ وقت خیالی و تصوراتی دنیا (مطالعۂ ادب) کے لیے وقف کر پاتی ہیں۔ مجھے کسی حد تک ان توضیحات سے الرجی ہے جو مردوں اور عورتوں کو منجمد زمروں میں تقسیم کرتی ہیں اور ہر جنس کو اس کی خصوصیات اور خامیاں بتاتی ہیں؛ لیکن اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ادب کے قارئین کی تعداد قلیل تر ہے اور اس قلیل تر میں بھی کثیر تعداد خواتین کی ہے۔

تقریباً ہر جگہ یہی حال ہے۔ مثال کے طور پر اسپین میں، جنرل سوسائٹی آف ہسپانوی رائٹرز کے زیر اہتمام ایک حالیہ سروے نے انکشاف کیا ہے کہ اس ملک کی نصف آبادی نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ سروے میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ کتاب خواں اقلیت میں، پڑھنے کا اعتراف کرنے والی خواتین کی تعداد مردوں کی تعداد سے 6.2 فیصد زیادہ ہے اور یہ فرق روز افزوں ہے۔ میں مطالعے سے دلچسپی رکھنے والی خواتین کی بڑھتی تعداد سے خوش ہوں؛ لیکن میں ان مردوں اور ان کروڑوں انسانوں کے تئیں متفکر ہوں، جو پڑھ تو سکتے ہیں؛ لیکن نہ پڑھنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

مجھے نہ صرف اس وجہ سے ان پر ترس آتا ہے کہ وہ پڑھنے کی خوشی سے محروم ہیں؛ بلکہ اس لیے بھی کہ مجھے یقین ہے کہ ایک ایسا سماج جس میں ادب کا وجود نہیں ہوتا یا ایک ایسا سماج جس میں ادب کو معاشرتی

اور ذاتی زندگی کے حاشیے پر ڈال دیا جاتا ہے، وہ محض جانداروں کے ایک گروہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ ایک ایسا سماج ہوتا ہے جس کے اندر وحشیانہ پن آجاتا ہے اور وہ روحانی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے۔ میں ادب برائے تفریح و تعیش کے خلاف ہوں اور میرا یہ یقین ہے کہ ادب ایک بنیادی اور ضروری ذہنی عمل ہے، جدید، جمہوری اور آزاد افراد اور شہریوں پر مشتمل معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک ایسی سرگرمی ہے، جس کا کوئی متبادل نہیں۔ اب میں اپنے اس نظریے کی تائید میں کچھ دلائل پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی شاندار ترقی اور اس کے نتیجے میں علم کی لاتعداد فروعات اور حصوں میں تقسیم ہونے کی بدولت ہم اس وقت اختصاصِ علم کے دور میں جی رہے ہیں۔ اس ثقافتی رجحان (اگر اس کی کچھ حقیقت ہے) کے آنے والے سالوں میں بڑھتے رہنے کا امکان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی بھی شعبے میں مہارت بہت سے فوائد لاتی ہے۔ یہ گہری جستجو اور بڑے تجربات کو بڑھاوا دیتی ہے اور یہ گویا ترقی کی گاڑی کا انجن ہے، اس کے باوجود اس کے منفی نتائج بھی سامنے آتے ہیں؛ کیونکہ یہ ان مشترکہ فکری اور ثقافتی امتیازات کو ختم کر دیتی ہے جو مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، بات چیت کرنے اور یکجہتی و ہم آہنگی کا شعور بخشتے ہیں۔ یہ اختصاص سماجی فہم کی کمی کا باعث بنتا ہے، انسانوں کو ٹیکنیشینز اور ماہرین کے گھیٹوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اختصاصِ علم کے لیے مخصوص زبانوں اور مبہم علامتوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ کیونکہ معلومات زیادہ سے زیادہ مخصوص اور منقسم ہوتی جاتی ہیں۔ یہ وہ خاصیت اور تقسیم ہے جس کے خلاف ایک پرانی کہاوت نے ہمیں متنبہ کیا تھا: شاخ یا پتوں پر اتنی زیادہ توجہ نہ دیں کہ آپ یہ بھول جائیں کہ وہ درخت کا حصہ ہیں یا درخت پر اتنی زیادہ توجہ نہ دیں کہ آپ بھول جائیں کہ وہ جنگل کا حصہ ہے۔ جنگل کے وجود کے بارے میں آگاہی عمومیت کا احساس پیدا کرتی ہے، اپنائیت کا احساس، جو معاشرے کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے اور اسے بے شمار انانیت پسندانہ خصوصیات میں بکھرنے سے روکتا ہے۔ قوموں اور افراد کی انانیت پسندی خبطِ عظمت اور گرد و پیش سے بے خبری کی صفت پیدا کرتی ہے، حقیقت کو مسخ کرتی ہے جو نفرت، جنگیں، حتیٰ کہ نسل کشی تک کا سبب بنتا ہے۔

علم کی لامحدود ثروت مندی اور اس کی ارتقائی رفتار کی وجہ سے ہمارے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی ایک ارتباطی کردار ادا نہیں کر سکتیں، جس کی بنا پر اختصاص اور اس کے ابہامات نے جنم لے لیا ہے؛ لیکن ادب پہلے بھی اور آئندہ بھی جب تک اس کا وجود ہے، انسانی تجربے کی ایسی مشترک قدروں میں سے ایک رہے گا، جن کے ذریعے انسان اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے اور ایک دوسرے سے مکالمہ قائم کر سکتا ہے، چاہے اس کا پیشہ، زندگی کے منصوبے، جغرافیائی و ثقافتی مقامات، ذاتی حالات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ ادب نے بہت سے افراد کو ان کی زندگی کی مختلف خصوصیات کی وجہ سے تاریخ اور زمانے سے آگے بڑھنے کے قابل بنایا ہے۔ سروینٹس، شیکسپیئر، دانتے اور ٹالسٹائی کے قارئین کے طور پر ہم مختلف زمان و مکان میں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور خود کو ایک ہی انسانی صنف کا رکن محسوس کرتے ہیں؛ کیونکہ ان ادیبوں کی تخلیقات سے ہم وہ چیزیں سیکھتے ہیں جو بطور انسان ہم سب میں پائی جاتی ہیں، جو ہم سب میں جزوی اختلافات کے باوجود وسیع تر پیمانے پر مشترک ہوتی ہیں۔ انسان کو تعصب، نسل پرستی، مذہبی یا سیاسی فرقہ واریت اور قوم پرستانہ حماقتوں کے خلاف اس سچائی سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں بچا سکتی، جو ہمیشہ عظیم ادب پاروں میں نظر آتی ہے؛ یعنی یہ کہ تمام قوموں اور ملکوں کے مرد اور عورت بنیادی طور پر برابر ہیں اور یہ کہ ناانصافی ان کے درمیان امتیاز، خوف اور استحصال کے بیج بوتی ہے۔

> میں ادب برائے تفریح و تعیش کے خلاف ہوں اور میرا یہ یقین ہے کہ ادب ایک بنیادی اور ضروری ذہنی عمل ہے، جدید، جمہوری اور آزاد افراد اور شہریوں پر مشتمل معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک ایسی سرگرمی ہے، جس کا کوئی متبادل نہیں۔

ادب ہمیں سکھاتا ہے کہ انسانی دنیا کے نسلی و ثقافتی تنوعات دراصل نوعِ انسانی کی قیمتی میراث ہیں اور یہ دراصل انسان کی کثیر جہتی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اچھے ادب کا مطالعہ ایک خوش کن تجربہ تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی یہ عمل ہمیں خودی کا عرفان بخشتا ہے، روزمرہ اعمال، خوابوں، خیالوں، تنہائیوں، ایک دوسرے سے مربوط رشتوں، عوامی شبیہ اور خفیہ شعوری مراحل کے حوالے سے ہماری انسانی خوبیوں اور خامیوں سے بھی ہمیں آگاہ کرواتا ہے۔

بقول یسعیاہ برلن (Isaiah Berlin) متضاد سچائیوں کا یہ پیچیدہ مجموعہ ہی انسان کے سراپائے اصلی کا مادہ و جوہر ہے۔ آج کی دنیا میں انسان کا یہ مکمل اور زندہ علم صرف ادب میں پایا جاتا ہے۔ انسانی علوم کی دوسری شاخیں مثلاً فلسفہ، تاریخ، آرٹس اور سماجی علوم بھی اس مربوط نقطۂ نظر اور اس عالمگیر مکالمے کو برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں رہی ہیں۔ ہیومینٹیز نے بھی علم کی کینسر زدہ تقسیم در تقسیم کا شکار ہو کر خود کو تیزی سے منقسم اور تکنیکی شعبوں میں محدود کر لیا، جن کے تصورات و الفاظ عام انسان (عورت اور مرد) کی پہنچ سے باہر ہیں۔ کچھ ناقدین اور ماہرین ادب کو بھی سائنس میں تبدیل کرنا چاہیں گے؛ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوگا؛ کیونکہ افسانے کا وجود صرف تجربے کے کسی ایک دائرے کی چھان بین کے لیے نہیں ہوتا، یہ تخیل کے ذریعے مکمل انسانی زندگی کو ثروت مند بنانے کے لیے ہوتا ہے، جسے نہ ختم کیا جا سکتا ہے، نہ منتشر کیا جا سکتا ہے اور نہ پیہم زیرِ عمل منصوبوں اور اصولوں کے سلسلے میں محدود کیا جا سکتا ہے۔ پروست (Proust) کا کہنا ہے کہ: 'حقیقی زندگی، روشن اور آشکار زندگی، وہ زندگی جو بھرپور طریقے سے گزاری جاتی ہے، وہی ادب ہے'۔ اس کا یہ قول مبالغہ آرائی پر مبنی نہیں ہے اور نہ صرف اپنے پیشے سے محبت کا اظہار ہے۔ اس کے کہنے کا اصل مطلب یہ ہے کہ ادب (لکھنے پڑھنے) کے نتیجے میں زندگی کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اسے بہتر طریقے سے جیا جا سکتا ہے اور یہ کہ زندگی کو بھرپور طریقے سے جینا اور اسے دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا زیادہ ضروری ہے۔

ادب ہی انسانوں کے درمیان برادرانہ ربط قائم کرتا ہے، انھیں مکالمے میں شمولیت پر مجبور کرتا ہے، ایک مشترکہ اصل و مقصد سے آگاہ کرتا ہے اور تمام وقتی

رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ ادب ہمیں ماضی کی سیر کرواتا ہے اور ان لوگوں سے ملواتا ہے، جنھوں نے اپنی ان تحریروں کے ذریعے جو ہم تک پہنچی ہیں؛ عہدِ گزشتہ کی منصوبہ بندی کی، اس عہد کا لطف اٹھایا اور خواب دیکھے، ایسی تحریریں آج بھی ہمیں حظ پہنچاتیں اور خواب دیکھنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ وقت اور جگہ کے اجتماعی انسانی تجربے کا حصہ بننے کا یہ احساس ہی کسی ثقافت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اور نسلاً بعد نسلٍ اس کی تجدید صرف ادب کے ذریعے ہوتی رہی ہے۔

جب بھی بورخیس (Borges) سے پوچھا جاتا کہ 'ادب کا کیا فائدہ ہے؟' تو وہ جھنجھلا جاتا تھا۔ یہ اسے ایک احمقانہ سوال لگتا تھا، جس کا وہ یہ جواب دیتا تھا کہ: 'کوئی بھی یہ نہیں پوچھتا کہ کینری کے گانے یا غروبِ آفتاب کے خوبصورت منظر کا کیا فائدہ ہے'۔ اگر ایسی خوبصورت چیزیں موجود ہیں اور اگر ان کی وجہ سے زندگی ایک لمحے کے لیے بھی کم بدصورت اور کم اداس لگتی ہے، تو کیا اس کے لیے عملی جواز تلاش کرنا حماقت نہیں ہے؟ لیکن ادب کے تعلق سے یہ سوال بہرحال اچھا ہے؛ کیونکہ ادب (فکشن اور شاعری) پرندوں کی چہچہاہٹ یا دور افق میں ڈوبتے سورج کے منظر کی طرح نہیں ہوتا؛ کیونکہ یہ اتفاقاً یا فطرت کی تخلیق نہیں ہوتا، انسانی تخلیق ہوتا ہے اور اس لیے یہ پوچھنا جائز ہے کہ اس کا وجود کیسے اور کیوں کر ہوا اور اس کا مقصد کیا ہے اور وہ (یا اس کے اثرات) عرصۂ دراز تک کیوں باقی رہتے ہیں؟

ادبی تخلیقات ایک مصنف کی شعوری مصاحبت میں بے شکل پیکروں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، ان کے اندر لاشعور کی مشترکہ طاقت، مصنف کی اپنے اردگرد کی دنیا کے تئیں حساسیت اور اس کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں، جنھیں شاعر یا راوی مختلف النوع الفاظ سے جوجھتے ہوئے آہستہ آہستہ شکل، پیکر، حرکت، ردھم، آہنگ اور زندگی عطا کرتا ہے۔ ایک مصنوعی زندگی یقینی طور پر ایک خیالی زندگی ہوتی ہے، ایسی زندگی جو محض زبان و الفاظ سے وجود پذیر ہوتی ہے، پھر بھی مرد و خواتین اس زندگی کی جستجو کرتے ہیں، کچھ تو اکثر و بیشتر، جبکہ کچھ وقفے وقفے سے؛ کیونکہ حقیقی زندگی ان کے لیے ناقص و محدود ہوتی ہے، انھیں وہ کچھ پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہے، جو وہ دل سے چاہتے ہیں۔ ادب محض ایک فرد کی تخلیقات سے وجود میں نہیں آتا، یہ تب وجود میں آتا ہے جب دوسرے لوگ بھی اسے اپناتے ہیں اور جب یہ سماجی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے، جب یہ مطالعہ و کتب بینی کے عمومی ماحول کی بدولت ایک مشترکہ انسانی تجربہ بن جاتا ہے۔

اس کا پہلا نفع بخش اثر زبان کی سطح پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم تحریری ادبی سرمایے سے محروم ہے، تو اس کے اجتماعی احساسات و تخیلات کے اظہار میں درستگی، نزاکت و لطافت اور وضاحت کے عناصر کم ہوں گے، جبکہ اس قوم کے اظہار میں یہ عناصر بخوبی پائے جاتے ہیں، جس کے پاس ابلاغ و ترسیل کا بنیادی وسیلہ یعنی ثروتِ الفاظ موجود ہے، جسے وہ ادبی متون کے ذریعے مسلسل پروان چڑھاتی ہے۔ مطالعہ نہ کرنے والا انسانی معاشرہ ادب سے اچھوتا، بہرا، گونگا اور ہکلا ہوگا، جو اپنی خام اور بنیادی زبان میں محصوری کی وجہ سے مواصلات کے زبردست مسائل سے دوچار ہوگا۔ یہی معاملہ افراد کا بھی ہے، وہ شخص جو بالکل نہیں پڑھتا یا کم پڑھتا ہے یا صرف بکواس چیزیں پڑھتا ہے، وہ بھی اسی قسم کے عوارض کا شکار ہوگا۔ وہ بک بک تو خوب کر سکتا ہے، مگر کام کی بات کم ہی کرے گا؛ کیونکہ اس کے پاس جو ذخیرۂ الفاظ ہے، وہ شستہ و کارآمد اظہارِ خیال کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

مطالعے سے دوری کی وجہ سے صرف زبان و الفاظ کی محدودیت کا مسئلہ پیش نہیں آتا، یہ ذہن و تخیل کو بھی محدود کر دیتی ہے اور فکری افلاس کا بھی سبب بنتی ہے، اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ وہ خیالات و تصورات جن کے ذریعے ہم اپنی حالت کے سربستہ رازوں کو سمجھتے ہیں، وہ الفاظ کے علاوہ کوئی اور وجود نہیں رکھتے اور ہم اچھے ادب (اور صرف اچھے ادب) کے مطالعے سے ہی دقیقہ رس، پختہ، خوب صورت اور درست گفتگو کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ ادب کے علاوہ فنونِ لطیفہ کا کوئی دوسرا شعبہ یا شاخ اس زبان کی تشکیل نہیں کر سکتی، جس کی لوگوں کو ایک دوسرے سے مکالمہ و ارتباط کے لیے ضرورت ہے۔ اچھی گفتگو کرنا، متنوع تعبیرات اور اظہارِ خیال کے مختلف پیرایوں پر عبور رکھنا، ہر خیال اور عمل مثلاً سوچنے، سکھانے، سیکھنے، بات چیت کرنے، تصور کرنے، خواب دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کی تیاری بھرپور ہونی چاہیے، جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر موقعے کے لیے مناسب الفاظ کے استعمال پر بھرپور قدرت رکھتا ہو۔ غیر محسوس یا خفیہ طور پر ہمارے تمام اعمال درحقیقت ہمارے الفاظ ہی کی گونج ہوتے ہیں، وہ اعمال بھی جن کا بہ ظاہر زبان و الفاظ سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے ادب کی بدولت زبان ارتقا پذیر ہوئی، وہ نظافت و شستگی کی اعلیٰ سطحوں پر پہنچی، جس سے انسانی لطف اندوزی کے امکانات بڑھ گئے۔

ادب نے تو محبت، خواہش اور جنسی عمل کو بھی ایک آرٹ کا درجہ دیا ہے۔ ادب کے بغیر انسانی شہوت کا مہذب اظہار ممکن ہی نہیں ہے، اس کے بغیر محبت اور سرور میں کوئی دم نہیں رہ جائے گا، اس کی نزاکت و نفاست جاتی رہے گی، لوگ اس شدت اور لذت کی انتہا کو حاصل کرنے میں ناکام ہوں گے، جو ادبی فنتاسی پیش کرتی ہے۔ یہ کہنا شاید ہی مبالغہ آرائی ہو کہ ایک ایسا جوڑا، جس نے گارسیلاسو (Garcilaso)، پیٹرارک (Petrarch)، گونگورا (Gongora) یا بودلیئر (Baudelaire) کو پڑھا ہے وہ اَن پڑھ لوگوں سے زیادہ جسمانی و ذہنی سرور اور اس کے تجربے کی قدر کرتے ہیں، جنھیں ٹیلی ویژن سیریز اور ڈراموں نے بے وقوف بنا رکھا ہے۔ ایک ناخواندہ دنیا میں محبت اور خواہش جانوروں کے جذبۂ تسکین سے مختلف نہیں ہوگی اور نہ ہی وہ ابتدائی جبلتوں کی خام تکمیل سے بالاتر ہوگی۔

اسی طرح سمعی و بصری ذرائع ابلاغ بھی اس وظیفے کی ادائیگی میں ادب کی جگہ نہیں لے سکتے، جو ادب نہایت وثوق و مہارت کے ساتھ انسان کو زبان میں موجود ثروت مند امکانات کے استعمال کی کیفیت سکھا کر ادا کرتا ہے۔ اس کے برعکس سمعی و بصری میڈیا تصاویر کے حوالے سے الفاظ کو ثانوی سطح پر منتقل کرنے کا رجحان رکھتا ہے، جو ان ذرائع ابلاغ کی ابتدائی زبان ہے اور زبان کو اس کی تحریری جہت سے بہت دور، اس کے زبانی اظہار تک محدود کرتا ہے۔ کسی فلم یا ٹیلی ویژن پروگرام کو 'ادبی' بتانا یہ کہنے کا ایک خوبصورت طریقہ ہے کہ یہ بورنگ ہے۔ اسی وجہ سے ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر نشر کیے جانے والے ادبی پروگرام شاذ و نادر ہی عوام کو اپنی جانب کھینچ پاتے ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اس اصول کی واحد استثنا فرانس میں برنارڈ پیوٹ (Bernard Pivot) کا پروگرام Apostrophes تھا اور یہ مجھے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ادب نہ صرف مکمل علم اور زبان

پر مکمل عبور حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے؛ بلکہ اس کی تقدیر لازمی طور پر کتاب کی تقدیر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اُس صنعتی پیداوار سے جسے اب بہت سے لوگ متروک و مجبور قرار دے رہے ہیں۔

یہاں مجھے بل گیٹس کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ وہ کچھ عرصے قبل میڈرڈ گئے تھے اور وہاں رائل ہسپانوی اکیڈمی کا دورہ کیا، جس نے مائیکرو سافٹ کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ شروع کیا ہے۔ دیگر باتوں کے علاوہ گیٹس نے اکیڈمی کے ممبران کو یقین دلایا کہ وہ ذاتی طور پر اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ کمپیوٹر سافٹ ویئر سے 'Ñ' حرف کو کبھی نہیں ہٹایا جائے گا، یہ ایک ایسا وعدہ تھا، جسے سن کر پانچ براعظموں میں پھیلے چار سو ملین ہسپانوی بولنے والوں نے راحت کی سانس لی، کیونکہ سائبر اسپیس سے اس طرح کے ایک ضروری حرف کے اخراج سے بڑے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ البتہ گیٹس نے ہسپانوی زبان کو اپنی دوستانہ رعایت دینے کے فوراً بعد اکیڈمی کے احاطے سے نکلنے سے پہلے ہی ایک پریس کانفرنس میں اس بات کا اظہار کیا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے اعلیٰ ترین ہدف کو پورا کرنے کی توقع رکھتے ہیں، جو کہ کاغذ اور بالآخر کتابوں کو ختم کرنا ہے۔

ان کے خیال میں کتابیں ازکار رفتہ ہو گئی ہیں۔ گیٹس کا یہ کہنا ہے کہ کمپیوٹر اسکرین میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو کاغذ سے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اس پر بھی اصرار ہے کہ انسانی انرجی کے کم استعمال کے ساتھ کمپیوٹر جگہ بھی کم لیتا ہے اور زیادہ آسانی سے نقل و حمل کے قابل ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اخبارات اور کتابوں کے بجائے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے خبروں اور ادب کی ترسیل سے جنگلات کی تباہی کو روکنے کا ماحولیاتی فائدہ بھی ہوگا؛ کیونکہ یہ ایک ایسی تباہی ہے جو کاغذ سازی کی صنعت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ گیٹس نے اپنے سامعین کو یقین دلایا کہ لوگ پڑھتے رہیں گے؛ لیکن وہ کمپیوٹر اسکرین پر پڑھیں گے اور اس کے نتیجے میں ماحول کی ہریالی و شادابی میں بھی اضافہ ہوگا۔

میں گیٹس کی اس مجلس گفتگو میں موجود نہیں تھا۔ مجھے یہ تفصیلات پریس سے معلوم ہوئیں۔ اگر میں وہاں ہوتا تو میں گیٹس کو بے شرمی سے یہ اعلان کرنے کے لیے کہتا کہ وہ مجھے اور مجھ جیسے کتابوں کے مصنفین کو براہ راست بے روزگاروں کی صف میں بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور میں ان کے تجزیے سے سخت اختلاف کرتا۔ کیا اسکرین میں واقعی کتاب کی تمام خصوصیات آ سکتی ہیں؟ مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ میں اس زبردست انقلاب سے پوری طرح واقف ہوں جو انٹرنیٹ جیسی نئی ٹیکنالوجی نے مواصلات اور معلومات کے تبادلے کے شعبوں میں برپا کیا ہے اور میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ انٹرنیٹ مجھے اپنے تحریری و تخلیقی کاموں میں روزانہ قیمتی مدد فراہم کرتا ہے؛ لیکن ان غیر معمولی سہولتوں کے لیے میری شکرگزاری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الیکٹرانک اسکرین کاغذ کی جگہ لے سکتی ہے یا کمپیوٹر پر پڑھنا مطبوعہ ادب پڑھنے کا متبادل ہو سکتا ہے۔ دونوں میں اتنی وسیع خلیج ہے جسے پاٹا ہی نہیں جا سکتا۔ میں اس خیال کو قبول نہیں کر سکتا کہ پڑھنے کا ایک غیر فعال یا غیر حقیقی عمل، جس کا مقصد نہ تو معلومات کی جستجو ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مفید اور راست ارتباط، وہ کمپیوٹر اسکرین پر خوابوں اور الفاظ کی لذتوں کو اسی احساسِ قربت، ذہنی ارتکاز اور روحانی گوشہ گیری کے ساتھ یکجا کر سکتا ہے، جن سے مطبوعہ کتاب پڑھنے کے دوران ایک قاری گزرتا ہے۔

> ادب محض ایک فرد کی تخلیقات سے وجود میں نہیں آتا، یہ تب وجود میں آتا ہے جب دوسرے لوگ بھی اسے اپناتے ہیں اور جب یہ سماجی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے، جب یہ مطالعہ و کتب بینی کے عمومی ماحول کی بدولت ایک مشترکہ انسانی تجربہ بن جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ میرا یہ خیال مشق و مزاولت کی کمی اور کتابوں اور مطبوعہ ادب سے طویل وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عصبیت کا نتیجہ ہو؛ لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ بھلے ہی میں دنیا کی خبروں کی تلاش میں مختلف ویب سائٹس کے چکر لگاتا ہوں، مگر میں کبھی بھی گونگورا (Gongora) کی نظم یا اونیٹی (Juan Carlos Onetti) کا ناول یا پاز (Octavio Paz) کا مضمون پڑھنے کے لیے کمپیوٹر اسکرین پر نہیں جاؤں گا؛ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح کے پڑھنے کا اثر ویسا نہیں ہوگا، جیسا کتاب پڑھنے کا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے، گو کہ میں اسے ثابت نہیں کر سکتا، کہ کتاب کی گمشدگی سے ادب کو شدید دھچکا لگے گا، حتی کہ اس کی موت بھی ہو سکتی ہے۔ 'ادب' کی اصطلاح تو یقیناً باقی رہے گی، البتہ یہ تقریباً طے ہے کہ اس کا استعمال ایسے متون کے لیے ہوگا، جو ان سے بہت مختلف ہوں گے جنھیں آج ہم ادب کہتے ہیں، ٹی وی سیریلز اور سوفوکیلز اور شیکسپیئر کے المیہ ڈراموں میں جو فرق ہے وہی فرق ہوگا۔

قوموں کی زندگی میں ادب کو اہم مقام دینے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تنقیدی ذہن، جو تاریخی تبدیلی کا حقیقی پیش خیمہ اور آزادی کا بہترین محافظ ہے، ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہوگا؛ کیونکہ ہر اچھا ادب اصالت پسند ہوتا ہے اور جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھاتا ہے۔ تمام عظیم ادب پاروں میں غیر ارادی اور فطری طور پر کہیں نہ کہیں ایک مزاحمتی رنگ پایا جاتا ہے۔ ادب ان انسانوں کو کچھ نہیں کہتا، جو اپنی روزمرہ کی زندگی اور روایتی طرزِ حیات سے مطمئن ہیں۔ ادب تو باغیانہ جذبے کی خوراک ہے، عدمِ تعاون کو فروغ دیتا ہے، ان لوگوں کی پناہ گاہ ہے، جن کی زندگی میں کچھ بہت زیادہ یا بہت کم ہے۔ انسان اس لیے ادب کی پناہ میں آنا چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی، ناخوشی اور عدمِ تکمیل کے احساس سے چھٹکارا پا سکے۔

ادب ہماری بے اطمینانی کی کیفیت کو محض لمحاتی سکون بخشتا ہے، مگر اسی معجزاتی لمحے میں، زندگی کے اسی وقتی تعطل کے دوران ادبی فنتاسی ہمیں تاریخ سے پرے لے جاتی ہے، ہم ایک لازوال خطے کے شہری بن جاتے ہیں اور اس طرح خود بھی لافانی ہو جاتے ہیں۔ ہم عام زندگی کے محدود معمولات کے مقابلے میں زیادہ پرقوت، زیادہ ثروت مند، زیادہ گھنیرے، زیادہ خوش اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ کتاب بند کرنے اور افسانہ خوانی سے فراغت کے بعد ہم حقیقی دنیا کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کا موازنہ اس شاندار دنیا سے کرتے ہیں، جسے ہم نے ابھی الوداع کہا ہے۔ تب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ کتنی مایوسیاں ہماری منتظر ہیں، مگر ان کے ساتھ ہی ایک اور زبردست احساس ہمارا منتظر ہوتا ہے، یعنی یہ کہ ناول یا افسانے کی خیالی زندگی اس زندگی سے

بہتر ہے، جو ہم فی الحقیقت جیتے ہیں اور جو مختلف حدود و قیود میں گھری ہوئی ہے، یہ خیالی زندگی اس سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ متنوع، زیادہ قابل فہم اور زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اچھا اور حقیقی ادب ہمیشہ سوال انگیز، غیر آسودگی بخش، باغیانہ اور دنیا بھر میں جو کچھ موجود ہے، اس کے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔

ہم War and Peace یا Remembrance of Things کے مطالعے بعد اپنی اس دنیا میں لوٹتے ہوئے کیسے احساسِ فریب میں مبتلا نہیں ہوں گے، جو بہت معمولی جزئیات اور ہر جگہ حدود و قیود سے گھری ہوئی ہے اور جو ہر قدم پر ہمارے تخیلات کی نفی کرتی ہے؟ دیکھا جائے تو ثقافتی تسلسل اور زبان کو ثروت مند بنانے سے زیادہ انسانی ترقی میں ادب کا سب سے بڑا حصہ یہ ہے کہ وہ ہمیں (زیادہ تر غیر ارادی طور پر) یہ یاد دلاتا ہے کہ یہ دنیا بہت بری ہے اور جو لوگ اس کے برعکس یعنی طاقت ور اور مرفہ الحال ہونے کا ڈھونگ کرتے ہیں، وہ دراصل جھوٹے ہیں اور یہ کہ ہم لفظ کی کائنات کو بہتر کر سکتے ہیں اور اسے ان دنیاؤں کے مشابہ بنا سکتے ہیں، جن کی تخلیق کی صلاحیت ہمارے تخیل اور ہماری زبان میں موجود ہے۔ ایک آزاد اور جمہوری معاشرے میں ذمے دار اور ناقدانہ مزاج کے شہریوں کا ہونا ضروری ہے؛ تاکہ ہم جن لفظوں کی انجمن میں رہتے ہیں، انھیں مسلسل جانچتے رہیں یا اس کی کوشش کرتے رہیں، گوکہ انھیں اُس دنیا سے زیادہ قریب یا مشابہ بنانا بہت مشکل ہے، جس میں ہم رہنا چاہتے ہیں۔ اور حالتِ موجودہ کے تئیں عدم اطمینان کو فروغ دینے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ اچھا ادب پڑھا جائے۔ تنقیدی ذہنیت رکھنے والے اور خود مختار شہریوں کی تشکیل کا بھی اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ ادب دنیا کے نقائص کے تئیں اپنے قاری کے شعور کو بیدار کرتا ہے، مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض دفعہ خیال کیا جاتا ہے) کہ ادبی متون سماجی ہلچل پیدا کرنے یا انقلابی رفتار کو تیز کرنے میں راست رول ادا کرتے ہیں۔ کسی نظم، ڈرامے یا ناول کے سماجی اور سیاسی اثرات کا پیشگی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا؛ کیونکہ نہ اجتماعی طور پر ان کی تخلیق ہوتی ہے اور نہ اجتماعی طور پر ان کا تجربہ کیا جاتا ہے۔ وہ افراد کے ذریعے تخلیق کیے جاتے ہیں اور انھیں پڑھنے والے بھی افراد ہی ہوتے ہیں اور

> اچھا ادب انسان کی بے اطمینانی کی کیفیت کو وقتی طور پر دور کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے تئیں تنقیدی اور غیر روایتی رویہ پیدا کر کے درحقیقت اس میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

ان سب کے مطالعے کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں، یکساں نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے کوئی یقینی رائے قائم کرنا مشکل یا تقریباً ناممکن ہے۔ مزید یہ کہ کسی ادب پارے کے سماجی نتائج کا اس کے جمالیاتی معیار سے بہت کم تعلق ہوسکتا ہے؛ چنانچہ Harriet Beecher Stowe کے ایک معمولی ناول نے ریاست ہائے متحدہ میں غلامی کی ہولناکیوں کے خلاف سماجی اور سیاسی شعور بیدار کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا؛ اس لیے اصل بات یہ ہے کہ ادب کے اثرات کی نشان دہی مشکل ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہاں، اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ ان شہریوں کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں، جن کی شخصیتیں جزوی طور پر کتابوں کے ذریعے تشکیل پاتی ہیں۔

اچھا ادب انسان کی بے اطمینانی کی کیفیت کو وقتی طور پر دور کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے تئیں تنقیدی اور غیر روایتی رویہ پیدا کر کے درحقیقت اس میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادب انسان کو آشوبِ آگہی سے دوچار کرتا اور اسے زیادہ تر ناخوش رہنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ غیر مطمئن زندگی گزارنا اور دنیا کے ساتھ پیہم برسرِ پیکار رہنا دراصل ایسی چیزوں کی جستجو میں رہنا ہے، جو شاید وجود ہی نہ رکھتی ہوں، یہ بے فائدہ کی مذموم لڑائیوں جیسا ہے، جیسے وہ لڑائیاں جو کرنل اورلیانو بوئنڈیا (گیبریئل گارسیا مارکیز کے ناول 'تنہائی کے سو سال' کا کردار) نے لڑی تھیں، یہ جانتے ہوئے کہ وہ سب کچھ کھودے گا۔ یہ سب کچھ سچ ہوسکتا ہے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ اگر زندگی کے معمولی پن اور گھٹن کے خلاف بغاوت کا وجود نہ ہوتا، تو ہم تاہنوز اپنے وجود کے تشکیلی دور میں ہی رہتے اور انسانی تاریخ پر جمود طاری رہتا۔ کوئی خود مختار فرد نہ جنم لیتا، سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی نہ کی ہوتی، انسانی حقوق کو تسلیم نہ کیا جاتا اور آزادی کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ ان ساری چیزوں نے ناخوشی اور ناکافی یا ناقابلِ برداشت سمجھی جانے والی زندگی کے خلاف باغیانہ کارروائیوں کے بطن سے ہی جنم لیا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس جذبے کے لیے ادب ایک عظیم محرک کا کام کرتا ہے، جو زندگی کی یکسانیت پر طعنہ زن ہوتا ہے۔

ایک ایسی دنیا کا تصور کریں، جو ادب سے خالی ہو، ایک ایسے انسانی معاشرے کا، جس نے نظمیں/غزلیں یا ناول نہ پڑھے ہوں۔ اس قسم کی خستہ حال تہذیب میں الفاظ کا ذخیرہ قلیل تر ہوگا اور چیخنا چلانا یا بندر جیسے اشارے کرنا الفاظ پر غالب ہوگا اور وہ قابلِ ذکر صفات سے خالی ہوگا۔ ان میں Kafkaesque، Quixotic، Rabelaisian، Orwellian، Sadistic اور Masochistic جیسی صفات نایاب ہوں گی، جن کی اصل خالص ادبی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے بیچ کچھ پاگل، خبطِ عظمت، انفعالی کیفیت سے دوچار اور ایسے لوگ پائے جاتے ہوں جو غیر مانوس خواہشات کے مارے اور حدود سے تجاوز کرنے والے ہوں اور ایسے دوپایے جو کسی کو تکلیف پہنچانے یا خود اذیتی سے لطف اندوز ہوتے ہوں؛ لیکن ہم نے رویے کی ان انتہاؤں کے پیچھے جو ہمارے ثقافتی ضوابط کے تحت ممنوع ہیں، انسانی حالت کی ضروری خصوصیات کو دیکھنا نہیں سیکھا۔ ہم اپنی ہی ان خصلتوں کو اس طرح دریافت نہیں کر پاتے، جس طرح سروینٹس (Cervantes)، ریبیلے (Rabelais)، آرویل (Orwell)، ڈی ساڈ (De Sade) اور زاخر-مزوخ (Sacher-Masoch) کی صلاحیتوں نے ان کو ہم پر منکشف کیا ہے۔

تمام عظیم ادبی تخلیق کاروں کی تخلیقات ہماری اپنی جبلت کے نامعلوم پہلوؤں کا انکشاف کرتی ہیں۔ وہ ہمیں عام انسانی پہنائیوں کو مزید مکمل طور پر دریافت کرنے اور سمجھنے کے قابل بناتی ہیں۔ جب ہم 'Borgesian' (بورخیسی) کہتے ہیں، تو یہ لفظ ہمارے ذہنوں کی حقیقت کے عقلی ترتیب سے علیحدہ ایک شاندار کائنات میں داخل ہونے کا اشارہ دیتا ہے، ایک ٹھوس اور نفیس ذہنی دنیا میں داخل ہونے کا، جو ہمیشہ پیچ دار اور پرکشش ہوتی ہے، جو ادبی حوالوں اور استعاروں میں لپٹی ہوتی ہے، جس کی انفرادیتیں ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں؛ کیونکہ ان کے پس

پردہ دراصل ہمارا واسطہ اپنی ہی شخصیت کی پوشیدہ خواہشوں اور اندرونی سچائیوں سے پڑتا ہے اور انھیں یہ شکل جارج لوئس بورخیس کی ادبی تخلیق کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔

اسی طرح لفظKafkaesque(کافکائی) کوسن کر ہمارا ذہن قدیم، بازووں والے کیمرے کی شکل کے اس فوکس مشین کی طرف جاتا ہے جسے دیکھ کر ہم ہر بار اپنے آپ کو ننھے افراد کے مانند خوف زدہ محسوس کرتے تھے، جیسے کہ نئے زمانے میں ظالمانہ اقتداری مشنریز نے انسانی دنیا کو بہت سے درد اور ناانصافیوں سے دوچار کیا ہے۔

ایک اور ادبی اصطلاح Orwellian ہے، جس نے اس خوفناک اذیت اور پایابی کو گویائی بخشی، جو بیسویں صدی کی مطلق العنان آمریتوں کی پیدا کردہ

ادب کے بغیر یہ دنیا غیر مہذب، وحشی، حساسیت سے عاری، ناپختہ بولیوں اور لکنت زدہ زبان والی، جاہل اور بدو، ہر قسم کے جذبہ و احساس سے دور ، محبت میں خام اور ایک ڈراؤنا خواب ہوگی ، جس کی بنیادی خصلت ہر صورت حال کو قبول کرلینا اور ہرطاقت کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا ہوگی۔

تھی، تاریخ کی سب سے منظم، ظالمانہ اور بے لگام آمریتوں کی پیدا کردہ، جن کے قبضہ وتصرف میں انسانی اعمال اور ان کی نفسیات تک تھی۔ اپنے ناول '1984' میں جارج آرویل نے 'بڑے بھائی' کے سامنے زیر ہوجانے والی انسانیت کی نہایت سرد و دہشت انگیز شکلیں پیش کی ہیں، یہ بڑا بھائی بے لگام ہے، جس نے ٹکنالوجی اور دہشت کے مخلوط استعمال کے ذریعے آزادی، خود مختاری اور مساوات کو تہہ تیغ کردیا ہے اور تمام انسانی سماج کو ایک خودکار قسم کے شہد کی مکھی کے چھتے میں تبدیل کردیا ہے۔ ایسی خوفناک دنیا میں زبان بھی طاقت کے تابع ہوگئی ہے اور اسے ایک نئی زبان میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جو تمام تر ایجادات اور ہر قسم کی تخیلیوٹی سے اچھوتی ہے، جو پامال اور مبتذل الفاظ کے ایک سلسلے میں تبدیل ہوگئی ہے، ایسا سلسلہ جو فرد کو سسٹم کا غلام بناتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ 1984 کی مذموم پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی اور سوویت یونین کا مطلق العنان کمیونزم جرمنی اور دیگر مقامات پر فاشزم کی راہ پر گامزن ہوگیا، پھر یہی سلسلہ آگے چین، کیوبا اور شمالی کوریا جا پہنچا، گویا یہ خطرہ اپنی جائے قیام تو بدلتا رہا، مگر کبھی مکمل طور پر دور نہیں ہوا، لفظ 'آرویلین' اسی خطرے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اسے سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

لہٰذا ادب کے غیر حقیقی واقعات اور بیانیے اور اس کے جھوٹ بھی دراصل انسان کی پوشیدہ ترین حقیقتوں کا علم حاصل کرنے کا قیمتی ذریعہ ہیں۔ ادب جن سچائیوں کی نشان دہی کرتا ہے، وہ ہمیشہ مبالغہ آرائیاں نہیں ہوتیں اور کبھی کبھی ناولوں اور نظموں/غزلوں کے آئینے میں خود ایک قاری کی اپنی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ ایک عفریت کی تصویر ہوتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ہم ڈی ساڈ کے تصور کردہ خوفناک جنسی قتل عام کے بارے میں پڑھتے ہیں، یا ان سیاہ زخموں اور وحشیانہ قربانیوں کے بارے میں پڑھتے ہیں جو زاخر مزوخ اور باتیل (Bataille) کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ بعض اوقات یہ تماشا اس قدر جارحانہ اور وحشیانہ ہوتا ہے کہ ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ پھر بھی ان صفحات کا بدترین پہلو خون، ذلت، ایذا رسانی کی چاہ نہیں ہے، بدترین پہلو یہ ہے کہ یہ تشدد اور یہ زیادتی ہمارے لیے اجنبی نہیں ہے، کہ یہ عالم انسانیت کا جزو لاینفک ہے۔ وحشت و درندگی کے شوقین یہ عفریت ہمارے وجود کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ہیں اور موقع ملتے ہی انسانیت کے خول سے باہر نکلتے اور معقولیت پسندی کا خون کردیتے ہیں۔ یہ سائنس نہیں تھی، جس نے سب سے پہلے انسانی ذہن کی ان تنگنائیوں کا انکشاف کیا اور اس کی دنیا اور خود کو تباہ کردینے کی صلاحیتوں کی نشان دہی کی۔ یہ انکشاف ادب نے کیا۔ ادب کے بغیر دنیا جزوی طور پر انسانی وجود کی ان خوفناک گہرائیوں کو دیکھ نہیں سکتی، جنھیں ہمیں فوری طور پر دیکھنے اور متنبہ ہونے کی ضرورت ہے۔

ادب کے بغیر یہ دنیا غیر مہذب، وحشی، حساسیت سے عاری، ناپختہ بولیوں اور لکنت زدہ زبان والی، جاہل اور بدو، ہر قسم کے جذبہ و احساس سے دور، محبت میں خام اور ایک ڈراؤنا خواب ہوگی، جس کی بنیادی خصلت ہر صورت حال کو قبول کرلینا اور ہر طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ ایک خالصتاً حیوانی دنیا بھی ہوگی۔ خلقی جبلتیں زندگی کے روزمرہ طرز عمل کا تعین کریں گی جس کی خصوصیت جہد للبقا، نامعلوم خوف اور جسمانی ضروریات کی تسکین ہوگی۔ اس میں روح کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں زندگی کو کچل دینے والی یکسانیت کے ساتھ مایوسی کے دہشت ناک سایے بھی ہوں گے اور یہ احساس بھی کہ انسانی زندگی وہی ہے، جو اسے ہونا تھا اور یہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی اور کوئی چیز اسے بدل نہیں سکتی۔

جب ہم اس طرح کی دنیا کا تصور کرتے ہیں، تو دراصل لاطینی امریکہ، اوشیانیا اور افریقہ کے دور دراز خطوں میں موجود چھوٹے چھوٹے لنگوٹ بند جادوگر انسانی گروہ کی تصویر ابھرتی ہے، جو جدیدیت و ترقی پسندی سے بہت دور ہیں؛ لیکن میرے ذہن میں کچھ اور ہے۔ میں جس ڈراؤنے خواب کے بارے میں خبردار کر رہا ہوں اس نے ترقی کی کمی سے نہیں، اس کی بہتات سے جنم لیا ہے۔ ٹکنالوجی کی بے چون و چرا تابعداری کے نتیجے میں ہم مستقبل کے ایک ایسے معاشرے کا تصور کر سکتے ہیں، جس میں کمپیوٹر اسکرینز اور اسپیکرز کی کثرت ہوگی اور کتابیں گم ہوجائیں گی یا ایک ایسے معاشرے کا، جس میں کتابوں کی حالت وہ ہوگی، جو طبعیات کے دور میں کیمیا کی تھی، ایک از کار رفتہ شے جو میڈیائی ثقافت کے مدفن میں پڑی ہوگی اور بس کچھ مجنوں صفت لوگ اس سے چمٹے ہوں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ سائبر نیٹک دنیا تمام تر خوش حالی، طاقت و قوت، اعلیٰ معیار زندگی اور سائنسی کامیابیوں کے باوصف بہت حد تک غیر مہذب اور بالکل بے روح ہوگی، جس کے مابعد ادب خود کار دور میں انسانیت اپنی تمام تر آزادی سے دست بردار؛ بلکہ محروم ہوجائے گی۔

حالانکہ فی الحقیقت انتہائی ناممکن ہے کہ یہ مکروہ یوٹوپیا کبھی سامنے آئے گا۔ ہماری کہانی کا انت، ہماری تاریخ کا اختتامیہ ابھی تک لکھا نہیں گیا اور یہ کوئی طے شدہ منصوبہ بھی نہیں ہے۔ ہم کیا بنیں گے اس کا انحصار مکمل طور پر ہمارے وژن اور ہمارے ارادہ و مرضی پر ہے؛ لیکن اگر ہم اپنے تخیل کے افلاس، آزادی کی شکست و ریخت سے بچنا اور اُس قیمتی بے اطمینانی کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں، جو ہماری حساسیت کو نکھارتی اور ہمیں فصیح و بلیغ گفتگو کا سلیقہ سکھاتی ہے، تو عملی اقدام کرنا ہوگا، یعنی ہمیں پڑھنا ہوگا!

■

Md.Nayab Hasan
A/22,Seema Apt.Gali No.7,Batla House
Jamia Nagar,New Delhi-110025
nh912823@gmail.com

خواجہ دل محمد

گیتا اور اس کی تعلیم

عرفان کی پھول مالا

'شریمد بھگوت گیتا' دنیا کی قدیم روحانی کتابوں میں بے نظیر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا مضمون شری کرشن جی مہاراج کا وہ اپدیش ہے جو انھوں نے ارجن کو کوروکشیتر کے میدان میں مہابھارت کی جنگ کے وقت دیا۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے، انسان کیا ہے، روح کیا ہے، خدا کیا ہے، بھگتی اور وصالِ باری کیوں کر حاصل ہو سکتے ہیں۔ انسان کے فرائض کیا ہیں، نشکام کرم یعنی بے لوث عمل کا کیا درجہ ہے۔ یہ عرفانی مضمون سنسکرت کے سات سو شلوکوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر شلوک معرفت کا رنگین پھول ہے۔ انھی سات سو پھولوں کی مالا کا نام 'گیتا' ہے۔

یہ مالا کروڑوں انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے لیکن تا حال اس کی تازگی، اس کی نفاست اس کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ پھول اس باغ سے چنے گئے ہیں، جس کا نام گلشن بقا ہے، جسے آبِ حیات نے سینچا ہے۔

اس پھول مالا میں عجب خوشبو ہے اور اس خوشبو میں عجب تاثیر۔ اس مالا کو پہنو تو دل و دماغ پر لاہوتی تاثرات چھا جاتے ہیں اور کائنات کے ذرے ذرے میں آفتاب جھلکنے لگ جاتے ہیں۔ ہر خار پھول بن جاتا ہے اور ہر پھول فردوس نگاہ عالم اور تجلی گاہِ ربانی نظر آنے لگتا ہے۔ جسم کا تودۂ خاکی نور کی مورت بن جاتا ہے۔ دل پر ایک روحانی سکون چھا جاتا ہے اور اس پھول مالا کی ہر پتی کتاب عرفان کا ورق بن جاتی ہے۔

پرماتما (خدا)

سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال خدا کی ہستی کا ہے۔ کیا خدا ہے؟

گیتا جواب دیتی ہے 'خدا ہے' بلکہ 'خدا ہی ہے' دوسرے لفظوں میں گیتا وحدت وجود کی قائل ہے۔

فطرت کہو، نیچر کہو، پرکرتی کہو، مایا کہو، غرضیکہ عالم میں جو کچھ نظر آ رہا ہے، خدا ہی کا ظہور ہے۔ سورج کے جلال میں اسی کی تابانی ہے، چاند کے جوبن میں اسی کی دلفریبی، سرو و چنار میں اسی کی رعنائی، پھولوں میں اسی کی نفاست، سمندر میں اسی کی بے پایانی، آسمان میں اسی کی بلندی اور زمین میں اسی کا حلم کارفرما ہے یعنی 'جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے' کا عالم ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ کہے۔

12/15

یہ سورج کی تابش مرا نور ہے جہاں جس کے جلووں سے معمور ہے
رہے چاند رخشاں مرے نور سے تو آتش درخشاں مرے نور سے

20/6

جو ہر سمت پاتا ہے میرا ہی نور مجھی میں جو ہر شے کا دیکھے ظہور
کبھی مجھ سے منھ موڑ سکتا نہیں کبھی میں اسے چھوڑ سکتا نہیں

31/6

جو کثرت میں وحدت کا دیکھے سماں جو پوجے مجھے، ہوں جو سب میں عیاں
وہ یوگی رہے گو کسی ڈھنگ میں مجھی سے ہو واصل ہو ہر رنگ میں

عالم کا ذرہ ذرہ اسی سے وابستہ ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ شیرازہ منتشر ہو جائے۔

7/5

سخن ارجن نہیں کچھ بھی میرے سوا نہ ہے مجھ سے بڑھ کر کوئی دوسرا
پرویا ہے سب کچھ مرے تار میں کہ ہیرے ہوں جیسے کسی ہار میں

وہ آنکھ سے نہیں دیکھتا، لیکن آنکھ اس سے دیکھتی ہے۔ وہ کان سے نہیں سنتا، لیکن کان اس سے سنتے ہیں۔ وہ زبان سے نہیں بولتا، لیکن زبان اس سے بولتی ہے۔ وہ سانس سے دم نہیں لیتا، لیکن سانس اس سے دم لیتا ہے۔ وہ دل سے خیال نہیں کرتا، لیکن دل اس سے خیال کرتا ہے۔ وہ آنکھ کی آنکھ ہے، کان کا کان ہے، زبان کی زبان ہے، جان کی جان ہے اور دل کا دل ہے۔

13/13

اسی کے ہیں سب دست و پا چارسو اسی کا ہے رخ رونما چارسو
اسی کی نظر، کان، سر، ہر طرف محیطِ جہاں سربسر ہر طرف

14/13

بظاہر نہیں گرچہ اس کے حواس — درخشاں صفاتِ حواس اس کے پاس
وہ ہے بے تعلق مگر سب کا رب — گنوں سے بری اور گن اس میں سب

خدائی فطرت

اب خدائی فطرت پر غور کرو، سانکھیہ فلاسفی کے مطابق دنیا کی ہر چیز دو مختلف خودمختار ابدی عناصر سے پیدا ہوئی ہے۔(1) بے جان پرکرتی (مادّہ) سے (2) جاندار پرش (روح) سے، لیکن گیتا وحدانیت کی قائل ہے، اس کے مطابق مادہ اور روح دونوں ایک ہی پرمیشور کا ظہور ہیں۔ مادّے کو خدا کی اپراپرکرتی (ادنیٰ فطرت) سمجھو اور روح کو پراپرکرتی (اعلیٰ فطرت) دنیا کی ہر چیز انہی دونوں سے پرمیشور کی نگرانی میں پیدا ہوتی ہے۔ اپراپرکرتی (ادنیٰ فطرت) کے عناصر آٹھ ہیں۔

4/7

یہ مٹی، یہ پانی، یہ آگ اور ہوا — یہ آکاش دنیا پہ چھایا ہوا
یہ دانش، یہ دل، یہ خیال خودی — ہے ان آٹھ حصوں میں فطرت مری

5/7

یہ فطرت تو ادنیٰ ہے سن او قوی — مگر میری فطرت ہے اک اور بھی
وہ فطرت ہے عادل بنے جو حیات — اسی سے تو قائم ہے کل کائنات

> 'شریمد بھگوت گیتا' دنیا کی قدیم روحانی کتابوں میں بے نظیر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا مضمون شری کرشن جی مہاراج کا وہ اپدیش ہے جو انھوں نے ارجن کو کوروکشیتر کے میدان میں مہابھارت کی جنگ کے وقت دیا۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے، انسان کیا ہے، روح کیا ہے، خدا کیا ہے، بھگتی اور وصالِ باری کیوں کر حاصل ہو سکتے ہیں۔

یہ اعلیٰ فطرت روحانی فطرت ہے، یہی منبعِ زندگی ہے، یہی جیوآتما کی شکل میں نباتات، حیوانات سب میں پائی جاتی ہے۔

20/10

سن ارجن میں ہوں آتما بالیقیں — جو ہے جانداروں کے دل میں مکیں
میں ہوں مثلِ جاں اہلِ جاں میں نہاں — میں اول، میں آخر، میں ہوں درمیاں

صرف پرکرتی اور پرش ہی خدا کا مظہر نہیں بلکہ ان کے تمام صفات بھی خدا ہی کا مظہر ہیں۔

میں پانی میں رس، چاند سورج میں نور — میں ہوں آدم، ویدوں میں جس کا ظہور
صدا مجھ کو آکاش میں کر خیال — میں مردوں میں مردی ہوں کنتی کے لال

لیکن اس ادنیٰ فطرت (پرکرتی) اور اعلیٰ فطرت (پرش) سے بلند تر خود پرماتما کی ذاتِ پاک ہے جو انسانی تخیل سے بالا، جستجو کی رسائی سے بلند، ظاہر سے مستور اور باطن سے بھی دور ہے۔

20/8

پرے غیب سے بھی ہے اک ذاتِ غیب — وہ ہستی، فنا کا نہیں جس میں عیب
کسی کی نہ کچھ بات باقی رہے — فقط اک وہی ذات باقی رہے

17/2

اسی کو بقا ہے اسی کو ثبات — جہاں پر ہے چھائی ہوئی جس کی ذات
بھلا کس کی طاقت ہے، کس کی مجال — فنا کر سکے، ہستیِ لازوال

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

4/9

خفی سے خفی ہے مری ہست و بود — مگر ہے مجھی سے جہاں کی نمود
مجھی میں ہے مخلوق ساری مکیں — مگر میں مکیں خود کسی میں نہیں

لیکن ذاتِ خفی کا سمجھنا آسان کام نہیں۔

5/12

جو ذاتِ خفی میں لگاتے ہیں دل — اٹھاتے ہیں تکلیف وہ متصل
کہ ذاتِ خفی کا ہے مشکل شہود — خفی کو نہ سمجھیں گے اہلِ وجود

وہ ذاتِ بالا و برتر، ہر ابتدا کی ابتدا اور ہر انتہا کی انتہا ہے۔ ست اور است یعنی حق و باطل یا باقی و فانی دونوں سے بالا ہے۔ وہی محض اس قابل ہے کہ اس کو جانا جائے۔ اسی کے علم کا نام امرت اور آبِ حیات ہے۔

12/13

سزاوارِ عرفاں ہے وہ پاک ذات — کہ ہے علم ہی اس کا آبِ حیات
وہ بے ابتدا، لم یزل، ذی حشم — نہ ست یا الست کہہ سکیں جس کو ہم

نگاہیں اُسی کے جلوے کی متلاشی ہیں، کان اسی کے نغمے سننے کے لیے بےتاب ہیں، لیکن جب تک مایا کا پردہ دور نہ ہو، وہ کیونکر نظر آئے، اس کی میٹھی باتیں کیونکر سنی جائیں۔

24/7

میں چشمِ جہاں سے نہاں ہوں نہاں — مگر مجھ کو ناداں سمجھ لیں عیاں
وہ مجھ کو نہیں جانتے بے مثال — مری ذات عالی ہے اور بے زوال

خدا ہر چیز پر محیط ہے کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔

6/9

ہوا کو چلے زور سے سربسر — ادھر سے اُدھر یا اُدھر سے ادھر
وہ آکاش سے جائے باہر کہاں — سمجھ لو یونہی میرے اندر جہاں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا ہر چیز میں موجود ہے تو کیا وہ قابلِ تقسیم ہے؟ گیتا کا جواب ہے نہیں، ہرگز نہیں۔ اس کی تقسیم محال ہے۔

16/13

محال اُس کی تقسیم اے ذی شعور — مگر اس کا ہر شے میں حصہ ضرور
سزاوارِ عرفاں وہ پروردگار — فنا و بقا کا اسی پر مدار

دنیا میں جو کچھ ہے اور ہوگا اس کی اصل اور بیج پرماتما ہے۔

اگر ہر طرف وحدتِ وجودی کا ظہور ہے، تو پھر یہ کثرت کیسی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل ہر شے کی ایک ہے۔ صرف نام اور روپ یعنی صورتِ ظاہری کا فرق ہے۔ کمہار کے پاس وہی مٹی ہوتی ہے۔ کہیں اس سے پیالہ بناتا ہے، کہیں صراحی، کہیں مٹکا، کہیں رکابی، کہیں ہنڈیا، غور کرو تو سب کی اصل وہی ایک مٹی ہے، نام اور روپ کا فرق ہے، اسی کا نام مایا ہے۔

39/10

کروں خلقِ عالم کی ترویج میں ہوں ارجن ہر اک چیز کا بیج میں
ہے ساکن کوئی یا کہ سیار ہے مگر مجھ سے باہر نہ زنہار ہے

لیکن جب درخت اگتا ہے، اس کا بیج فنا ہو جاتا ہے، یہاں معاملہ برعکس ہے، یہ بیج کبھی فنا نہیں ہوتا۔

10/7

سن ارجن میں ہوں بیج ہر ہست کا میں وہ بیج ہوں جو نہ ہوگا فنا
میں دانش ہوں ان کی جو ہیں ہوشیار میں تابش ہوں ان کی جو ہیں تابدار

18/9

میں آقا میں والی تجن، میں گواہ میں منزل، میں مسکن، میں جائے پناہ
میں آغاز و انجام و گنج و مقام میں وہ بیج ہوں جو رہے گا مدام

وحدت اور کثرت

اگر ہر طرف وحدتِ وجودی کا ظہور ہے، تو پھر یہ کثرت کیسی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل ہر شے کی ایک ہے۔ صرف نام اور روپ یعنی صورتِ ظاہری کا فرق ہے۔ کمہار کے پاس وہی مٹی ہوتی ہے۔ کہیں اس سے پیالہ بناتا ہے، کہیں صراحی، کہیں مٹکا، کہیں رکابی، کہیں ہنڈیا، غور کرو تو سب کی اصل وہی ایک مٹی ہے، نام اور روپ کا فرق ہے، اسی کا نام مایا ہے۔ اسی کو فریب نظر، موہ، جہالت اگیان، جو چاہو کہو، ارجن سے ارشاد ہوتا ہے۔

61/18

سن ارجن خدا ہے خدا ہر کہیں خدائی کے دل میں خدا ہے مکیں
وہ سب ہستیوں کو گھماتا رہے وہ مایا کا چکر چلاتا رہے

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

6/4

مری ذات ہے مالکِ کائنات نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات
جو کام اپنی فطرت کو لاتا ہوں میں ظہور اپنی مایا سے پاتا ہوں میں

3/14

شکم ہے مری قدرتِ کاملہ جو میں تخم ڈالوں تو ہو حاملہ
یہی ہے مہا برہم اصلِ حیات اسی سے ہویدا ہو کل کائنات

29/13

جو سمجھے کہ دنیا کی سب ریل پیل ہے مایا کا کرتب، ہے مایا کا کھیل
ہے خود آتما پرسکون، بے عمل نظر ہے اسی کی نظر بے خلل

اب خدا کی ثنا میں چند اور شلوک ملاحظہ ہوں۔

17/15

ہے باقی و فانی سے بالا وہ حق کہ قائم ہوئے جس سے تینوں طبق
وہ ہے لافنا، سب پہ چھایا ہوا وہ پرمیشور ہے، وہ پرماتما

17/13

وہی ذات نورٌ، علی نور ہے جو تاریکیوں سے بہت دور ہے
وہ عرفاں کا حاصل بھی، مقصود بھی وہ عرفاں بھی، ہر دل میں موجود بھی

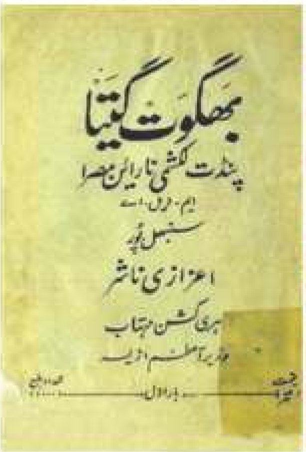

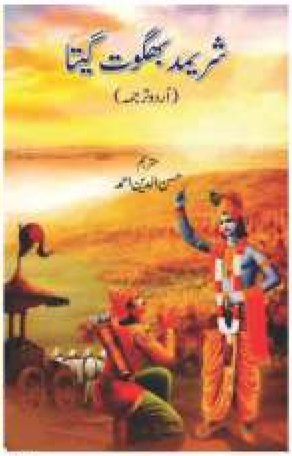

27

جو ہے کچھ نظر تو اسی کی نظر نظر میں رہے جس کی پرمیشور
ہے سب جان والوں میں جانی وہی کہ فانی میں ہے غیر فانی وہی

15/13

کسی شے میں جنبش، کسی میں سکوں وہ موجود سب میں درون و بروں
لطیف ایسا، احساس معذور ہے وہی ہے قریب اور وہی دور ہے

یہ روحانی گیت جس کا نام 'شریمد بھگوت گیتا' ہے، ایسے ہی بلند خیالات سے معمور ہے۔ طالبانِ حق خود ملاحظہ کریں۔ ہاں اتنا یاد رہے کہ اگر فطرتِ یزدانی کی مندرجہ بالا سہ گونہ نوعیت کو مدنظر نہ رکھیں گے تو خیالات میں الجھن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ کسی شلوک میں ادنیٰ فطرت (اپراپرکرتی) کی طرف اشارہ ہے تو کسی میں عالی فطرت (پراپرکرتی) کی طرف اور کسی میں ہر دو سے بالا ذاتِ باری (پرماتما) کا ذکر ہے جو صفات سے بالا (نرگن) ہے۔ اسی لیے اس نازک مضمون کو سوچ کر پڑھنے کی ضرورت ہے اور پڑھنے سے زیادہ اس پر غور کرنے کی

■

ماخذ: دل کی گیتا یعنی شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں، **مصنف:** خواجہ دل محمد، **مرتب:** مخمور سعیدی، **سنہ اشاعت:** 2004، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

امیر خسرو کی شاعری میں وطن دوستی

امیر خسرو دنیا کے ان ارباب کمال میں تھے جن کو عبقری Genius کہا جاتا ہے وہ ایک اچھے فرزند، اچھے باپ اور اچھے انسان تھے، ایک عظیم قصیدہ گو، ایک عظیم مثنوی نگار ایک عظیم غزل گو، عظیم نثر نگار، ایک عظیم صوفی اور ایک عظیم ماہرِ فن موسیقی بھی تھے۔ ان تمام محاسن کے ساتھ ان کا نمایاں وصف یہ بھی رہا کہ جس طرح ان کو اپنے والدین اور اولاد سے محبت رہی، اسی طرح فن شاعری میں وارفتگی رہی، یا جس طرح ان کو اپنے مرشد سے عشق رہا، اسی طرح ان کو اپنے وطن اور اس کی ہر چیز سے شیفتگی رہی۔

ان کی پیدائش تو پٹیالی ضلع ایٹہ (یوپی) میں ہوئی، مگر وہ دہلی جا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے، اسی کو اپنا گھر سمجھتے رہے اس سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ جب بھی اپنے سرپرستوں اور آقاؤں کے ساتھ باہر جاتے تو دہلی کے فراق میں تڑپتے رہتے۔ غیاث الدین بلبن کے لڑکے بغرا خان کے ساتھ لکھنؤ گئے تو وہاں دہلی کی یاد نے ستایا، جب وہاں سے دہلی کی طرف چلے تو خود لکھتے ہیں کہ ان کو ایسا معلوم ہوا کہ حضرت یوسف کی طرح چاہ زندان سے نکل کر آئے ہیں۔

(دیباچہ غرۃ الکمال، قلمی نسخہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

غیاث الدین بلبن کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ ملتان گئے تو وہاں ہر قسم کی راحت کے باوجود دہلی کی سربہ فلک عمارتوں، محل سراؤں، تالابوں، مرغزاروں، باغوں، پھولوں کی خوشبو، دہلی کے حسینوں اور محبوبوں کو یاد کر کے ملتان میں بے چین رہتے۔ (دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو دہلوی، وحید مرزا، ص 51)

جب وہ اپنے ایک اور سرپرست امیر حاتم خان، خان جہاں کے ملازم ہو کر دہلی سے اودھ جانے لگے تو راستہ بھر اس کی یاد میں خون کے آنسو روئے گئے۔

بر عزمِ سفر عناں کشادم   خوں نابہ ز دیدگان کشادم
بالشکرِ شاہ کوچ بر کوچ   در گریہ ہمی شدم بہر کوچ

اور جب وہاں سے دہلی آنے کی رخصت ملی تو ان کا خود بیان ہے کہ تیر کی طرح اڑتے مسرور اور شاداں دہلی پہونچے تو ان کو ایسا معلوم ہوا کہ خزاں دیدہ پرندہ اپنے باغ میں پہنچ گیا ہے، اور ایک پیاسا آب حیات کے چشمے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

(قران السعدین علی گڑھ، اڈنس، ص 23-222)

دہلی کی تعریف میں

اپنی مثنوی قران السعدین میں دہلی کی اتنی تعریف لکھی ہے کہ یہ مثنوی 'در صفت دہلی' کے نام سے بھی یاد کی جاتی تھی، لکھتے ہیں کہ اس کے دین و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے یہ عدن کی جنت ہے، اپنی صفات اور خصوصیات کے لحاظ سے باغ ارم ہے، ایک راسخ مسلمان ہونے کے باوجود اس شہر کی محبت میں اس کو مکہ اور مدینہ پر ترجیح دی ہے۔ ان کو دہلی پیاری تھی۔ اس لیے اس کی ہر چیز سے پیار تھا، جس کی تعریف میں ان کا قلم بے قابو ہو جاتا ہے، مثلاً قلعہ کے متعلق کہتے ہیں۔

چرخ بہ زیرست و حصارش بہ زیر

(آسمان کا دائرہ نیچے رہ گیا اور اس قلعے کی دیوار اوپر)

اس کے قلعہ کو مینو سرشت بتایا ہے۔ اس کے در و دیوار کی تعریف میں لکھ گئے۔

چرخ نداند در و دیوار کس   تکیہ بدیوار و درش کردہ بس

(اس کا ہر گھر بہشت ہے، اس کی زینت و آرائش میں بے حد رقم خرچ ہوئی ہے)

گوشۂ ہر خانہ بہشتے شگرف   گشتہ بہ صنعت زرِ بے صرفہ صرف

شہر کی جامع مسجد کو فیض الٰہی کی جامع مسجد بتاتے ہیں۔ (قران السعدین، ص 31) قطب مینار کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس مینار کو دیکھ کر چاند نے اپنی ٹوپی اتار پھینکی ہے۔ (ایضاً، ص 32) اس زمانے کے حوض شمسی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ گئے کہ اس کا پانی حضرت خضر پی لیتے تو اپنے چشمے کو بھول جاتے۔ (ایضاً، ص 34) دہلی کی آب و ہوا کی تعریف اس طرح کی ہے کہ خوش گوار نسیم کی وجہ سے اس کے چمن میں پھولوں کی بہار پورے سال رہتی ہے۔ اس کی سرزمین پھولوں کی وجہ سے سونے چاندی سے بھری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں جنت کی ہریالی ہے۔ (ایضاً) دہلی کے لوگوں کی تعریف میں ان کا قلم نشاط انگیز ہو گیا ہے، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ اس شہر کے لوگ فرشتہ سیرت اور جنت والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو ہوتے ہیں۔

مردمِ او جملہ فرشتہ سرشت   خوش دل و خوش خوئے چو اہل بہشت

یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ صنعت، علم و ادب، آہنگ و ساز، نغمہ و سرود، نیزہ و بنگاہ اور تیر کے ہنر میں بے نظیر ہیں۔ (ایضاً) پھر دہلی کے محبوبوں کی مدح پر آتے ہیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید، ندیم اور ہمراز بھی

دہلی تو صرف پائے تخت تھا وہ پورے ہندوستان کے عشق میں سرشار اور مخمور رہے ہیں جوشِ محبت میں ہندوستان کی گرم ہوا کی یہ شاعرانہ تاویل کرتے ہیں کہ آفتاب کو اس سرزمین سے عشق ہے۔ اس کے عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہوگئی ہے اور یہیں سے ساری دنیا میں یہ گرم ہوا پھیل گئی۔

ہیں، بلکہ محض حسن و عشق کے کوچے کے رہ نورد رہے، دہلی کے ایسے بتانِ سادہ نے ان کو اپنی طرف مائل کیا تھا، جو پگڑی باندھتے سر پر ٹوپی رکھتے، اپنے ناز و ادا کی وجہ سے کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے، جہاں گلگشت کرتے وہاں کی گلی ان چلتے پھرتے پھولوں سے معطر ہو جاتی، وہ راستہ چلتے تو عشاق ان کے پیچھے ہوتے، جن کی آنکھوں سے خون جاری رہتا، یہ محبوب تو حسن کا غرور اپنے سر میں رکھتے لیکن ان کے عشاق کا دل برباد ہوتا دکھائی دیتا۔

اے دہلی والے بتانِ سادہ　　پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
فرماں نبرند ازاں کہ ہستند　　از غایتِ ناز خود مرادہ
جائے کہ بہ رہ کنند گلگشت　　درکوچہ دیدگل بیادہ
شاں دررہ و عاشقاں، دنبال　　خوناب زدیدہا کشادہ
ایشاں ہمہ بادِ حسن درسر　　وایں ہا ہمہ دل بباد دادہ

ان محبوبوں کا تعلق کس طبقے سے تھا، اور ان کے پجاری کون تھے، وہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

خورشید پرست شد مسلماں　　زیں ہندوگانِ شوخ و سادہ

شعر میں اس باہمی موانست و یگانگی کا اظہار ہے جو کئی صدی پہلے دہلی میں موجود تھی۔ خود خسرو ان ہندو محبوبوں کی محبت میں جس طرح خراب و سرمست رہے، اس کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

کردہ مرا خراب و سرمست　　ایں مُغ بچگانِ تاک زادہ
بربستہ شاں بموئے مرغول　　خسرو چو سگیست در قلادہ

خسرو دہلی کے 'مُغ بچگان تاک زادہ' کے لیے خراب و سرمست ہو سکتے تھے۔ تو پھر دہلی کے شاہی محلوں کے لیے ان کے جذبات کیوں نہ بے تاب ہوتے، کیلو کھیڑی کے قصرِ نو کی مدح میں بہ کثرت اشعار کہہ گئے ہیں، کہتے ہیں کہ محل کا ہے کو ہے، ایک بہشت ہے، جس کے دروازے پر طوبیٰ کی شاخ سایہ فگن ہے۔

قصر نگویم کہ بہشتے فراخ　　روضۂ طوبیٰ درِ او را بہ شاخ

اس محل کے نیچے جمنا بہتی ہے۔ خسرو نے یہ دل نواز نکتہ پیدا کیا کہ اس کا بہتا پانی محل کی حسینہ کے لیے آئینہ بن گیا ہے۔

طرز عروسے شدہ آراستہ　　آئینہ از آبِ رواں خواستہ

دربار میں جشن نوروز میں جو چہل پہل ہوتی ہے، اس کی مصوری میں بڑی تفصیل کے ساتھ اپنا آرٹ دکھایا ہے کہتے ہیں۔

قصر ہمایوں زمین تا سماک　　زیور زربستہ چوں فردوسِ پاک

یعنی ان کے وطن کے دربار کی زینت و آرائش کا مقابلہ ایران، توران اور خراسان وغیرہ کے درباروں سے نہیں کیا جا سکتا تھا، بلکہ اس کا موازنہ صرف فردوس پاک سے ہو سکتا تھا۔

دہلی تو صرف پائے تخت تھا وہ پورے ہندوستان کے عشق میں سرشار اور مخمور رہے ہیں جوشِ محبت میں ہندوستان کی گرم ہوا کی یہ شاعرانہ تاویل کرتے ہیں کہ آفتاب کو اس سرزمین سے عشق ہے۔ اس کے عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہوگئی ہے اور یہیں سے ساری دنیا میں یہ گرم ہوا پھیل گئی۔

مہرِ فلک گرم شد اندرو فاش　　گرم ازاں گشت جہاں راہواش

ہندوستان کے حسن سے شیفتگی

ہندوستان کے حسن کے سامنے کسی اور جگہ کا حسن بھی ان کو پسند نہیں۔ انھوں نے خلخ اور یغما کے حسن کو اس لیے رد کر دیا کہ ان کے حسین تیز چشم اور ترش رخ ہوتے ہیں۔ خراسان کا حسن وہاں کے پھولوں کا سا ہے۔ یعنی رنگ ہے خوشبو یعنی دل آویزی نہیں۔ ان کو روم اور روس کا حسن بھی نہیں جچا کیونکہ ان کے معیار کے مطابق ان میں عجز و انکسار نہیں۔ تاتاری حسینوں کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی اور ختن کے حسینوں کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا۔ سمرقند اور قندھار کے حسن میں مٹھاس (قند) کی کمی ہے۔ اس طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں چستی اور چالاکی نہیں پاتے۔ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں یہ ساری خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی عجز و انکسار بھی، لبوں پر تبسم بھی، چہرے پر نمک بھی شیرینی بھی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی اس لیے بے اختیار لکھ گئے ہیں۔

بُتانِ ہند رانسبت ہمیں ست　　بہر یک موئے شاں صد ملکِ چین ست

لکھنے کو تو خسرو یہ سب کچھ لکھ گئے۔لیکن ہندوستان کے حسینوں میں ہر قسم کا رنگ پایا جاتا ہے۔سیاہ، گندمی اور سبزہ سیاہ رنگ کی خوبی بیان کرنا ذرا مشکل تھا مگر خسرو نے اس میں یہ کہہ کر شعریت پیدا کر دی ہے کہ آنکھوں کی پتلی تو سیاہ ہوتی ہے۔اس میں آدمی تو سیاہ نظر آتا ہے۔اور ہر پتلی کے لیے سرمہ چاہیے، سرمہ کا رنگ تو سیاہ ہی ہوگا، سفید رنگ تو عارضی ہوتا ہے، اس لیے بے سود ہے۔

سیہ را خود بدیدہ جان گاہ است   کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است
زبہرِ دیدہ باید سرمہ را سود   سفیدہ عارضی رنگے است بے سود

گندمی رنگ کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت آدم نے گندم ہی کو پسند کیا۔پھر اسی گندم سے سارا فتنہ اٹھا۔خسرو کہنا چاہتے ہیں کہ گندمی رنگ کے ساتھ چہرے پر نمک ہو تو چہرے کی سفیدی سے کہیں بہتر یہ رنگ کھلتا ہے۔اس کے لیے یہ تمثیل دیتے ہیں کہ اگر گندم کے آٹے کے ساتھ نمک ملا دیا جائے تو سیکڑوں بے نمک سفید ٹکیوں سے بہتر ہو جاتا ہے۔

بہ گندم گو نست میلِ آدمی زاد   کہ این فتنہ ز آدم یافت بنیاد
یکے گندم بہ کام اندر نمک دہ   زصد قرصِ سپید بے نمک بہ

انھیں ہندوسان کے حسینوں کا سبزہ رنگ بہت پسند تھا۔کہتے ہیں کہ یہ سبزہ رنگ لالہ ونسرین کے رنگ سے بہتر ہوتا ہے۔جنت کے طاؤس کا بھی یہی رنگ ہے۔ستاروں کی زینت بھی اسی رنگ سے ہے۔بہشتیوں کی پوشاک کا بھی یہی رنگ ہے۔بہار کی رونق بھی اسی رنگ سے ہے وغیرہ۔

ہندوستان کے پھولوں کی تعریف

ہندوستان کے پھولوں میں سوسن، کبود، بیلا، گلِ زریں، گلِ سرخ، ریحان، گل کوزہ، گل لالہ، گلِ سفید، صد برگ، نسترن، دونا، کرنا، نیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑا، سیوتی، گلاب اور مولسری وغیرہ کی تعریف میں حسن بیان دکھانے کے ساتھ جذبات سے مغلوب ہوتے نظر آتے ہیں۔مثلاً رائے چمپا کو پھولوں کا بادشاہ قرار دیا ہے۔اس کی خوشبو ایسی ہے جیسے شراب میں کسی نے مشک ملا دیا ہو۔چنبیلی جیسے بدن والے معشوقوں کی طرح نازک ہوتا ہے، اس میں زردی عاشقوں کے چہرے کی سی ہے۔

دگر آں جنبہ شاہ گلہا   کہ بویش مشک بار آمد چو لاہا
چو معشوقِ سمن برناز پرورد   ولے رنگش چو روئے عاشقاں زرد

سیوتی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بھڑ اس پر جان دیتی ہے، مرنے کے بعد بھی اس سے لپٹی رہتی ہے، معشوق عاشق کی طرح اس کے سرگرداں رہتے ہیں۔یہ پھولوں کے معشوقوں کا معشوق ہے۔

زعشق بوئے او جان دادہ زنبور   نہ گشتہ بعد مُردن نیز از و دور
ہمہ خوبانش عاشق زار جویاں   کہ معشوقیست نزدِ خوبرویاں

اسی طرح دوسرے پھولوں کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں جب یہ پھول کھلتے ہیں اور کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں یا ان گھٹاؤں میں سے جب ہلکی پھوار آتی ہے تو گلشنِ فردوس کا باغ نظر آتا ہے، بلکہ فردوس میں بھی ایسا خوش گوار منظر نہ ہوتا ہوگا۔آخر میں لکھتے ہیں کہ ایسے پھول اگر روم وشام میں ہوتے تو وہاں کے لوگ ان کی تعریف دنیا میں کرتے پھرتے۔(قران السعدین، ص133)

ہندوستان کے پھولوں میں سوسن، کبود، بیلا، گلِ زریں، گلِ سرخ، ریحان، گل کوزہ، گل لالہ، گلِ سفید، صد برگ، نسترن، دونا، کرنا، نیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑا، سیوتی، گلاب اور مولسری وغیرہ کی تعریف میں حسن بیان دکھانے کے ساتھ جذبات سے مغلوب ہوتے نظر آتے ہیں۔مثلاً رائے چمپا کو پھولوں کا بادشاہ قرار دیا ہے۔اس کی خوشبو ایسی ہے جیسے شراب میں کسی نے مشک ملا دیا ہو۔

ہندوستانی پھلوں کی پسندیدگی

پھلوں میں وہ آم کے عاشق ہیں۔لکھتے ہیں کہ جو لوگ انجیر کو ہمارے آم پر ترجیح دیتے ہیں وہ اس اندھی عورت کی طرح ہیں جو بصرہ کو شام سے بہتر بتائے۔

زبے انصاف نتواں یافت ایں کام   کہ عمیا بصرہ رابہ گوید از شام
وگر کس سوئے خود گردد جہت گیر   نہد کم نغزکِ مارا زانجیر

ان کو ہندوستان کا خربوزہ بھی پسند تھا۔اس کی تعریف یہ کہ بہشت کے تمام پھلوں سے بازی لے گیا ہے۔قند کی سی مٹھاس اس کے سامنے ہیچ ہے، اس میں آبِ حیات کی تاثیر ہے۔

خربزہ گوئی کہ بہ صحرا و کشت   گوئے ربود از ثمراتِ بہشت
از مزہ گرد آمد دروے نبات   خام خضر پختہ چو آبِ حیات

انھوں نے پان کو بھی ہندوستان کا میوہ ہی قرار دیا ہے۔اس کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی بہترین نعمت ہے۔دیکھنے میں تو ایک گھاس ہے لیکن اس سے خون پیدا ہوتا ہے۔منہ کی بدبو دور کرتا ہے، کمزور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے، سیر ہو کر

کھانے والوں کی بھوک بڑھاتا ہے اور بھوکوں کی بھوک میں کمی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔
(قران السعدین، ص185,86)

ہندوستان کے جانور

خسرو کو اپنے وطن کی ہر چیز پیاری تھی۔ اس لیے یہاں کے جانوروں کے اوصاف بیان کرنے میں بھی ان کے وطنی جذبات خوب ابھرے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ یہاں کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں۔ یہاں کے کوے مستقبل کی خبریں دیتے ہیں۔ یہاں کی گوریائیں بھی پوشیدہ باتوں کی خبر دیتی ہیں۔ یہاں کے طاؤس میں دلہن کی ایسی رعنائی ہے۔ یہاں کے بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب وغریب کرتب دکھاتے ہیں، یہاں کی بکری ایک پتلی لکڑی پر چار پاؤں سے کھڑی ہوجاتی اور تھرکتی ہے۔ یہاں کے ہندو بہ لحاظ عقل اپنی مثال آپ ہیں، یہاں کے ہاتھی عمل میں انسان ہیں وغیرہ وغیرہ۔ (نہ سپہر، ص191)

خسرو کی توجہ ہندوستان کے جادوگروں کی طرف بھی گئی۔ لکھتے ہیں کہ یہاں کے جادوگر مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں، یہاں عمر بھی بڑھائی جاسکتی ہے۔ یہاں کے جوگی حبس دم (سانس روکنے) کی مشق کر کے دو سو سال تک زندہ رہ سکتے ہیں، یہاں کے ابر میں بارش بھی روکی جاسکتی ہے وغیرہ۔ (ایضاً، ص94-191)

ہندوستان کا جو علاقہ ان کے شاہی آقاؤں کے حدود مملکت میں داخل ہوا، ان کی تعریف بھی دل کھول کر کی ہے مثلاً جھائین کے قلعہ کے متعلق مفتاح الفتوح میں لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی بہشت معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نقش ونگار بہت ہی دل فریب تھے، مانی کی تصویریں بھی اس کے سامنے مات تھیں، پتھر کی ایسی سیکڑوں مورتیاں دیکھنے میں آئیں جو موم سے بھی نہیں بنائی جاسکتی ہیں، باغ میں بہت سے بت خانے تھے جن پر سونے چاندی کی نقش گری تھی۔

اسی طرح اپنے دیوان نہایۃ الکمال میں دیوگیر (دیوگری) کی تعریف لکھتے وقت اس کو مصر اور بغداد پر فضیلت دی ہے اور پھر اسی شاعرانہ انداز میں یہ کہہ گئے ہیں کہ مصر نے اس کی شہرت سن کر رشک وحسد میں اپنا جامہ اتار کر نیل میں پھینک دیا ہے، اس کی ہوا میں مسیحائی اور پانی میں آب خضر کی تاثیر بتائی، یہاں کے پھولوں، خوشبوؤں اور پرندوں سبھی کی تعریف کی ہے، یہاں کے پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے کیلے کے متعلق لکھا کہ ہلال کی طرح خم اور عید کی طرح خوش گوار ہوتے ہیں، آموں کو شہد اور دودھ سے بھرے ہوئے سنہرے ڈبے سے تشبیہ دی، کپڑے کی مدح میں کہتے ہیں کہ اگر چاند کی جلد کوئی جلاد اس سے علیحدہ کردے اور پھر اسی جلد سے دیوگیر کے کپڑے کا موازنہ کیا جائے، تو یہ کپڑا اپنی باریکی میں بڑھ جائے گا، اس کا سوگز کا تھان سوئی کے ناکے میں سما سکتا ہے، اس کا لباس بنتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر صاف شفاف پانی پڑ رہا ہے۔

چہ وصف جامہ کنم کانچناں نباشد اگر　　　　زمہ بسلخ کشد پوست اختر جلاد
بہ چشم سوزن صدگز بہ گنجد از پس لطف　　　　درو بہ چلہ خرد نوک سوزن پولاد
بسان قطرۂ آبے توانش گفتن اگر　　　　چکد ز چشمۂ خورشید قطر یامعتاد

دیوگیر کی موسیقی پر بھی فریفتہ ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں کے چنگ کی آواز سے زہرہ بھی نالہ وفریاد کرسکتی ہے۔ اور یہاں کے نغمے سے مردے بھی زندہ ہوسکتے ہیں۔

وگر سرود چناں کز خراش ہر زخمہ　　　　چو چنگ خویش کند زہرہ نالہ وفریاد

خسرو نے اپنے ساززندگی میں اپنی وطنی محبت کا جو نغمہ الاپا تھا۔ وہ ذاتی مفاد اور سیاسی مصالح دونوں سے پاک تھا۔ فراخ دلی، وسیع المشربی سیر چشمی اور وطن دوستی کی جوت جگاکر اپنے ہم وطنوں کو یہ پیام دیا ہے جس ملک میں ان کو ساتھ رہنا اورمرنا ہے، اس کی ہر چیز کو محبوب سمجھیں،اس کے مختلف باشندوں کے ساتھ محبت و الفت سے پیش آئیں، ایک دوسرے کے مذہبی عقائد و جذبات کا احترام کریں، مذہب اس موانعت اور یگانگت میں رکاوٹ نہیں پیداکرتا۔ اور آج بھی اردوخسرو کے اس مشن کولیے آگے بڑھ رہی ہے۔

عجب بنا شد اگر مردہ زندہ گردد ازاں　　　　کہ لفظ در دل ہر نغمہ جان باز نہاد

ان کو ہندوستانی موسیقی کے ساتھ عشق رہا 'نہ سپہر' میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب اور روح دونوں کو جلاتی ہے اور دوسرے تمام ممالک کی موسیقی سے بہتر ہے۔ ہندوستانی موسیقی صرف آدمیوں کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی مسحور کردیتی ہے۔ ہرن کو اس کے ذریعے مسحور کر کے شکار کیا جاتا ہے (نہ سپہر، ص171) اور جس طرح وہ ایرانی اور ہندوستانی تمدن کے حسین امتزاج پر بے حد خوش رہے اسی طرح انھوں نے ہندی راگ اور راگنیوں کو ملانے کی کوشش بھی کی۔

ہندی زبان سے دلدادگی

وہ اس ملک کی عوامی زبان کے بھی اتنے دلدادہ تھے کہ اسی دلدادگی میں معلوم نہیں کتنے ہندی گت، دوہے، معمے، مخمس، چوپائیاں اور نظمیں لکھ کر فخر کے ساتھ یہ آواز بلند کی۔

چو من طوطی ہندم از راست پرسی　　　　ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اور آج یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ امیر خسرو نے ہندی شاعری کو فارسی کے بحور و اوزان سے روشناس کیا اور ہندی کو پراکرت اور اپ بھرنش کے اثرات سے آزاد کر کے خود سادہ، سلیس اور عام فہم زبان لکھی، اس طرح اردو زبان خود بخود وجود میں آتی اور نکھرتی گئی۔

خسرو نے اپنے ساز زندگی میں اپنی وطنی محبت کا جو نغمہ الاپا تھا۔ وہ ذاتی مفاد اور سیاسی مصالح دونوں سے پاک تھا۔ فراخ دلی، وسیع المشربی سیر چشمی اور وطن دوستی کی جوت جگا کر اپنے ہم وطنوں کو یہ پیام دیا ہے جس ملک میں ان کو ساتھ رہنا اور مرنا ہے، اس کی ہر چیز کو محبوب سمجھیں، اس کے مختلف باشندوں کے ساتھ محبت والفت سے پیش آئیں، ایک دوسرے کے مذہبی عقائد و جذبات کا احترام کریں، مذہب اس موانعت اور یگانگت میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتا۔ اور آج بھی اردو خسرو کے اس مشن کو لیے آگے بڑھ رہی ہے۔

■

ماخذ: خسرو شناسی، **مرتبین:** ظ انصاری، ابوالفیض سحر، چوتھی طباعت: 2010،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

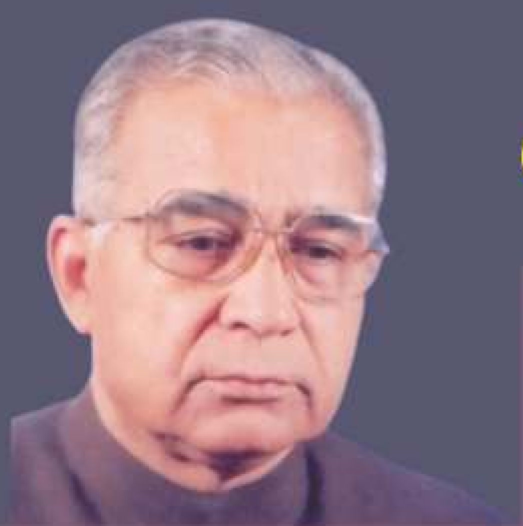

پدم شری
حکیم سید ظل الرحمن
سے گفتگو

حکیم سید ظل الرحمن ایک مشہور یونانی محقق ہیں. آپ کی ولادت یکم جولائی 1940 کوبھوپال مدھیہ پردیش میں ہوئی. ابتدائی تعلیم بھوپال سے حاصل کی. اعلی تعلیم کے لیے آپ نے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماکا رخ کیا, اس بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تعلیم کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خان طبیہ کالج سے وابستہ رہے اور اسی کالج میں چیئرمین کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں. علم الادویہ میں تقریباً چالیس سال کی خدمات کے بعد وظیفہ یاب ہوئے.اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آنریبل ٹریزرار کے عہدہ پر فائز رہ چکے.

حکیم صاحب کا سارا کام طب پر رہا ہے اور وہ بھی دور وسطیٰ کے ادویات, یونانی طب پر. قدیم عربی اور فارسی دستاویزوں کھوج چھان بین اور تحقیقات پر بھی کافی کام کیا ہے. حکیم ظل الرحمن صاحب کو 1997 میں ہمدرد یونیورسٹی کے ویزیٹنگ پروفیسر کا شرف حاصل ہوا. 2013 میں آپ کو ڈاکٹر آف لیٹرس کی ڈگری بھی دی گئی. آپ کو مختلف اعزازات مل چکے ہیں جن میں آیوروید اور طبی اکیڈمی اعزاز, اتر پردیش حکومت, لکھنؤ 1968, اردو اکیڈمی ایوارڈ, لکھنؤ, اتر پردیش حکومت 1974, اردو اکیڈمی ایوارڈ, لکھنؤ, اتر پردیش حکومت 1978, اردو اکیڈمی ایوارڈ, لکھنؤ, اتر پردیش حکومت 1993 قابل ذکر ہیں. فارسی زبان کی خدمت کے لیے سرٹیفکیٹ آف آنرس بھی صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے مل چکا ہے.

عبدالمنان صمدی: جناب حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب باقاعدہ گفتگو کے آغاز سے قبل آپ ہمیں اپنی پیدائش اور اپنے آبادئی وطن سے متعارف کرائیں؟

حکیم سید ظل الرحمن: میری پیدائش 1 جولائی 1940 مدھیہ پردیش بھوپال میں ہوئی اور وہی میرا آبائی وطن بھی ہے۔

ع م ص: اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ح س ظ ر: میرے تعلیم سفر کا آغاز تو بھوپال میں ہی ہوا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے دارالعلوم ندوۃ العلما بھیج دیا گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلما کے بعد میں نے علی گڑھ کا رخ کیا اور اجمل خاں طبیہ کالج سے آگے کا تعلیمی سفر شروع ہوا اور بعد ازاں ملازمت اور سبکدوش بھی اسی ادارے سے ہوا۔

ع م ص: مسلمانوں میں اور بھی مشہور طبیب ہوئے ہیں آپ نے اپنی اکیڈمی کا نام ابن سینا پر ہی کیوں رکھا؟

ح س ظ ر: دیکھیے مسلم تاریخ میں یا طب یونانی میں ابن سینا سے بڑا طبیب اور فلسفی کوئی ہوا ہی نہیں اور محض 58 کی چھوٹی سی عمر میں اس نے طب یونانی میں جو غیر معمولی خدمات انجام دیں اس کی مثال کہیں دوسری نہیں ملتی۔ اور ابن سینا نہ صرف طب یونانی میں بلکہ ان کا شمار مشرق کے مشہور ترین فلسفیوں میں بھی ہوتا ہے۔ ابن سینا نے 450 کتابیں تصنیف کیں جن میں تقریباً 240 ہی باقی ہیں۔ ان میں فلسفے پر 150 اور ادویات پر 40 تصنیفات ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب 'کتاب شفایابی' جو ایک فلسفیانہ اور سائنسی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ان میں بہت چیزیں 1650 تک قرون وسطی کے یونیورسٹیوں میں ایک معیاری طبی کتب کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔ 1973 میں ابن سینا کی کتاب 'طب قوانین' نیویارک میں دوبارہ شائع کی گئی۔ فلسفہ اور طب کے علاوہ ابن سینا نے فلکیات، کیمیا جغرافیہ، ارضیات، نفسیات، اسلامی الہیات، منطق، ریاضی طبعیات اور شاعری پر بھی لکھا ہے۔ یہی تمام وجوہات ہیں جس کے سبب میں نے اپنی اکیڈمی کا نام ابن سینا رکھا۔

ع م ص: آپ کی اکیڈمی میں طب یونانی کے بعد ایک بڑا ذخیرہ اردو ادب کی کتابوں کا بھی ہے لیکن اسلامی کتب آپ کی اکیڈمی میں موجود نہیں جب کہ آپ ہندوستان کے ایک بڑے اسلامی ادارے دارالعلوم ندوۃ العلما کے بھی طالب علم رہے ہیں؟

ح س ظ ر: دیکھیے طب یونانی کے بعد میری دلچسپی اردو ادب سے بہت رہی ہے اس لیے میں نے اردو ادب کی کتب کو جمع کیا جہاں تک اسلامی کتب کا تعلق ہے تو اس کو نہ رکھنے کی ایک بڑی وجہ اس کی ضخامت ہے اور میرے پاس اتنے وسائل موجود نہیں جو اسلامی کتب کا تقاضا پورا کر سکیں۔

ع م ص: آپ نے غالب پر جو نایاب نسخے جمع کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں لیکن غالب کا ہی انتخاب آپ نے کیوں کیا؟

ح س ظ ر: کیونکہ زمانۂ طالب علمی سے ہی غالب میرے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ پورے ہندو پاک میں جو ذخیرہ غالب پر ابن سینا اکیڈمی میں موجود ہے وہ کہیں اور نہیں حتیٰ کہ آپ کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری میں بھی نہیں۔

ع م ص: زبان کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ح س ظ ر: کسی بھی زبان کی موت کی وجہ اس کے قاری کا انحطاط ہے۔

ع م ص: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ح س ظ ر: کہیت گہرا رشتہ ہوتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ زبان ہی تہذیب وثقافت کا مادہ ہے۔

ع م ص: رسم الخط کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ح س ظ ر: رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہوتی ہے اگر رسم الخط سے Compromise کر لیا جائے تو زبان کی روح نکل جائے گی مثال کے طور پر آپ پنجابی زبان دیکھیے ہندوستان کا پنجابی بولنے والا پنجابی زبان کو ہندی رسم الخط میں لکھتا ہے اور پاکستان کا اردو رسم الخط میں لکھتا ہے۔

ع م ص: آپ نے طب یونانی کے تعلق سے متعدد کتابیں لکھی کیا اردو ادب کے تعلق سے بھی آپ نے کچھ تحریر کیا ہے؟

ح س ظ ر: دیکھیے آپ میرے متعلق اتنی ہی معلومات

فراہم کر کے آئے ہیں جتنی لوگوں سے آپ کو حاصل ہوئی اگر آپ اس انٹرویو سے قبل تھوڑی تحقیق کر لیتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اردو ادب میں میری کیا خدمات رہی ہیں طب یونانی کی طرح اردو ادب کے تعلق سے میری متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ چند فکری و تاریخی عنوانات، بھوپال کا علمی و ادبی کارواں، خطوط مشاہیر بنام پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، ایران نامہ، حکیم سید احسن اللہ خان، غالب چند مقدمے اور تحریریں، دیوان غالب مطبوعہ 1863 عکسی، مقدمہ حکیم سید ظل الرحمٰن، راس مسعود، سفرنامہ بنگلہ دیش، یہ وہ کتابیں ہیں جو اردو ادب کے متعلق لکھی گئی ہیں شاید نہیں بلکہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتابیں آپ کی نظر سے گذری تک نہیں ہوں گی اس میں آپ کی بھی خطا نہیں کیونکہ میری شناخت ہی طب یونانی سے ہے۔

ع م ص: اردو کے ایک بڑے شاعر معین احسن جذبی نے کافی عرصے پہلے کہا تھا کہ مشاعرے اب ادب کا معیار نہیں رہے آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ح س ظ ر: مشاعرے کبھی ادب کا معیار نہیں رہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ و علمی اور ادبی قسم کے اشعار آپ کو مشاعرے میں سننے کو نہیں ملیں گے مشاعرے میں جو لوگ ہوتے ہیں وہ عوام الناس ہوتے ہیں ان میں اکثر غیر اردو طبقہ ہوتا ہے اس لیے مشاعروں کا معیار کبھی بھی ادبی نہیں رہا۔

ع م ص: ادبی حلقوں میں زیادہ تر کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو ہوتی ہے کیا اس بحث سے تکرار زبان کو فائدہ ہوتا ہے؟

ح س ظ ر: دیکھیے یہ سب بحثیں وتکرار محققین اور جو علمائے ادب کی ہیں اور ان کے درمیان ہمیشہ رہیں گی۔

ع م ص: کیا آپ کو بھی ایسا لگتا ہے کہ مدارس میں جو نصاب تعلیم ہے اس میں کچھ نہیں تو اردو ادب کا اضافہ ہونا چاہیے؟

ح س ظ ر: نہیں مجھے بالکل ایسا نہیں لگتا آپ مدارس کے نصاب تعلیم میں اضافے یا اس کی تبدیلی پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں کبھی آپ نے بی ٹیک کرنے والے کو اردو ادب پڑھانے کا مشورہ دیا ہے بی ٹیک چھوڑ دیں کیا کسی نے BUMS کے نصاب تعلیم کو ادب پڑھانے یا اس میں تبدیلی پر کوئی رائے دی ہے۔ دیکھیے کوئی گریجویشن 3 سال یا 4 سال یا 5 سال سے زائد کا نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی درس نظامی کا کورس آٹھ سال سے کم کا آپ کو نظر نہیں آئے گا اور ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ مدارس نے اردو، عربی، فارسی کی بقا کے لیے جو غیر معمولی خدمات دیں اس طرح کی خدمات ہماری بڑی بڑی جامعات نے بھی نہیں دیں۔

ع م ص: سرجو رسائل حکومت کے تعاون سے نکلتے ہیں مثلاً اردو دنیا، فکر و تحقیق، آج کل، نیا دور، ایوان

یقینا فروغ ہوگا کیا اردو زبان میں پہلے کسی زبان کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ عربی، فارسی، کے ساتھ ساتھ اردو میں سنسکرت کے بھی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں زبان گفتگو کا وسیلہ ہوتی ہے اگر آپ اپنی زبان میں دیگر زبان کے الفاظ نہیں لائیں گے تو آپ کی زبان محدود ہوجائے گی، سنسکرت کی صورت حال سے آپ بخوبی واقف ہوں گے اور اردو تو ویسے بھی لشکری زبان ہے۔ اس کی خوبصورتی ہی یہی ہے کہ اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

اردو، بچوں کی دنیا، خواتین کی دنیا، کیا آپ کو نہیں لگتا کہ حکومت کو اور رسائل نکالنا چاہیے؟

ح س ظ ر: دیکھیے اردو والوں سے مجھے بڑی شکایت یہ ہے کہ نہ وہ اردو کے اخبار خریدتے ہیں نہ اردو رسائل اور نہ کتابیں خاص طور پر ہمارے شعبہ اردو کے اساتذہ کو اگر آپ مفت کتاب بھی پیش کردیں تو وہ اس کو پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کریں گے جب تک کسی زبان کے خریدار نہیں ہوں گے تو کیسے کام چلے گا پھر ہم اردو والے شکایت کرتے کہ حکومت اردو والوں کو اشتہار نہیں دیتی کیوں دے آپ کا اخبار پانچ ہزار چھپ رہا ہے پانچ لاکھ وہ ان زبانوں کو دے گی جو پانچ لاکھ چھپ رہے ہیں یا آپ کو دے گی آپ سے کوئی عقیدت یا تقدس وابستہ نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اشتہار ان لوگوں کو ملے گا جو بڑی تعداد میں چھاپ رہے ہیں بہت تکلیف ہوتی ہے جب دیکھتا ہوں کہ اردو والوں کے ہاتھوں میں دوسری زبان کے اخبار ہیں بہت رنج ہوتا ہے۔ ہم اپنی زبان کی خاطر پانچ روپے روز خرچ نہیں کر سکتے۔ اس بدنصیبی کو کیا کہا جائے اس کا شکوہ کس سے کیا جائے اس کا تو کوئی تعلق حکومت سے ہے نہیں اور جو رسائل غیر سرکاری نکل رہے ہیں میں تو ان کے نکالنے والوں کو داد دیتا ہوں کہ وہ اپنے ذوق وشوق سے نکال رہے ہیں وہ ان کی آمدنی کا ذریعہ تو ہے نہیں وہ ان کا شوق ہے۔

ع م ص: کیا اردو زبان میں روزگار کے مواقع کم ہیں اس لیے بھی نئی نسل اردو کا انتخاب کرنے سے کتراتی ہے۔

ح س ظ ر: یہ وجہ ضرور ہے لیکن روزگار کا مسئلہ صرف اردو کے طلبا کے ساتھ نہیں بلکہ دیگر مضامین کے طلبا کے ساتھ بھی ہے۔ آپ کو اسی علی گڑھ میں ایک جم غفیر ان بے روزگار طلبا کا بھی مل جائے گا جن کا تعلق سائنسی مضامین سے لیکن وہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتے جیسے اردو کے طلبا ہوتے ہیں۔

ع م ص: اور ان کے احساس کمتری کے وجہ کیا ہے؟

ح س ظ ر: ایک وجہ تو وہی ہے کہ جو جگ ظاہر ہے کہ اردو میں روزگار بہت کم ہے اور دوسرا سبب وہ ہے جو آپ کو پہلے بتا چکا ہوں اردو رسائل و اخبارات کے قارئین کا انحطاط۔

ع م ص: اب اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے جارہے ہیں اس سے زبان کو فروغ ہوگا یا نقصان؟

ح س ظ ر: یقیناً فروغ ہوگا کیا اردو زبان میں پہلے کسی زبان کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ عربی، فارسی، کے ساتھ ساتھ اردو میں سنسکرت کے بھی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں زبان گفتگو کا وسیلہ ہوتی ہے اگر آپ اپنی زبان میں دیگر زبان کے الفاظ نہیں لائیں گے تو آپ کی زبان محدود ہوجائے گی، سنسکرت کی صورت حال سے آپ بخوبی واقف ہوں گے اور اردو تو ویسے بھی لشکری زبان ہے۔ اس کی خوبصورتی ہی یہی ہے کہ اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

ع م ص: کیا علی گڑھ میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد اب اتنی ہے جتنی آپ کے طالب علمی کے زمانے میں یا اب سے دس پندرہ سال پہلے تھی ایسا کیوں؟

ح س ظ ر: یقیناً اس کا جواب آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کیونکہ آپ کا بھی تعلق اسی شہر سے بلکہ علی گڑھ تو آپ کا آبائی وطن ہے۔ آپ نوجوان بھی ہیں میرا تو باہر نکلنا ہی بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے اس سوال کا جواب آپ کے پاس مجھ سے بہتر ہوگا۔

ع م ص: کیا اردو کے فروغ کے لیے گھر کے تمام افراد کو اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔

ح س ظ ر: نہیں صرف اردو آنی چاہیے۔

ع م ص: کیا آپ کے اہل خانہ اردو پڑھنا لکھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ح س ظ ر: الحمداللہ بلکہ میری بیٹی 'صفیہ اختر' کی تو 'اردو شاعری کی تدریس کے مسائل' کے عنوان سے ایک تصنیف بھی منظر عام پر آچکی۔ جس کو ابن سینا اکاڈمی، تجارہ ہاؤس دودھ پور نے گذشتہ سال شائع کیا جس میں شاعری کی تدریس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

ع م ص: کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے بعد بھی آپ گھر میں اسی طرح زندہ رہے گی جس طرح آج ہے۔

ح س ظ ر: دعویٰ تو نہیں کرسکتا کیونکہ دنیا کی رفتار کا اندازہ عمر کے اس مرحلے پر لگانا میرے لیے ممکن نہیں لیکن امید ہے کہ انشاء اللہ ضرور زندہ رہے گی۔

ع م ص: ہم غیر مسلم بھائیوں میں اردو کو کس طرح فروغ دے سکتے ہیں؟

ح س ظ ر: ان کو ان کے اسلاف کی خدمات سے متعارف کرا کے تقسیم سے پہلے کی تاریخ کا اعادہ کرا کے جہاں اردو ہندوستانی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ نا کہ مسلمانوں کی زبان کا۔

ع م ص: اور وہ کس طرح؟

ح س ظ ر: ان کو پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منشی ہرگوپال تفتہ، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نارائن چکبست، فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، بلراج کومل وغیرہ کی خدمات سے متعارف کرائیں۔

ع م ص: اور جو طبقہ مسلمان ہے لیکن اس کا شمار غیر اردو حلقے میں ہوتا ہے اس کے لیے آپ کیا حکمت عملی اختیار کرنے کا مشورہ دینا چاہیں گے؟

ح س ظ ر: پہلے تو میں یہی کہوں گا کہ افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان کا بھی شمار غیر اردو حلقے میں ہوتا ہے اس برصغیر میں دیکھیے یہ حقیقت کہ زبان کسی قوم وملت ملکیت نہیں ہوتی اور اردو کے تو خاص طور پر کسی مذہب یا قوم و ملت کی ملکیت نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کے فروغ میں ہندو مسلم دونوں قوموں کی قربانیاں برابر ہیں، لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کی اردو کے تئیں ذمے داری زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ مسلمانوں نے اردو کو نہ صرف ادب تک اپنایا بلکہ اپنی مذہبی کتابوں کو بھی عربی، فارسی سے اردو زبان میں منتقل کیا۔ آپ کو اس بات کا علم ہوگا برصغیر میں سب سے پہلے قرآن کا اردو لفظی ترجمہ 1786 میں شاہ رفیع الدین نے کیا۔ اور آگے چل کر نہ صرف قرآن کے اردو تراجم ہوئے بلکہ احادیث اور فقہ کی کتابوں کو بھی ہمارے بزرگوں نے اردو زبان میں منتقل کیا۔ دیکھیے برصغیر کے مسلمان کو یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ یہ دینی اثاثے تین زبان میں مستند انداز میں موجود ہے۔ عربی، فارسی اور اردو میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی زبان میں کام نہیں ہوا ہے لیکن جس نوعیت کی کتابیں فی الحال عربی، فارسی اردو میں موجود ہیں وہ انگریزی زبان میں نہیں ہیں۔ اب مسلمانوں کے بچے عربی، فارسی میں دسترس حاصل کرنے سے تو رہے کیونکہ انگریزی کی طرح یہ دونوں زبانیں بھی ان کے لیے غیر ملکی زبان ہیں۔ تو ان کے پاس اردو زبان کو سیکھنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ دیکھیے اس کے لیے ایک حکمت عملی یہ اختیار کرنی ہوگی کہ مسلمان اپنے بچوں کو میٹرک تک اردو ضرور پڑھائیں یعنی ان کو آٹھویں جماعت کے اختیاری مضمون کے طور پر اردو دلائیں۔ اردو کے فروغ کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ہر طالب علم BA,MA اردو زبان سے کریں اردو میں ایک کثیر تعداد جن کا تعلق دوسرے شعبوں سے رہا اور انھوں نے اردو کی خدمات میں وہ کردار ادا کیا جو خود اردو والے نہیں دے سکیں۔ فراق، وحید اختر، اسلوب احمد انصاری، اور تنقیدی میدان میں ایک بڑا نام شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے جن کا تعلق شعبہ انگریزی سے تھا لیکن اردو تنقید میں فاروقی صاحب ایک مکمل ادارے کی حیثیت رکھتے ہی۔

ع م ص: آپ کو حکومت ہند نے 2005 میں پدم شری اعزاز سے نوازا۔ آپ نے اردو ادب کو بھی اپنی خدمات دیں ہیں اس کے لیے کوئی اعزاز حکومت ہند کی طرف سے ملا۔

ح س ظ ر: دیکھیے پدم شری تو مجھے طب کی خدمات کے لیے ملا جو میرا اصل میدان ہے اردو ادب میں میری خدمات فقط شوق و ذوق کی حد تک ہے۔ پھر بھی مجھے اردو اکیڈمی لکھنؤ نے 1968، 1974، 1978 اور 1993 میں اعزازات سے نوازا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ع م ص: عثمانیہ یونیورسٹی کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جس کا قیام 1998 میں عمل میں آیا جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس سے اردو زبان کو فروغ ہوگا؟

ح س ظ ر: بالکل ہوگا جب اردو ذریعہ تعلیم ہوگا تو ظاہر ہے اردو کو فروغ ہوگا اس سے میں کیا شبہ ہے یہ تو شبے سے بالاتر بات ہے۔

ع م ص: کیا آپ اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں آپ کی نظر میں اردو کا مستقبل کیسا ہے؟

ح س ظ ر: میں بالکل مایوس نہیں 1947 کے بعد جو اچانک صورت حال رونما ہوئی 1960 تک رہی جو پانچویں صدی کی دھائی اور چھٹی صدی کی دھائی میں تھی وہ اب بالکل نہیں ہے البتہ دو نسلوں کا نقصان ہوا ہے۔ ہماری ایک نسل میں 29-25 سال ہوتی ہے 60-50 تک اردو کی طرف ہماری توجہ کم رہی اب توجہ بڑھ رہی ہے لوگ اپنے بچوں کو اردو پڑھا رہے ہیں میرے سننے میں یہاں تک آیا ہے کہ بہت سی مساجد کے اندر شام کے وقت جہاں قرآن کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی ہے ان بچوں کو جن کے اسکول میں اردو نہیں ہے بیداری تو پیدا ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا مستقبل بہت تابناک ہے۔

ع م ص: NCPUL کی خدمات کے تعلق سے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں:

ح س ظ ر: کوئی شک نہیں ہے NCPUL نے بڑا کام کیا اور تقریباً دو ہزار کے قریب کتابیں شائع کی ہیں۔ ظاہر ہے اس سے بہت مدد ملی ہے اردو کے مطالعے میں اردو کی اشاعت میں بہت بڑا حصہ ہے اس ادارے کا اس کا اعتراف کرنا چاہیے ہر وقت شکوہ شکایت لعن طعن سے کام نہیں چلتا بلکہ جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کی تحسین ہونی چاہیے۔

ع م ص: بہت شکریہ آپ کا ہمیں وقت دینے کے لیے۔

■

Abdul Mannan Samadi
H. No.:2939, Gali 5, Tayyab Colony Koil
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:9286300994
abdulmannansamadi123@gmail.com

محمد محمود الحسن

احمد یوسف کی افسانہ نگاری

احمد یوسف جدید افسانہ نگاروں میں ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔انھوں نے جدیدیت کے اہم نظریات کو اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا سفر 1948 سے 2004 تک محیط ہے۔ تقریباً نصف صدی کے تخلیقی سفر میں کسی فنکار کا مختلف ادبی تحریک ور حجان سے متاثر ہونا فطری امر ہے۔ یہی معاملہ احمد یوسف صاحب کا بھی ہے۔جس زمانے میں موصوف نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا،اس زمانے میں نہ صرف وہ فکری طور پر ترقی پسندی سے متاثر تھے بلکہ تعلیمی سطح پر بھی اس میں ان کی سرگرم شمولیت تھی۔ان کے ابتدائی افسانے مثلاً 'میں کاریگر' (1949)، 'عبدالرحیم ٹی اسٹال' (1961) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غریب اور پسماندہ لوگوں پر بڑی ژرف بینی سے روشنی ڈالتے ہیں۔جس کے نتیجے میں ان کے شدائد و آلام کی بھرپور عکاسی ہوجاتی ہے۔احمد یوسف کے ابتدائی افسانوں میں سماجی ناانصافیوں اور استحصال کے خلاف احتجاج کی صدا خاصی بلند ہے۔لیکن خالص ترقی پسندانہ فکر ان کے افسانوں سے دھیرے دھیرے مفقود ہونا شروع ہوجاتی ہے اور ان کی جگہ جدیدیت کے رنگ وروغن چڑھنے لگتے ہیں۔احمد یوسف کے ابتدائی افسانوں کے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''ابتدائی افسانوں کا مطالعہ کیجیے تو جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ترقی پسندی کی ابتدا اور عروج کے زمانے میں احمد یوسف نہ صرف اس تحریک سے وابستہ رہے بلکہ ان کے افسانے کے خدو خال بھی ترقی پسند عناصر سے بیش از پیش منور رہے یعنی پریم چند کے بعد ایک طرف رومانی آہنگ سے پرہیز کرنے کی کوشش رہی تو دوسری طرف زندگی کے دو تقاضے جن کا بیشتر حصہ سماجی استحصال پر مبنی ہے وہ افسانے کی خدوخال بنے۔ یہ اور بات ہے کہ رومانیت یکسر ختم نہیں ہوئی۔ قابل لحاظ اور مستند ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر کسی مرحلے میں بھی اس عنصر کو فراموش نہ کرسکے۔لیکن احمد یوسف کے بیشتر افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی چیرہ دستیوں اور سماج کے استحصالی تیور کو شدت سے محسوس کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں بھی یہ عنصر خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔''[1]

قابل ذکر ہے کہ 1960 کے بعد سے ان کے یہاں جدید طرز کے افسانے ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہیں سے ان کے افسانوں میں علامت و تجرید اور ابہام کی شمولیت ہونے لگتی ہے۔ ایسے افسانوں میں شادی کا دوسرا لمحہ، سایۂ آہو، میرا ہی لہو، تلوار کا موسم، ایک لپکتے دن کا آخری جام، ہم تھے اور شہر تھا، سنگین کے دو کنارے، مخالف سمتوں کا سفر اور 'پتھر کی زبان' وغیرہ اہم ہیں۔

جدید اردو ادب بالخصوص جدید افسانے کا ایک اہم پہلو عصری حسیت ہے۔ اس دور کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے انسانی صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کا انسان بے گانگی، عدم تشخص اور تنہائی کے احساس کا شکار رہا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے اس عہد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنا کر انسانی صورت حال کی تصویر پیش کی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی اندھا دھند ترقی کے منفی اثرات، عالمی جنگ کا خطرہ، دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان رسہ کشی، قدروں کی شکست و ریخت، انسانی رشتوں کا ٹوٹنا، سیاسی جبر اور معاشی وجوہات سے ترک وطن اور ہجرت، اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تہذیبی ونفسیاتی مسائل ،نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات، آزادیٔ نسواں کی تحریک اور عورتوں کے گوناگوں مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جدید افسانے کا ایک اہم موضوع انسان اور انسانیت کا زوال بھی ہے، جسے جدید افسانہ نگار خیال کی صورت میں نہیں بلکہ احساس کی سطح پر اجاگر کرتے رہے ہیں۔ان ہی موضوعاتی خطوط کے آئینے میں احمد یوسف کی افسانہ نگاری کا جائزہ مقصود ہے۔ احمد یوسف کے متعلق معروف افسانہ نگار حسین الحق نے لکھا ہے:

''احمد یوسف بڑے فنکار تھے یا نہیں اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا،مگر وہ ایک زندہ فنکار ضرور تھے۔ابتدا سے انتہا تک احمد یوسف سوالات سے جوجھتے رہے اور بڑی بات ہے کہ قاری بھی ان کے ساتھ ان سوالوں کی تپش ضرور محسوس کرتا رہا۔''[2]

دراصل احمد یوسف کا معاشرتی اقدام کے تعلق سے اپنا ایک نظریہ تھا۔اقدار کی گراوٹ ان کے ذہن و دل کو جھنجھوڑتی ہے۔ ان کے سامنے طرح طرح کے سوالات قائم کرتی ہے کہ آخر اس انحطاط کی وجوہات کیا ہیں اور پھر ان کا تدارک کس طرح ہو؟ یہ سوالات افسانوں کے ذریعے بھی انھوں نے قارئین کے ذہنوں میں ڈالنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان میں اس کے حل کے لیے احساس بیدار ہو۔

اردو کے بہت سے ادبا احمد یوسف کو پرانی قدروں کی زندہ تصویر اور اگلی شرافت کا نمونہ مانتے ہیں۔احمد یوسف عوام اور بطور خاص اقلیتی طبقے کو بھی ان اعلیٰ اقدار سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ یہاں جدید افسانہ نگار مسعود اشعر کے افسانہ 'بچھڑے کا گیت' کا ذکر بے محل نہیں

ہوگا کہ اس افسانے میں درخت زندگی کی بنیادی انسانی قدروں کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ اس افسانے میں جس واقعے کو پیش کیا گیا ہے وہ انسانی اقدار کے تعلق سے پائی جانے والی ایک عام لاتعلقی اور بے حسی کا رویہ ہے۔ بستی میں ایک پرانے شجر سایہ دار کو کاٹا جارہا ہے۔ بستی والوں کے لیے یہ عام سی بات ہے لیکن صرف ایک شخص ہے جسے درخت کا کاٹا جانا نہایت سنگین اور المناک عمل معلوم ہوتا ہے۔ درخت کاٹنے والوں کا جواز یہ ہے کہ ہائی ٹینشن پاور لائن کے لیے درخت کا کاٹنا ضروری ہے۔ حساس انسان کسی بھی طرح درخت کو کٹنے سے بچانے کے لیے دفاتر کا چکر لگاتا ہے لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔ کیونکہ بستی والوں کا احساس وشعور مردہ ہوچکا ہے۔ وہ لوگ درخت کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک کہانی احمد یوسف کے یہاں قتل گاہ کے عنوان سے ہے۔ 'قتل گاہ' ہے جس میں درخت کے پیرائے میں قدروں کے زوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اجنبیت، تنہائی، عدم تشخص اور زندگی کی لایعنیت کے احساسات جدید دور کے بڑے المیے ہیں۔ اجنبیت یا بے گانگی کے رویے سے انسانی معاشرہ بہت متاثر ہوا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمارے وطن عزیز کی تہذیب تکثیری ہے۔ ہم ہندوستانی اپنی کثیر المذہبی اور کثیر لسانی تہذیب پر نازاں رہتے ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زبان کے تعلق سے اب بھی ہمارے دلوں میں تعصبات کثیر، تحفظات موجود ہیں۔ یہاں مثال کی گنجائش نہیں۔ اس ضمن میں احمد یوسف کا افسانہ 'قصہ حجام کے ساتویں بھائی کا' بڑا اہم ہے جس میں لسانی اور علاقائی تعصب کے ایک واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ لسانی عصبیت کی وجہ سے ایک مزدور، جو مغربی بنگال میں رہتا تھا، دہشت وتشدد کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے حال زار کا بیان ایمائی طرز اظہار سے کرتا ہے۔ غیر زبان کے علاقے میں دوسرے خانہ خرابوں کی طرف اجنبیت کی سزا جھیلنے والے مزدور کے حال زار پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے فنکار نے المناکی کی وہ داستان رقم کی ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سقوط بنگال کا خون آشام منظر نامہ اپنی تمام تر وحشت و بربریت کے ساتھ متحرک اور روشن نظر آتا ہے۔ وقت کی کمی بھی جدید دور کا بڑا مسئلہ ہے۔

انور سجاد کا افسانہ 'چھٹی کا دن' میں وقت کی کمی کے احساس کو ابھارا گیا ہے کہ دفتری زندگی فرد کو کس حد تک متاثر کرتی ہے۔ احمد یوسف کا افسانہ 'ملاقاتیں' اسی بیگانگی اور عدیم الفرصتی کا السیاتی بیان ہے جس میں افسانے کے مرکزی کردار کا اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے جانا محض خانہ پری ہے۔ وہ صرف رشتہ داروں سے ملاقات اس لیے کرتا ہے تاکہ ان کی دیرینہ شکایت دور ہوجائے۔ یہ جدید دور کی عدیم الفرصتی اور مادہ پرستی کا نتیجہ ہے۔ افسانہ 'بڑے گپتا چھوٹے گپتا' دو بھائیوں کے درمیان کی لاتعلقی اور بے گانگی کی کہانی ہے۔ 'بڑے گپتا' اپنے چھوٹے بھائی کے بیمار ہونے پر اس کی عیادت کو تو نہیں جاتے لیکن ایک بے مروت سا تبصرہ کرتے ہیں کہ اس کا بھائی کھاتا پیتا نہیں ہے، پیسے بچاتا ہے۔ نیز یہ کہ اسے اچھی بیوی نہیں ملی۔ یہ بے مروتی کی باتیں دراصل عصر حاضر کی بڑھتی اجنبیت اور بے گانگی ہے جس نے بھائیوں کے قلبی لگاؤ کو بھی کمزور کردیا ہے۔ احمد یوسف کردار کی نفسیات تک پہنچتے ہیں اور عصری حسیت سے کام لیتے ہیں۔ مہدی جعفر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''احمد یوسف کے کردار عصری رفتار کا قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اس مشاہدے سے اپنے داخل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ افسانوں کا ماحول قدیم وجدید کے باہم ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے نتائج کے طور پر ابھرا ہے۔ مجموعی طور پر احمد یوسف نسلی خلیج کی عکاسی قدامت کے زاویے سے کرتے ہیں۔ پرانی نسل کی نظر سے دیکھیے تو زندگی کی بڑھتی ہوئی تیز رفتاری، اس سے ابھرتے ہوئے مصائب اور آلام، پھیلتی ہوئی آبادی کا دباؤ، وقت کی تنگی، ذہنوں کا انتشار، جذباتی بے کیفی، ماحول کی سنگینی، گراں باری اور عہد حاضر کی خونیں اور سفاک تلوار نظر آتی ہے۔ البتہ وہ کنارا جس پر شاید فن کار کھڑا ہے وہ داخلی طور پر پرانے وقتوں کا پس منظر پیش کرتا ہے جس میں عصریت کا رد عمل ہے۔ احمد یوسف عصری حسیت کو عموماً ایک مشاہدے کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔ وہ حسیت جسے نئی نسل اپنی شمولیت یا جدوجہد کے ذریعے حاصل کرتی ہے اسکی عکاسی کم ہو پائی ہے۔''[3]

تنہائی کا احساس بھی جدید دور کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ آج کا انسان کرب، تنہائی اور غم والم میں مبتلا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے اس اہم مسئلے کی طرف بھی قاری کا ذہن مبذول کرایا ہے۔ قدروں کی شکست وریخت نے رشتوں میں بھی بکھراؤ کی صورت پیدا کی ہے۔ پہلے پورا قصبہ ایک خاندان ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ سمٹ کر گھروں تک محدود ہوگیا اور آج کے دور میں اس نے فلیٹوں میں اپنی پناہ گاہ بنائی ہے۔ صرف ماں باپ اور بچے والا گھر جسے Nuclear Family کہا جاتا ہے، جدید دور کا بڑا سانحہ ہے، کیونکہ آج آرام وآسائش کے سبھی سامان تو انسان کے پاس موجود ہیں مگر ایک دوسرے سے بیگانگی اور رشتوں کی بے قدری نے انسانوں کو اکیلا کردیا ہے۔ افسانہ 'زندگی میں خلا' میں خالد سہیل نے ایک عورت کی کہانی بیان کی ہے کہ بیٹا اور بیٹی کے چلے جانے کے بعد وہ عورت اور اس کا شوہر اکیلے پن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایک دن اچانک اس عورت کے شوہر کا انتقال ہوجاتا ہے اور پھر وہ گھر میں تن تنہا رہ جاتی ہے اور پھر ایک دن وہ بھی آتا ہے جب تنہائی کا کرب اس عورت کی جان لے لیتا ہے اور اس کی موت کی دریافت پینشن آفس کے کلرک ذریعے اس وقت ہوتی ہے جب اسے یہ تشویش لاحق ہوجاتی ہے کہ وہ عورت اس ماہ پینشن لینے کیوں نہیں آئی۔ اسی نوعیت کا افسانہ ترنم ریاض کا 'شہر' بھی ہے، جس میں ایک عورت کی لاش بند کمرے میں پائی جاتی ہے اور افسوسناک صورت حال میں ہوتی ہے کہ پڑوسی کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کتنے دنوں سے اس عورت کے گھر کا دروازہ نہیں کھلا۔ احمد یوسف کے یہاں بھی اس نوع کے افسانے ہیں۔ افسانہ 'خاموشی کے حصار میں' اس میں تنہائی اور احساس محرومی کا بیان موثر انداز میں ہوا ہے۔ یہ افسانہ ایسے والدین کے احساس محرومی اور درد کے جذبات کا ترجمان ہے، جن کے بچے غیر ممالک یا پھر کہیں دور دراز کے صوبوں میں رہتے ہیں۔ والدین کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دریا کے ایک کنارے پر اگر ہم کھڑے ہیں تو دوسرے کنارے پر عندلیب اور اس کے کچھ فاصلے پر مختار کھڑا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب اسی کنارے پر آملتے ہیں، جلدی جدا ہونے کے لیے۔ اس کے بعد ہم ہوتے ہیں اور محرومی اور تنہائی کا نہ ختم ہونے والا کرب۔''[4]

اس ذیل میں ایک اور افسانہ 'ایک ایک دن کا حساب' بھی ہے۔ یہ افسانہ سبکدوش ہیڈ کلرک اسد علی کے اکیلے پن کا نوحہ ہے۔ سبکدوشی کے بعد انسان

اکیلے پن کا شکار ہو جاتا ہے اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ معاشرے میں دھیرے دھیرے اس کی معنویت اور عزت میں بھی کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ افسانے میں شروع سے آخر تک اسد علی اپنے ماضی اور حال کا موازنہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سب آسائشوں کے باوجود انھیں دنیا بے رنگ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی زندگی ایک محدود دائرے میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

’’اسد علی سوچتے ہیں کہ زندگی جو ہمیشہ ایک ہی پٹری پر گھومتی رہی تھی، گول سا دائرہ بناتی ہوئی پٹری پر، ریٹائرمنٹ کے بعد تو اور بھی چھوٹے دائرے میں گھومنے لگتی تھی۔ مہینے کے پہلے ہفتے ایک بینک سے اپنی پینشن لینا، ان کی زندگی میں یہی ایک کام رہ گیا تھا۔‘‘[5]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسد علی مقصدی سرگرمی کے نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انسان ملازمت میں ہوتا ہے تو لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں لیکن سبکدوشی کے بعد حالات بدل جاتے ہیں اور لوگ طوطہ چشمی کرنے سے باز نہیں آتے۔ جب اسد علی اپنے ایک جونیئر سنہا سے ملنے اس کے گھر پر جاتے ہیں تو انھیں جواب ملتا ہے کہ وہ سو رہے ہیں۔ اس بات سے اسد علی کو سخت مایوسی ہوتی ہے جس کا اظہار افسانہ کے اختتام پر اس طرح ہوا ہے:

’’آج کا دن بھی عجیب تھا۔‘‘

’’بہت ہی عجیب‘‘ ....‘‘[6]

احمد یوسف کے اور بھی کئی افسانوں میں یہ احساس شدت کے ساتھ موجود ہے جن میں میرا ہی لہو، تلوار کا موسم، قربت کی دوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جدید افسانہ نگاروں نے نسلی تفاوت کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی Generation Gap کی بات کی جانے لگی تھی۔ حالانکہ اس موضوع پر پہلے بھی افسانے لکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ’صرف ایک سگریٹ‘ اور ’ایک باپ بکاؤ ہے‘ کو ہی لیا جاسکتا ہے جن میں اس موضوع کو معنی خیز طریقے سے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ’پاگل‘ بھی اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں دو مختلف مکتبہ فکر کے باہمی تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جدید افسانوں میں ’دو بھیگے ہوئے لوگ‘ (اقبال مجید)، ’نئے قدموں کی چاپ‘ (سریندر پرکاش)، ’دلدل‘ (شرون کمار)، ’پہلی موت‘

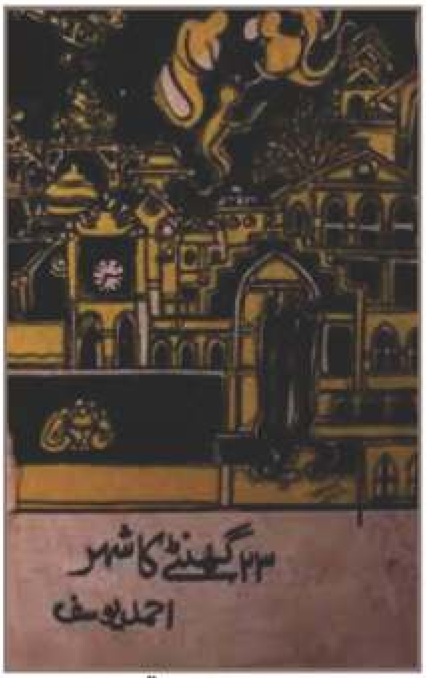

(قمر الدین) وغیرہ افسانے بھی اسی قبیل کے ہیں۔

احمد یوسف کے یہاں بھی نسلی تفاوت اور مختلف مکاتب فکر کے تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک افسانہ ’رشتہ‘ ہے جس میں روایتی اور نئی سوچ کے درمیان ٹکراؤ کی صورت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ مختصر مکالمہ ملاحظہ کریں جو ایک نوجوان کردار کی زبانی ادا ہوتا ہے:

’’تم ماضی اور روایت لپٹے ہوئے کیڑے.... تمھارا اپنا کیا ہے؟.....جب بھی تمھیں کسی شے کی ضرورت ہوتی ہے، تم اسے ماضی کے بھنڈار سے نکال لاتے ہو۔‘‘[7]

اس مکالمے سے واضح ہوتا ہے کہ نئی نسل روایتی اقدار سے بے بہرہ ہے۔ نسلی تفاوت کو ظاہر کرتا ایک افسانہ ’ورثہ‘ بھی ہے جس میں ایک بعد کی جنریشن کا انسان اپنے اکابرین کے ظلم و استبداد کے رویے کو مزید شدت کے ساتھ اختیار کرتا نظر آتا ہے۔

جدید افسانہ نگاروں کا ایک محبوب موضوع شہر رہا ہے۔ صنعتی ترقی نے انسانوں کے ایک ہجوم کو شہر کی طرف متوجہ کیا جس کے نتیجے میں گاؤں سے شہروں کی طرف نقل مکانی ہوئی اور شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ شہروں میں آبادی کے بے لگام اضافے نے شہروں میں بے روزگاری کے مسائل پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی اخلاق کو بھی اپنی زد میں لیا۔ انسان اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگا۔ ’عمود‘ (جوگندر پال)، ’اپنا رنگ‘ (ظفر اوگانوی)، ’ڈوبتے ہوئے‘ (حسین الحق)، ’پاؤں‘ (شوکت حیات) وغیرہ افسانوں میں شہر کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شہر سے متعلق یہ موضوعات احمد یوسف کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ’کل کی شب‘ اور ’ہم تھے اور شہر تھا‘ میں چند دیگر تاثرات کے علاوہ شہری زندگی کی برائیوں کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش ہے۔

افسانہ ’ہم تھے اور شہر تھا‘ شہر کے غیر منظم حالات اور بگڑتے اقدار کا اشاراتی بیان ہے۔ اس افسانے میں معاشرے کے افراد کے درمیان عدم اعتمادی، چالبازی، بازار کی گرانی جیسے حالات کا اشارتاً ذکر ملتا ہے۔ اس افسانہ میں شہری زندگی کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے احمد یوسف نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں اس کی بڑی وجہ اخلاقیات کا فقدان ہے۔

جدید افسانے کا علامتی اسلوب تنقید کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ ناقدین کی رائے ہے کہ شعر گوئی کے لیے تو علامت نگاری مفید ہو سکتی ہے لیکن افسانے کے لیے نہیں کیونکہ افسانہ ایک بیانیہ کا فن ہے اور اس میں ماجرے کا سلسلہ حادثات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ افسانے کا فن توسیع اور توضیع کا متقاضی ہے۔ لیکن جدید فنکاروں نے علامت کو افسانوں میں بہت استعمال کیا ہے۔ احمد یوسف کے افسانوں میں بھی علامتوں کا اچھا خاصا اہتمام نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے تلوار کا موسم، مکالمہ، کاروبار، حالات اور 23 گھنٹے کا شہر وغیرہ علامت نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ احمد یوسف کے افسانوں میں خال خال ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ علامتیں بعید از قیاس ہیں، کیونکہ ان کی اکثر علامتیں سمجھ میں آنے والی اور Approachable ہوتی ہیں۔

حواشی

1. تاریخ ادب اردو (جلد سوم) وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2005، ص 1254
2. سہ ماہی ’ابجد‘ ارریہ، بہار، جولائی تا دسمبر 2014، ص 8
3. ’نئی افسانوی تقلیب‘ مہدی جعفر، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 1999، ص 121
4. ’رزم ہو یا بزم ہو‘ احمد یوسف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004، 122
5. ایضاً، ص 45
6. ایضاً، ص 46
7. ’23 گھنٹے کا سفر‘ احمد یوسف، کلچرل اکیڈمی گیا، بہار، 1984، ص 71

■

Md. Mahmoodul Hasan
Research Scholar (Urdu)
Supervisor: Dr. Ghulam Sarwer
LNMU Darbhanga- 845401 (Bihar)
Mob.:8294653040
mahmoodulhasan03152@gmail.com

محمد اجمل حسین

شانتی رنجن بھٹاچاریہ
اردو ادب کا
ایک سنجیدہ اور مخلص قلم کار

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ادبی زندگی کے پس منظر میں ان کی ابتدائی تعلیم، اردو اور بنگالی ادب سے وابستگی کے عوامل اور ان پر اثر ڈالنے والی شخصیات کا کلیدی کردار رہا ہے۔ ان کے والد بیکنٹھ ناتھ تھے اور ان کی پیدائش 24 ستمبر 1930 کو ضلع فرید پور بھوجیشور کے مشورہ گاؤں میں ہوئی۔ شانتی رنجن نے اپنی ابتدائی تعلیم بنگالی میڈیم کے ذریعے اپنے گاؤں کے ایک اسکول سے شروع کی، جہاں انھوں نے دوسری جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ سات برس کی عمر میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ حیدرآباد منتقل ہوگئے، جہاں ان کے والد ریلوے محکمہ میں ملازم تھے۔ حیدرآباد میں شانتی رنجن نے بردھنی ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس اسکول میں اختیاری مضامین میں اردو، تمل، اور تیلگو شامل تھے، لیکن شانتی رنجن نے اردو کو منتخب کیا۔ یہی زمانہ تھا جب ان کی اردو زبان سے وابستگی کا آغاز ہوا، جو بعد میں ان کی ادبی زندگی کی سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ پھر سکندرآباد کے محبوب کالج میں داخلہ لیا جہاں انھوں نے سکنڈری تک تعلیم حاصل کی۔ یہاں انگریزی کو پہلی اور اردو کو دوسری زبان کے طور پر منتخب کیا مگر والد کی مالی حالت خراب ہونے کے سبب تعلیمی سلسلہ یہیں پر رک گیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

البتہ حیدرآباد کے کثیر الثقافتی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں کی کثیر اللسانی ثقافت (جہاں اردو، ہندی، تیلگو، تمل اور دیگر زبانیں بولی جاتی تھیں) نے شانتی رنجن کو مختلف ادبی اور ثقافتی تحریکات سے روشناس کرایا۔ یہاں کی سماجی انصاف کی تحریکات نے ان کے ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی اور اردو ادب سے ان کا رشتہ گہرا ہوتا گیا۔ پھر 1956 میں اپنے والد کے انتقال کے بعد کلکتہ آ گئے جہاں شانتی رنجن کی ادبی زندگی پر متعدد اہم شخصیات نے اثر ڈالا، جن میں ربندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام اور ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی وغیرہ شامل ہیں۔ ٹیگور کی شاعری اور ادب نے شانتی رنجن کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارا، جبکہ قاضی نذرالاسلام کی انقلابی شاعری نے ان کے ادبی نظریات کو جلا بخشی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے ادبی اور لسانی تحقیقی کاموں نے شانتی رنجن کو بہت متاثر کیا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ادبی زندگی کے یہ پہلو ان کی شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں، جنھوں نے اردو اور بنگالی ادب کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا اور دونوں زبانوں کے ادبی حلقوں کو اپنی تحریروں سے متاثر کیا۔ ان کے ادبی تجربات، زندگی کے نشیب وفراز اور ان پر اثر ڈالنے والی شخصیات نے انھیں ایک منفرد ادبی مقام بخشا، جس نے انھیں ایک ممتاز ادبی شخصیت کے طور پر ابھرنے میں مدد کی۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ اردو ادب کے ایک مخلص اور سنجیدہ قلم کار تھے۔ مادری زبان بنگالی ہونے کے باوجود، ان کا اردو ادب سے گہرا تعلق تھا اور خود کو اردو کا ادیب کہلوانے میں فخر محسوس کیا۔ انھوں نے 1948 سے دوران تعلیم حیدرآباد میں ادبی کیریئر کا آغاز کیا۔ ابتدا غزل سے کی، لیکن جلد ہی افسانہ نگاری کی طرف راغب ہوگئے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا افسانہ 'چوٹی' بنگال میں اردو کا پہلا سب سے مختصر ترین افسانہ مانا جاتا ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'شاعر کی شادی' اور 'راہ کا کانٹا' شائع ہو چکے ہیں۔ 'شاعر کی شادی' میں ایک ہی افسانہ ہے جو کہ کافی طویل ہے اور 'راہ کا کانٹا' مجموعہ میں کل تیرہ افسانے شامل ہیں: امر کہانی 1، امر کہانی 2، شانتی مر گیا، سرمایہ کی ضرورت، ایک دن کا راجہ، راہ کا کانٹا، رام نگر، عورت اور ماں، لہریں، نوکری، مٹی کے بھگوان، جیت اور 'رام نام ست' یہ تمام افسانے ہندوستان کے موقر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے اور بعد میں انھیں مجموعے کی صورت میں 1960 میں بھٹاچاریہ پبلی کیشنز سے شائع کیا گیا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی افسانوی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اشتراکی ادب کے علمبردار تھے۔ ان کی تحریروں میں ان کے سیاسی نظریات اور رجحانات کی جھلک واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے، جو ان کی گہری حسیت کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عموماً عام لوگوں، خاص طور پر محنت کش اور معاشرتی ظلم وستم کے شکار افراد کی کہانیاں شامل ہیں، جو زندگی کی کٹھنائیوں اور غربت کے تلخ تجربات کا سامنا کر رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ 'راہ کا کانٹا' شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے افسانوں کا ایک مختصر مگر جامع مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں انھوں نے فن کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور ہر کہانی کو اس کے موضوع کے مطابق ماحول فراہم کیا

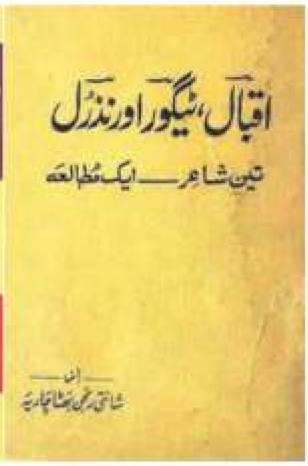

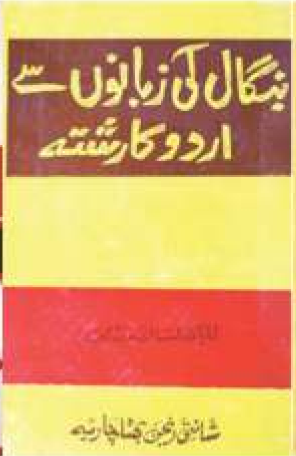

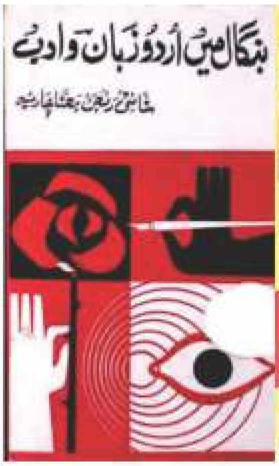

ہے۔ ان کی زبان سادہ اور عام بول چال کی عکاسی کرتی ہے، جو ان کی فنکارانہ صلاحیت کا عکاس ہے۔ موضوعات کو پیچیدہ بنانے کے بجائے انھوں نے انھیں آسان الفاظ میں پیش کیا ہے، جس سے قاری کو روزمرہ زندگی کے حالات کے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔

'راہ کا کانٹا' اور 'شاعر کی شادی' کے افسانوں کے علاوہ، شانتی رنجن نے دیگر متعدد افسانے بھی تخلیق کیے ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں، جیسے پانی، اندھے کی لاٹھی، تاوان، یاتری کی واپسی، بدلتے پرچم اور دونوں طرف ہو آگ وغیرہ۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنے ادبی سفر کی شروعات شاعری، مختصر ناول، اور افسانہ نگاری سے کی۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'راہ کا کانٹا' ان کی ابتدائی تخلیقات میں شمار ہوتا ہے، مگر اس مجموعے کے بعد ان کی افسانہ نگاری کا سفر یہیں پر ٹھہر جاتا ہے اور شانتی رنجن افسانہ نگاری کو جاری رکھنے کے بجائے اپنی توجہ تحقیق اور ترجمہ نگاری کی طرف مرکوز کر لیتے ہیں۔

> بھٹاچاریہ کی ترجمہ نگاری اور لسانی مطالعہ اردو اور بنگالی ادب کے درمیان ایک پل کے طور پر کام کرتا ہے، جو دونوں زبانوں کی تفہیم اور قدردانی کو فروغ دیتا ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا ترجمہ اور لسانی مطالعہ اردو اور بنگالی ادب کے درمیان ایک اہم پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ انھوں نے دونوں زبانوں کے ادبی خزانے کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے کئی اہم کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے نے نہ صرف دونوں زبانوں کے ادب کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد کی بلکہ دونوں زبانوں کے درمیان ثقافتی تبادلے کو بھی فروغ دیا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے مختلف بنگالی کتابوں کو اردو میں اور اردو کتابوں کو بنگالی میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے میں بنگالی ناول 'آروگیہ نکیتن' کا اردو ترجمہ 'گلشنِ صحت' کے نام سے کیا گیا، جس میں بنگالی ثقافت اور سماجی حالات کو اردو قارئین کے لیے بامعنی انداز میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح انھوں نے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی کتابوں 'سنسکرت کی' اور 'پتھ چلتی' سے منتخب سات مضامین کا اردو ترجمہ 'بکھرے ورق' کے عنوان سے کیا، جس کے ذریعے بنگالی زبان کی لسانی، تاریخی اور ادبی جہات کو اردو قارئین تک پہنچایا گیا۔ شانتی رنجن نے رانی چند کے بنگالی سفرنامے 'پورن کمبھ' کا اردو ترجمہ کیا، جو بنگالی روایات اور ثقافتی تاریخ کی خوبصورت تصویر کشی کرتا ہے۔ اس ترجمے میں بنگالی تہذیب کو اردو زبان میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ منتقل کیا گیا۔ انھوں نے ڈاکٹر سکمار سین کی بنگالی تصنیف 'تاریخ بنگلہ ادب' کا بھی اردو ترجمہ کیا، جس میں بنگالی ادب کی تاریخ اور اہم تحریکات کو اردو قارئین کے لیے سہل اور مفصل انداز میں پیش کیا گیا۔

ترجمہ کرتے وقت شانتی رنجن کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، جیسے دونوں زبانوں کی مخصوص محاوراتی زبان اور ادبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اصل متن کی معنویت کو درست طریقے سے منتقل کرنا۔ انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ترجمہ شدہ متن اردو قارئین کے لیے اتنا ہی جاذبِ نظر ہو جتنا کہ اصل بنگالی متن بنگالی قارئین کے لیے تھا۔

بھٹاچاریہ نے اردو اور بنگالی زبانوں کے تعلقات کو ایک وسیع تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے نظریات کے مطابق، زبان نہ صرف اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ یہ ثقافتی ورثے اور سماجی شناخت کی بھی مظہر ہے۔ انھوں نے دونوں زبانوں کے لسانی، تاریخی، اور ثقافتی روابط کو سمجھنے کے لیے ایک جامع اور متوازن مطالعہ کیا۔ ان کے نزدیک، ترجمہ نگاری نہ صرف ادب بلکہ دونوں زبانوں کے ثقافتی اور سماجی تناظر کو بھی قریب لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

بھٹاچاریہ کی ترجمہ نگاری اور لسانی مطالعہ اردو اور بنگالی ادب کے درمیان ایک پل کے طور پر کام کرتا ہے، جو دونوں زبانوں کی تفہیم اور قدردانی کو فروغ دیتا ہے۔ ان کی محنت اور لگن نے اردو اور بنگالی زبانوں کے ادب کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، جو ان کی ادبی خدمات کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

شانتی رنجن نے خصوصاً اردو اور بنگال کو اپنے تحقیقی موضوع کے طور پر منتخب کیا اور اس میں انھوں نے اپنی انفرادی پہچان بنائی اور مغربی بنگال میں تحقیق کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تحقیقی کوششوں اور اردو ادب کے لیے ان کے گراں قدر خدمات کا بھرپور اعتراف کرتے ہیں:

''شانتی رنجن بھٹا چاریہ اردو کے مشہور اور ممتاز ادیب ہیں تقریباً چالیس برسوں سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ چونکہ بھٹاچاریہ صاحب کی مادری زبان بنگالی ہے، اس لیے انھوں نے اردو میں ایسا کام خاصے پیمانے پر کیا ہے جس میں بنگالی اور اردو دونوں زبانوں کا علم آیا ہے۔ انھوں نے بنگال میں اردو ادب اور اردو زبان کے موضوعات پر بھی کئی کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھٹاچاریہ صاحب نے کچھ بنگالی کتابوں کے اردو میں اور کچھ اردو کتابوں کے بنگالی میں ترجمے کیے ہیں۔ بھٹاچاریہ صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور ذہین

ادیب و محقق ہیں جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ متعلقہ موضوع پر دستیاب تمام مواد سے استفادہ کرتے ہیں۔''

(پیش لفظ مشمولہ مغربی بنگال میں اردو زبان اور اس کے مسائل، مطبوعہ، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی 1989)

بھٹاچاریہ کی تحقیقاتی تصانیف میں شامل کتابیں بنگال میں اردو کے مسائل، اردو اور بنگال، بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو، بنگال میں اردو زبان و ادب (چند مضامین)، غالب اور بنگال، اردو ادب اور بنگالی کلچر، اقبال، ٹیگور اور نذرل: تین شاعر ایک مطالعہ، مغربی بنگال میں اردو زبان اور اس کے مسائل، مختصر تاریخ ادب بنگلہ، مغربی بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ: ایک لسانی مطالعہ، تذکرہ شعرائے ٹالی گنج، ربندر ناتھ ٹھاکر: حیات و خدمات، آزادی کے بعد بنگال میں صحافت، خواتین بنگال کی اردو خدمات، آفتاب علم و ادب: ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی حیات و خدمات، کلکتہ میں اردو کا پہلا مشاعرہ اور پرنس دلن کا یادگار مشاعرہ اور پختونستان کا مطالبہ وغیرہ ہیں۔

شانتی رنجن نے اکثر تخلیقات و تصنیفات میں، بنگال اور اردو زبان و ادب اور اس کے مسائل کو اجاگر کرنے اور ان کے حل کی تجاویز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

شانتی رنجن نے تنقید کے میدان میں بھی قابل قدر کام انجام دیا۔ ان کی تنقیدی بصیرت کو سمجھنے کے لیے ان کی کتاب 'اقبال، ٹیگور اور نذرل: تین شاعر، ایک مطالعہ' اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں بھٹاچاریہ نے اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور، اور قاضی نذر الاسلام کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تنقید میں معاشرتی، معاشی، اور ثقافتی پہلوؤں کا جامع تجزیہ شامل ہوتا ہے۔ ان کے مطابق، فنکار اپنی تخلیقات کو سماجی اور ثقافتی پس منظر سے جدا نہیں کرسکتا، کیونکہ کوئی بھی فن پارہ ان ہی عوامل سے متاثر ہوتا ہے جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ بھٹاچاریہ نے اس بات کا خوب ادراک کیا ہے اور اس تناظر میں اپنی تنقید کو پیش کیا ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نہ صرف ایک ممتاز محقق اور مترجم تھے، بلکہ انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ حیدرآباد سے کلکتہ منتقل

شانتی رنجن بھٹاچاریہ اردو ادب کے ایک مخلص اور سنجیدہ قلم کار تھے جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اردو اور بنگالی ادب کے درمیان پُل کا کام کیا۔ ان کے افسانے اور تحقیقی و تنقیدی تصانیف ومضامین اور تراجم ان کی گھری ادبی بصیرت اور سماجی مسائل کے تئیں دلبستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہونے کے بعد، انھوں نے 1956 میں اپنے دوست خلیل احمد کی مدد سے ایک پریس قائم کیا۔ اسی سال انھوں نے کلکتہ میں جھاؤتلہ روڈ کے ایک پریس سے 'فلم ویکلی' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کا اجرا کیا، جو فلمی دنیا کی خبروں اور تجزیوں پر مبنی تھا۔ تاہم، طبیعت کی ناسازی کے باعث شانتی رنجن کو اس اخبار سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی اور وسیم الحق نے اس کی ادارت سنبھالی۔ بعد میں، جسیم الحق نے وسیم الحق کے بعد اس اخبار کی ادارت کی ذمے داری لی، لیکن چند مصروفیات کے سبب 1982 میں یہ اخبار بند ہو گیا جیسا کہ شانتی رنجن لکھتے ہیں:

'فلم ویکلی' سن اجرا 1956 کو تقریباً دو سال تک راقم الحروف نے نکالا اور اس کے بعد جب میں بیمار پڑ گیا تو میرے محترم دوست جناب وسیم الحق صاحب کو فروخت کر دیا۔ عرصے تک وسیم صاحب اسے نکالتے رہے ہیں اور آج کل ان کے چھوٹے بھائی اسے نکال رہے ہیں۔''

(آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو، شانتی رنجن، روشن پریس، سریناتھ بابو لین، کلکتہ، اکتوبر 1973، ص 55)

شانتی رنجن نے 1963 میں 'جام جم' کے نام سے ایک اور ادبی اور ثقافتی مواد پر مبنی پرچہ بھی جاری کیا، جو چند ماہ بعد بند ہو گیا۔ بقول شانتی رنجن:

'جام جم' مدیر راقم الحروف، پہلا شمارہ یکم مئی 63ء کو نکلا۔ صرف پانچ شمارے نکلے، چونکہ اس کے بعد مجھے سرکاری ملازمت مل گئی اور میں نے اسے بند کر دیا۔ 15 اگست 63ء کا خصوصی شمارہ اس کا آخری شمارہ رہا ہے۔''

(ایضاً، ص 15)

لیکن شانتی رنجن کی صحافت سے گہری دلچسپی نے انھیں مختلف اخبارات و رسائل کے ساتھ منسلک رکھا۔ انھوں نے صحافت کے موضوع پر متعدد مضامین تحریر کیے، جو بعد میں ان کی کتابوں میں شامل کیے گئے۔ ان کی کتاب 'بنگال میں اردو صحافت' کو مغربی بنگال اردو اکادمی کی سفارش پر لکھا گیا اور یہ کتاب بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ، ارتقا، اور مختلف پہلوؤں کو تفصیل سے پیش کرتی ہے۔ بدقسمتی سے 1993 میں شانتی رنجن کی وفات کے باعث یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، تاہم بعدازاں رئیس احمد جعفری نے اس کتاب کو ترمیم کے ساتھ 2003 میں شائع کیا۔ اس کتاب نے بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ کو محفوظ رکھنے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی صحافتی خدمات ان کی اردو زبان اور صحافت سے محبت، ان کے عمیق علمی مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کی تحریریں اور کتابیں بنگال میں اردو صحافت کے طالب علموں اور محققین کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔

الغرض شانتی رنجن بھٹاچاریہ اردو ادب کے ایک مخلص اور سنجیدہ قلم کار تھے جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اردو اور بنگالی ادب کے درمیان پُل کا کام کیا۔ ان کے افسانے اور تحقیقی و تنقیدی تصانیف ومضامین اور تراجم ان کی گہری ادبی بصیرت اور سماجی مسائل کے تئیں دلبستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ 'راہ کا کانٹا' اور 'شاعر کی شادی' جیسے افسانوی مجموعے ان کی فنی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جبکہ ان کے تحقیقی، تنقیدی، ترجمہ نگاری اور صحافتی کاموں نے اردو ادب اور بنگالی ثقافت کے درمیان ایک مضبوط رابطہ قائم کیا۔ شانتی رنجن نے اپنے ادبی سفر میں اردو اور بنگال کے مسائل کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ان کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ ان کی تنقید اور تحقیق دونوں میں ادبی، سماجی، معاشرتی، معاشی، اور ثقافتی پہلوؤں کا جامع تجزیہ شامل ہے، جو ان کے ادبی نظریات کی گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔

■

Mohd Ajmal Hussain
H. No.162, Meharban
Gali Behind the Irani Tea
Okhla Village, Jamia Nagar Okhla
New Delhi 110025
Mob.: 8285144903

درشن سنگھ کی غزل گوئی

نذیر احمد کمار

معروف صوفی شاعر، مصنف اور ادیب درشن سنگھ دگل 14 ستمبر 1921 میں سید کسراں ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ وفات 30 مئی 1989 میں دہلی میں ہوئی۔ بی اے آنرز پنجاب یونیورسٹی لاہور سے، لیکن ڈپٹی سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے طور پر ریٹائرڈ ہوئے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور شمیم کرہانی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ 1938 سے شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ درشن سنگھ نے قطعات بھی کہے ہیں رباعیاں بھی۔ غزلیں اور قصیدے بھی، غرض تمام اصناف سخن کو آزمایا ہے۔ اسی طرح ان کے اشعار کی گرمی ہر صنف سخن میں نمایاں ہے۔ زندگی کے تقاضوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جذبات کے پاس آنکھیں بھی تھیں۔ ان کی محبت اندھی نہیں بلکہ وقت پڑھنے پر غم دوراں کے لیے غم جاناں کو ترک بھی کر دیتے تھے۔

درشن سنگھ ایک سچے عاشق کی طرح دوئی کے پردے چاک کر دینا چاہتے تھے اور تمام انسانوں اور خدا سے محبت کرنے والوں کو ایک مرکز پہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ یہ نہ کسی تذبذب کے شکار تھے اور نہ ذہنی خلجان میں گرفتار اور نہ ہی ادھر ادھر بھٹکنے کے قائل تھے۔ درشن سنگھ کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس میں تلاش نور (1965)، منزل نور (1970)، متاع نور (1988) اور 'جادۂ نور' (1992) قابل ذکر ہیں۔

انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایے کے صوفی شاعر گزرے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے جو شاعری کی ہے اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق ان کا نظریہ کیا تھا۔ اس حوالے سے ایک مضمون 'میرا نظریۂ شاعری' میں وہ خود اس بات کا اعتراف کچھ یوں کرتے ہیں:

''میرا نظریۂ شاعری صرف ذہن کی یا فکر و مطالعے کی اپج نہیں۔ وہ میری زندگی سے پیدا ہے اور میری ذات و حیات تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہمارے چاروں طرف انسانی زندگی کا جو بحر بیکراں موجزن ہے، اس سے جڑا ہوا ہے۔ میری شاعری جو میری روح کی پکار ہے، دو عظیم رہنمایان حقیقت میرے مرشد پاک حضور بابا ساون سنگھ جی مہاراج اور والد بزرگوار سنت کرپال سنگھ جی مہاراج کی نظر کرم کی دین ہے۔ میرا نظریۂ شاعری اگر دو لفظوں میں بیان کیا جا سکے تو اس کے لیے صرف 'انسان دوستی' کا استعمال کافی ہوگا۔ یہاں میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ 'انسان دوستی' سے میری مراد کسی مروجہ ازم (ISM) یعنی مسلک یا نظریے سے نہیں' بلکہ اس لافانی عنصر سے ہے جو انسان کے خمیر میں ہے، اور وہ بنیادی عنصر ہے محبت جو بنائے حیات اور تخلیق کائنات کا جوہر ہے۔''

(درشن سنگھ، شعری مجموعہ، متاع نور، ساون کرپال پبلی کیشنز، دہلی 1988، ص 37)

یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ نام و نمود اور شہرت کی طلب سے بہت دور رہے ہیں۔ ایک روحانی رہنما کے وہ عالمگیر شہرت اور مقبولیت کے مالک ہیں۔ ان کے پیروکاروں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین، پارسی لیکن ان مذاہب میں بھی وہ لوگ جو خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں اور وہ بھی جو مادہ پرست ہیں۔ غرض درشن سنگھ کا پیغام سب کے لیے ہے اور وہ سب کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انھیں 'انسان دوست' شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چند مثالیں۔

ملی وہ مے کہ میں سرشار ہو گیا ساقی
ہر آدمی سے مجھے پیار ہو گیا ساقی

گلے لگا لو ہر انسان کو کہ اپنا ہے
چلو تو راہ گزاروں میں بانٹتے ہوئے پیار

میں نے سیکھا ہے زمانے سے محبت کرنا
تیرا پیغام محبت مرے کام آیا ہے

اپنے ہی دوست کی تو ہیں جتنی ہیں یہ نشانیاں
دیر ملے تو سر جھکا، کعبہ ملے سلام کر

جوش مستی میں بغل گیر ہوں بچھڑے ہوئے دل
آج انسان کو انسان بنا دے ساقی

درشن سنگھ کی شاعری انسانی جذبات، فلسفہ اور روحانی موضوعات پر گہری بصیرت فراہم کرتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں نہ صرف ذاتی تجربات کی جھلک ہے بلکہ سماجی اور روحانی مسائل پر بھی غور و فکر کی گئی ہے۔ درشن سنگھ کی شعری کائنات وسیع اور متنوع ہے، جس میں کئی اہم پہلو شامل ہیں۔ 'متاع نور' میں موجود کلام کو کئی خانوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

1. **روحانیت اور فلسفہ:**

درشن سنگھ کی شاعری میں صوفیانہ رنگ نمایاں ہے۔ ان کی تخلیقات میں خدا، کائنات، اور انسان کے درمیان تعلق کا گہرائی سے ذکر ہے۔ ان کی شاعری میں یہ سوالات بارہا اٹھائے جاتے ہیں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے اور انسان اپنے وجود کو کس طرح سمجھ سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان کی غزلوں میں صوفیانہ رنگ غالب

نظر آتا ہے۔ جس میں خدا کی محبت، روحانی تجربات، اور انسان کے باطن کی پاکیزگی کی تلاش کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ متاع نور میں لکھتے ہیں:

1. ''روحانیت جو میری زندگی کا جزو لاینفک یا اٹوٹ انگ ہے اسے موضوع سخن بنانے سے پہلے میں مروجہ روایتی انداز میں شاعری کرتا تھا۔'' (ایضاً، ص52)

> **درشن سنگھ کی شاعری میں سادگی کے ساتھ ساتھ ایک گہری معنویت موجود ہے۔ عام فہم زبان اور تشبیہات کے ذریعے پیچیدہ موضوعات کو آسانی سے بیان کرنے کا ہنر ان کو خوب آتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، گہرائی، روانی اور پراثر جذبات سے بھرپور اشعار ہیں۔ وہ عام الفاظ کے ذریعے پیچیدہ خیالات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے جذبات سے جڑ جاتا ہے**

2. ''شاعری۔ وہ کسی زبان میں ہو، طہارت فکر اور لطیف احساسات وجذبات کی چیز ہے۔ اس کی آمد اس وقت ہوتی ہے جب روحانی ارتقا کی بلندیوں کو چھو لینے کی قدرتی خواہش تیز سے تیزتر ہوتی جاتی ہے۔'' (ایضاً، ص43)

خدا کو ڈھونڈتے رہنا ہی اصل زندگی ہے
یہ راہ عشق ہر اک راہ سے جدا ہے
مٹا کر مجھے آپ میں جذب کرلے
بقا کے لیے میں فنا چاہتا ہوں
نہاں ہیں تکمیل خود شناسی میں جلوہ ہائے خدا شناسی
جو اپنی ہستی سے بے خبر ہے، وہ آپ سے آشنا کہاں ہے

ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عظیم شاعری صرف سنتوں، مہاتماؤں اور صوفی فقیروں نے ہی نہیں کی ہے بلکہ یک سوئی اور محویت ذات میں جب انسان ہم آہنگ ہوتا ہے تو وہ شعر کہتا نہیں، شعر اس پر نازل ہوتے ہیں۔ یہی صورت درشن سنگھ کی شاعری میں ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھتے وقت اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ آمد کے شاعر ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔

2. **محبت اور انسانیت:**

محبت، ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے، لیکن یہ محبت ذاتی یا جسمانی حدوں سے آگے بڑھ کر کائناتی محبت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ ان کے اشعار انسانوں کے درمیان ہم آہنگی اور بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں عشق کے لطیف جذبات اور جدائی کی کربناکی نہایت ہی دلکش انداز میں ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو

ہر ایک خواب کے پیچھے کوئی حقیقت تھی
مگر وہ خواب نہ تعبیر تک پہنچ پائے
کوئی سالک ہے نہ مسلک بجز ایمائے سلوک
دل ہی کھینچے لیے جاتا ہے سرراہ گزار
نام ہے آدمی تو کیا، اصل میں روح عشق ہوں
ساری زمیں ہے میرا گھر، سارا جہاں مرا وطن

3. **سماجی مسائل**

درشن سنگھ نے اپنے دور کے سماجی مسائل کو بھی شاعری کے ذریعے اجاگر کیا ہے، جیسے ذات پات کا نظام، ظلم وستم، اور سماجی نابرابری۔ ان کی شاعری میں مظلوموں کی آواز بننے کا عزم ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں سماج کے مسائل، طبقاتی تفریق، اور ظلم وستم کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری محروم طبقوں کی نمائندہ بن کر ابھرتی ہے۔

ہمارے حال پہ یہ ظلم کیوں روا رکھا
زمیں ہماری تھی، پر حکم دوسرا رکھا
اٹھ رہا ہے اب زمانے سے محبت کا چلن
ہونے والا ہے جہان رنگ و بو زیروزبر

4. **سادگی اور گہرائی**

درشن سنگھ کی شاعری میں سادگی کے ساتھ ساتھ ایک گہری معنویت موجود ہے۔ عام فہم زبان اور تشبیہات کے ذریعے پیچیدہ موضوعات کو آسانی سے بیان کرنے کا ہنر ان کو خوب آتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، گہرائی، روانی اور پراثر جذبات سے بھرپور اشعار ہیں۔ وہ عام الفاظ کے ذریعے پیچیدہ خیالات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے جذبات سے جڑ جاتا ہے۔

یہ دل کی بات ہے، لفظوں میں کیوں کہیں اس کو
جو بات دل میں چھپی ہو، وہی حسیں اس کو
تجھے جو پوچھنا ہے پوچھ لے اے داور محشر
میں اپنے ساتھ اپنی بے زبانی لے کے آیا ہوں
ہزار آئے زمانے میں انقلاب، مگر
مزاج حسن کا بدلا نہ عشق ہی کا چلن

5. **تصوف اور فلسفیانہ پہلو:**

ان کے کلام میں عشق حقیقی کا ذکر بار بار آیا ہے، جس میں خدا کے ساتھ انسان کے تعلق کو مرکزیت دی گئی ہے۔ یہ عشق خودی سے نکل کر خدا کی معرفت حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ درشن سنگھ کی غزلوں میں فلسفیانہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار زندگی، موت، اور کائنات کے سوالات پر غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ تصوف کے حوالے سے رفعت سروش رقمطراز ہیں:

''دنیا کی اعلیٰ شاعری کا بیشتر حصہ خداشناسی اور اس کے واسطے سے خود شناسی کے متصوفانہ مضامین پر مشتمل ہے اور چونکہ یہ موضوع کسی ایک فرقے، کسی ایک زبان، کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کا موضوع نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ انسانی سماج کے دائرے کی طرح وسیع ہے جو شاید کل روئے زمین سے گزر کر چاند ستاروں تک بھی پہنچ جائے۔ اس لیے اس کی مقبولیت بھی ہمہ گیر ہے اور چونکہ اسرار خداوندی ہنوز سربستہ ہیں، اس لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک متصوفانہ مضامین اور شاعری وقت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ آواز جو انسان کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے۔ شاعری کے لیے ایک اور شرط ہے۔ دل کی آواز ہونا اور جو شعر دل سے نہیں طلوع ہوتا وہ لفظوں کا مجموعہ ہوتو ہو۔ شعر نہیں ہوتا۔ تاثر سے خالی۔ بے کیف۔ شعر کی تخلیق کے لیے وجدانی کیفیت ہونا ضروری ہے۔ بالخصوص صوفیانہ اور عارفانہ شاعری کے لیے تو گداز دل لازمی ہے۔ ورنہ شعر میں الفاظ ہوں گے۔ وزن ہوگا، ردیف وقوافی ہوں گے مگر شعریت نہ ہوگی، روح شعر سے عاری صرف تجسیم الفاظ ہوگی''

(درشن سنگھ، شعری مجموعہ، متاع نور، ساون کرپال پبلی کیشنز، دہلی 1988، ص18)

مذکورہ عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ درشن سنگھ کی شاعری، بالخصوص متاع نور میں ہمیں اسی طرح کے تاثرات و تجربات، روحانیت کے کشف و کمالات اور عبد و معبود کے باہمی پراسرار معاملات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے:

''میں آغوشِ تصوف کا پروردہ ضرور ہوں، لیکن متصوفانہ زندگی کو جامد و ساکن چیز نہیں سمجھتا تصوف تزکیۂ نفس اور طہارتِ فکر کی کاوش و ریاضت ہونے کے باوجود ایک ایسا جیتا جاگتا پیمانہ ہے جو شراب حیات سے لبریز ہے اور جس کی صہبائے سرمدی سے قوت حیات اور تحریک ارتقا ملتی ہے۔ ہمارے پراچین ریشی منی اور ان کے بعد آنے والے سادھو، سنت، مہاتما، ولی، صوفی اور فقیر، ان ہی جذبات اور احساسات کو لے کر روحانیت کے راستے پر آگے بڑھے۔'' (ایضاً، ص 41)

فنا کی راہ پہ چلنا بھی ایک فن ہے مگر
بقا کے راز کو سمجھو تو بات کچھ اور ہے
وہ سر کہ جس کو نہ سجدے سے تھی کوئی نسبت
نہ جانے کیوں ترے در پر دیر سے خم ہے
جزو سے کل کی طرف جن کا سفر ہے روز و شب
موت ان کی منزل مقصود کا اک نام ہے

کہا جائے تو درشن سنگھ کی غزلیں ان کے دور کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی شاعری اپنی سماجی اور سیاسی حسیت کا اظہار ہے، ساتھ ہی مظلوموں کی آواز بھی ہے۔ فطری جذبات کے اظہار کے علاوہ صوتی حسن اور غنائیت ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ خود ان کا ماننا ہے کہ:

''شعر و نغمہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کلا یا فن۔ موسیقی ہو، شاعری ہو، مصوری ہو، نقاشی ہو یا رقص۔ خدا کی دین ہے۔ فنون لطیفہ کا جنم خدا کی حمد و ثنا کے لیے، پربھو کے گن گان کے لیے ہوا تھا لیکن وقت کے ساتھ ان کی اصل صورت بدل گئی۔ فنون لطیفہ میں سب سے اونچا درجہ سنگیت کو اور اس کے بعد دوسرا درجہ شاعری کو دیا گیا ہے۔ لیکن شاعری میں سنگیت کے دو اہم جزو 'سُر' 'وزن' یا 'تال' آگے ہی موجود ہے ہی سے موجود ہیں۔ شاعری خدا کی دین اور روح کا سنگیت یا نغمہ ہے۔ میں نے ایک بند میں اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

وہی ہے ساز کے پردے میں 'لحن' میں' لے میں
اسی کی ذات کی پرچھائیاں ہر اک شے میں
نہ موج ہے نہ ستاروں کی آب ہے کوئی
تجلیوں کے ادھر آفتاب ہے کوئی

(ایضاً، ص 44)

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ درشن سنگھ کی غزل گوئی کے موضوعات محدود نہیں بلکہ آفاقی نوعیت کے ہیں، جو ہر دور اور ہر قاری کے لیے اہم ہیں۔ درشن سنگھ

فارسی زبان کے بھی عالم تھے تاہم انھوں نے جس شعری اظہار کو اپنایا وہ اردو اور اس میں بھی بالخصوص اردو غزل کو ہی اپنے مزاج اور افتاد طبع کے مطابق تصور کیا۔ 'متاع نور' جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ان کی غزلوں پر مشتمل مجموعہ ہے جس کا اسم اعظم ہی 'عشق' ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر شاعری اسی ایک لفظ 'عشق' کی تفسیر ہے۔ یہ عشق انھیں کبھی زمان و مکان کی سیر کراتا ہے، تو کبھی انھیں کسی کی خلوت خاص میں باریاب ہونے کا مژدہ سناتا ہے، انھیں عوام الناس سے محبت کرنے کے لیے جہاں اکساتا ہے، وہیں ان کے دل میں سوز و گداز بھی پیدا کرتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ خالق کائنات ایک ہے اور جب اس کی نظر میں کوئی کمتر اور برتر نہیں تو بندگان خدا میں تفریق کیوں؟ سب انسان ایک عالمی برادری کے کنبے کے افراد ہیں۔ پھر رنگ و نسل، زبان و مذہب اور ملک و قوم کی دیواریں مصنوعی ہیں۔ ان دیواروں کا وجود نسل انسانی کی بقا کے لیے مضر ہے۔ رضائے خداوندی کے برعکس ہے اور جب تک ان مصنوعی دیواروں کو، جو ملکوں اور قوموں نے ذاتی مفادات کی خاطر کھڑی کی ہیں، گرایا نہیں جائے گا، انسانیت موجودہ عالمی بحران سے نہیں نکل سکتی، یہ تاثرات درشن کی شاعری کے مطالعے سے ہی مرتب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

راز نہاں تھی زندگی راز نہاں ہے آج بھی
وہم و گماں ازل میں تھی، وہم و گماں ہے آج بھی

حسن سے بھی سوا ہے کچھ عشق کی روشنی ہمیں
وہ ہے چراغ انجمن، یہ ہے چراغ رہ گزر
پر تو عین ذات ہیں، روشنیاں صفات کی
اصل میں دونوں ایک ہیں شیخ ہوں یا ہوں برہمن
کٹ گئی عمر محبت کے سفر میں لیکن
صبح کو شام تمنا سے گریزاں دیکھا
یہ ہوس کے بندے ہیں ناصحا، نہ سمجھ سکے مرا مدعا
مجھے پیار ہے کسی اور سے، مرا دل ربا کوئی اور ہے

درشن کی شاعری میں پیار کا جذبہ، محبت کی سرشاری اور عشق کا والہانہ پن ہے۔ یہی عشق ہے جو انھیں منزل بہ منزل لیے پھرتا ہے یہی عشق ہے جو ان پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ معبود حقیقی ایک ہے۔ مگر اس کے چاہنے والوں نے حرم و دیر کی تفریق پیدا کر کے دوئی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ درشن سنگھ 'عشق' کی وہ شمع روشن کرنا چاہتے تھے جو ایک مقدس آتش کی طرح ان کے سینے میں جل رہی تھی، جس کی روشنی سے یہ جہاں روشن اور منور ہے۔ ان کے سامنے ایک منزل مقصود تھی۔ معرفت کی ایک راہ متعین تھی اور ان کے شعور و وجدان نے انھیں یکسوئی اور یقین کامل بخشا تھا کہ وہ ذات واحد اور لاشریک ہے جس کی طرف ان کے قدم بڑھ رہے تھیں۔ انسان کی معراج یہی ہے کہ وہ اپنے معبود کو پہچان لے، صالح عمل کرتا رہے اور ایک ذرہ نور کی طرح آخر کار اس 'منبع نور' سے جا ملے۔ یہی ان کی تعلیمات کا نچوڑ ہے، اور یہی ان کا مسلک حیات و نظریۂ شاعری ہے۔ ان کی غزل گوئی پر رفعت سروش نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کی شخصیت میں ایک بلند پایہ انسان اور اعلیٰ درجے کے شاعر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار کی آبیاری خون جگر سے کی ہے اور نصف صدی کی مشق سخن اور فنی ریاضت نے ان کلام کو معائب سے پاک اور محاسن شاعری سے مزین کر دیا ہے۔ غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے جسے انھوں نے اپنے جگر سے جلا بخشی ہے۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتے کہ اس نازک اندام پر سفاکانہ تنقید مشق تیغ زنی کرے۔'' (ایضاً، ص 31)

■

Nazeer Ahmad Kumar
Research Scholar, Dept of Urdu
Kashmir University
Kashmir 190006 (J&K)
Mob.:9797838904
kumarnazir.urscholar@kashmiruniversity.net

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذراسی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in➢

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے۔ جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

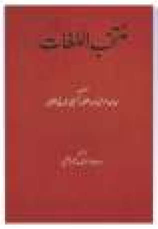

منتخب اللغات

مؤلف: سید عبدالرشید بن عبدالغفور الحسینی المدنی التتوی
مترجم: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی
صفحات: 726، قیمت: 785 روپے، اشاعت ثانی: 2023
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: محمد حفظ الرحمٰن ندوی (پی جی ٹی ٹیچر بہار گورنمنٹ)

زیر تبصرہ کتاب 'منتخب اللغات' کل اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے جو کہ حروف تہجی کی ترتیب پر قائم کیے گئے ہیں اور ہر باب میں حروف تہجی کی ہی ترتیب پر فصول قائم کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے مؤلف سید عبدالرشید بن عبدالغفور الحسینی المدنی التتوی ہیں جن کا مولد اور وطن سندھ کا ایک مشہور شہر ٹھٹھہ ہے جو کبھی علوم فقہ، فلسفہ و سیاسیات کا گہوارہ تھا۔ ان کے جد اعلیٰ مدینہ منورہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ سید عبدالرشید حسینی کی پرورش اور تعلیم و تربیت اسی قدیم شہر ٹھٹھہ میں ہوئی جو اس زمانے میں علم و علما کا بڑا مرکز تھا۔ خداداد صلاحیت، علمی ذوق و شوق اور جستجوئے علم و فن کی لگن نے عبدالرشید حسینی کو ایک ممتاز ادیب اور ماہر لغت والسنہ بنا دیا۔

سید عبدالرشید حسینی ماہر زبان و ادب اور لغت نگار کی حیثیت سے عام شہرت رکھتے تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ فرہنگ نویسی ان کا طرہ امتیاز تھا، جس نے ان کو علمی دنیا میں عظمت و رفعت عطا کیا۔ سید عبدالرشید نے اپنی زندگی کے بیش قیمت اوقات اس کام کے لیے وقف رکھے تھے، انھوں نے مشہور لغات 'منتخب اللغات' اور 'فرہنگ رشیدی' حلقہ علم و ادب کو عطا کیے، ان کے علاوہ معربات رشیدی بھی ان کی ذہنی و قلمی کاوشوں کا نمونہ ہے۔

عبدالرشید الحسینی نے القاموس المحیط کو اتھاہ سمندر اور 'منتخب اللغات' کو اس کی نہر قرار دیا ہے، بہ لفظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'منتخب اللغات' کا بیشتر حصہ القاموس سے ماخوذ ہے، مگر اس کتاب میں لغت کا بیان ایسی عبارت میں کیا گیا ہے، جو اصل لغت (لفظ) سے زیادہ مغلق اور مشکل ہے۔ عبدالرشید نے اس کے برخلاف اصل لفظ کے معانی اور مترادفات آسان و سہل زبان میں بیان کرنے کا التزام کیا ہے۔

قاموس میں لغت کی وضاحت مشترک الفاظ سے کی گئی ہے، جس کی بنا پر صحیح معانی تک رسائی مشکل ہوتی ہے، حسینی نے معانی کے بیان میں مشترک الفاظ لانے سے احتراز کیا ہے، تاکہ قاری کو مفہوم لفظ میں اشتباہ نہ ہو۔ صاحب قاموس نے بعض مقامات پر ایسے مباحث ذکر کیے ہیں، جن کا تعلق لغت سے نہیں ہے، حسینی نے اپنی کتاب میں غیر متعلق امور کا ذکر اختصار سے کیا ہے، ان کی تفصیل سے اجتناب کیا ہے، تاکہ قاری دوسرے مباحث میں نہ الجھے۔

'منتخب اللغات' کا ترجمہ اردو زبان میں ماہر مترجم مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے کیا ہے۔ یہ کتاب اردو داں طبقہ کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔ انھوں نے 'منتخب اللغات' کے فارسی میں بیان کردہ معانی و مفاہیم کو آسان و تحت اللفظی با محاورہ اردو میں پیش کیا ہے۔

مترجم نے اس کا اردو ترجمہ کرنے میں بہت ہی محنت سے کام لیا ہے اور ترجمے کا جو طریقہ کار انھوں نے استعمال کیا ہے وہ پرانے طریقوں سے بالکل الگ اور نیا ہے، مترجم کے کچھ طریقہ کار مندرجہ ذیل ہیں:

(1) مترجم نے سر لفظ (Head Word) کے تمام حروف پر اعراب لگا دیا ہے، پھر لفظ کے تمام حرفوں کو الگ الگ لکھ کر ان کے اعراب کی وضاحت کی ہے، تاکہ قاری الفاظ کے تلفظ میں غلطی سے محفوظ رہے۔ بعض ایسے حروف جن پر دو یا تین حرکتیں آتی ہیں ان کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

(2) بعض مقامات پر معانی و مطالب کی مزید وضاحت کے لیے مترجم نے تشریحات بھی درج کی ہیں۔ ان مقامات پر بطور علامت (م) لکھ دیا گیا ہے۔

(3) مصنف نے بطور سر لفظ ایک لفظ اور اس کے حرف اول کا اعراب بیان کر کے معانی تحریر کر دیے ہیں، پھر وہی لفظ بعض حرکتوں کی تبدیلی کے دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا تو اسے سر لفظ کے بجائے عبارت میں اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ذکر کر دیا ہے۔

یہ کتاب اردو ادب کے باب میں ایک بہترین، عمدہ اور نایاب اضافہ ہے۔

تحقیق و تنقید

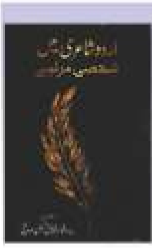

اردو شاعری میں شخصی مرثیے

مصنف: پروفیسر آفاق حسین صدیقی

صفحات: 240، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عامر مظفر بٹ، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'اردو شاعری میں شخصی مرثیے' چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کے عنوانات بالترتیب اس طرح سے ہیں۔ (1) مرثیہ کیا ہے (2) اردو شاعری میں شخصی مراثی۔ عہد قدیم اور متوسطین کے دور میں دکنی دور کی شاعری میں شخصی مرثیہ کا جائزہ (3) اردو شاعری میں دور جدید میں شخصی مرثیہ گوئی (4) آزادی سے پہلے کہے گئے شخصی مرثیوں کا جائزہ (5) آزادی کے بعد اردو شاعری میں شخصی مرثیے (6) ماحصل اردو شاعری میں شخصی مرثیے۔

مرثیہ اردو شاعری کی ایک قدیم صنف ہے، جو عمومی طور پر کسی سانحے، حادثے یا کسی جلیل القدر شخصیت کے انتقال پر لکھی جاتی ہے۔ اردو ادب میں مرثیے کی روایت زیادہ تر کلاسیکی اسلوب میں مذہبی پس منظر کے ساتھ جلوہ گر رہی ہے، بالخصوص امام حسین اور کربلا کے شہدا کے حوالے سے۔ تاہم، اس روایت کے دائرے سے ہٹ کر بعض شعرا نے شخصی مرثیے کو ایک منفرد صنف کے طور پر فروغ دیا، جہاں ذاتی عقیدت، جذباتی وابستگی اور حزن وملال کی گہری ترجمانی کی گئی ہے۔

یہ کتاب 'اردو شاعری میں شخصی مرثیے' اردو شاعری میں مرثیے کی نجی اور داخلی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اس میں ان مراثی کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے، جو مختلف شعرا نے اپنے قریبی رفقا، اساتذہ، احباب یا نامور شخصیات کے وصال پر تحریر کیے ہیں۔ شخصی مرثیہ عمومی مرثیے سے اس لحاظ سے منفرد ہوتا ہے کہ اس میں شاعر کی داخلی کیفیات، ذاتی جذبات اور گہرے المیے کا اظہار پایا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں مرثیے کی تاریخ کو دیکھا جائے تو ابتدا میں یہ صنف زیادہ تر مذہبی اور قومی سانحات کے اظہار کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ کلاسیکی شاعری میں میر انیس اور دبیر جیسے شاعروں نے مرثیہ نگاری کو عروج عطا کیا اور اس صنف کو اردو زبان کی ایک اہم صنف بنا دیا۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ جب اردو شاعری میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا تو شخصی مرثیے نے بھی ایک الگ پہچان بنا لی۔ شخصی مرثیے میں شاعر اپنے ذاتی دکھ، کسی عزیز ہستی کے بچھڑنے کا کرب اور اس کے اثرات کو نہایت جذباتی انداز میں پیش کرتا ہے۔

یہ کتاب اردو شاعری میں شخصی مرثیے کے تاریخی ارتقا، اس کی شعری اہمیت اور اس کے اسلوبیاتی وفکری عناصر پر روشنی ڈالتی ہے۔ غالب، اقبال، جگر مرادآبادی، حالی، جوش ملیح آبادی اور دیگر ممتاز شعرا کے ایسے کلام کا عمیق تجزیہ پیش کیا گیا ہے، جس میں شخصی مرثیے کی جمالیاتی اور فکری جہات نمایاں ہیں۔ ان شعرا کے مرثیوں میں جہاں غم واندوہ کی شدت محسوس کی جاسکتی ہے، وہیں ان کی زبان، طرز بیان اور استعاراتی حسن اردو ادب کے لیے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

مرزا غالب کا مرثیہ 'مرثیۂ موت' ایک عمدہ مثال ہے جس میں انھوں نے اپنے قریبی احباب کے بچھڑنے کا دکھ بڑے دردانگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح، علامہ اقبال کا اپنے استاد مولوی میر حسن کے انتقال پر لکھا گیا مرثیہ گہرے عقیدت و احترام کا مظہر ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے کئی قریبی افراد پر مراثی کہے، جن میں ان کے جذباتی کرب کی شدت واضح نظر آتی ہے۔ حالی کے شخصی مرثیے بھی نہایت مؤثر ہیں، جو نہ صرف جذباتی پہلو رکھتے ہیں بلکہ اصلاحی رنگ بھی لیے ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں شخصی مرثیے کی مختلف جہات پر غور کیا گیا ہے۔ ایک پہلو وہ ہے جہاں شاعر محض ایک جذباتی المیے کو بیان کرتا ہے، جبکہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرثیے میں معاشرتی وسماجی عوامل کو بھی سمو دیا جاتا ہے۔ مثلاً حالی اور اقبال کے مرثیوں میں یہ پہلو واضح نظر آتا ہے کہ وہ ذاتی غم کے ساتھ ساتھ قومی اور سماجی مسائل کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

شخصی مرثیے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کے جذبات سے براہِ راست مکالمہ کرتا ہے۔ اس میں شاعر کے ذاتی احساسات اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی اس غم میں شریک ہو جاتا ہے۔ شاعری میں داخلیت، جذباتی شدت، سادگی اور اثرانگیزی شخصی مرثیے کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس صنف میں شاعر اپنے محبوب، دوست، والدین یا کسی استاد کی وفات پر گہرے درد کو الفاظ میں ڈھالتا ہے، جو محض ایک ذاتی تجربہ نہ رہ کر ایک آفاقی انسانی تجربہ بن جاتا ہے۔

یہ کتاب اردو شاعری میں شخصی مرثیے کی فکری اور جمالیاتی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اور اس کے ارتقائی مراحل پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں شخصی مرثیے کی فنی باریکیوں، شعری اظہار کے طریقوں اور مختلف شعرا کے طرز بیان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، کتاب میں اس امر پر بھی غور کیا گیا ہے کہ شخصی مرثیوں میں جذبات کی شدت، ادبی لطافت اور داخلی تاثرات کو کیسے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ان افراد کے لیے نہایت وقیع ثابت ہوسکتی ہے جو اردو شاعری کی مرثیہ نگاری کی روایت، اس کے جذباتی وفکری اثرات اور شخصی غم کی شعری صورت گری میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

آئینہ خانۂ فکر

مصنف: ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری، مرتبہ: ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری

صفحات: 232، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: دارالسرور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہانپور

مبصر: ڈاکٹر نصرت سلطانہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، پی ایم سی او ای گورنمنٹ مادھو آرٹس اینڈ کامرس پی جی آٹونامس کالج، اُجین (ایم پی)

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری اپنی تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیتوں کے سبب مدھیہ پردیش ہی نہیں بلکہ پوری اردو آبادی میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مرتب ہیں۔ 'برہان پور میں اُردو نثر نگاری: ماضی اور حال کے آئینے میں' اور 'علاقۂ گوالیار میں اردو نعت گوئی کا ارتقا: ایک تحقیقی جائزہ' ان کے اہم تحقیقی وتنقیدی کارنامے ہیں۔ پیش نظر کتاب 'آئینہ خانۂ فکر' ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کو ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری نے مرتب کیا ہے۔ 16 مضامین اور 232 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مدھیہ پردیش اُردو اکادمی، بھوپال کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

اس میں 'پیش لفظ' مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کی چیئر مین ڈاکٹر نصرت مہدی نے تحریر کیا ہے۔ حرفِ اوّل میں مصنف نے کتاب لکھنے کی غرض و غایت پیش کی ہے۔ 'قابلِ تحسین کاوش' کے عنوان سے استادِ محترم ڈاکٹر غلام حسین نے مضمون قلم بند کیا ہے۔ غالباً ان کی زندگی کا یہ آخری مضمون ہے۔ لہٰذا ہمارے جیسے اور کئی طلبا کے لیے تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'مصرع موزوں کرنے کے عمل میں جگر کا خون ہونا' کے عنوان سے ڈاکٹر عزیز عرفان علیگ نے مصنف کی شخصیت کا احاطہ اور کتاب کا محاکمہ کیا ہے۔ رشید اندوری نے 'مضبوط قلم' کے عنوان سے تاثرات پیش کیے ہیں۔ 'مقدمہ' پروفیسر شجیے سور نکار نے لکھا ہے جو تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ مقدمہ ایک طرح سے اس کتاب کی جان ہے۔

کوئی تخلیق کار، تنقید نگار یا محقق جب اپنے مشاہدات و تجربات اور احساسات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ جس فن پارے کو وجود عطا کر رہا ہے، اس سے متعلق تمام فنّی اسرار و رموز سے وہ واقف ہو۔ تخلیق و تحقیق کا فکری اور ذہنی کینوس آخر تک وسیع ہو۔ اس کا مطالعہ عمیق اور مستند ہو۔ نیز ادیب گہری سوچ اور فکر کا حامل ہو۔ معاصرین کے حرکت و عمل پر نظر، حالاتِ حاضرہ سے واسطہ، معاشرتی مسائل سے وابستہ اور جدید دور کی سمت اور عصری تقاضوں کو جانتا پہچانتا اور خوب سمجھتا ہو۔

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کے قلم نے درج بالا تمام اصول و ضوابط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اس کتاب میں ادب کی ہر صنف پر ایماندارانہ قلم اٹھایا ہے۔ ہر مضمون اور مقام پر اسلوب اور لہجے کے نئے پن کے دیے روشن ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کی قرأت و مطالعے سے قارئین اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری نہ صرف اردو زبان و ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں بلکہ موجودہ ادب کی سمت و رفتار سے بھی کافی حد تک واقف ہیں۔ علاقائی تنقید و تحقیق سے متعلقہ مضامین میں خصوصاً 'کھرگون میں اُردو ادب اور وطنیت' تحقیقی ریاضت کا بولتا ہوا نمونہ ہے۔ اسی طرح 'برہان پور میں سہرے کی روایت' کے علاوہ 'کھنڈوہ کے ادبِ اطفال کے ارتقا میں سکندر عرفان کا حصہ' بھی ان کا بے حد عمدہ مضمون ہے۔ ان مضامین سے علاقائی ادب کی تاریخ میں زبردست اضافے کی امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

'شعرائے بھیونڈی: تذکرہ و تنقید' تنقیدی مضمون ہے۔ اعتدال و توازن ایسا ہے کہ مذکورہ کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے لاتا ہے۔ 'برہان پور میں کتبہ شناسی' تاریخ، تحقیق، تنقید وغیرہ میدانوں سے متعلق اہم اور منفرد مضمون ہے۔ کتبہ ہمارے عہدِ رفتہ کی داستان ہے۔ ہمیں ماضی سے روبرو اور حقیقت سے روشناس کراتا ہے۔ کتبہ اپنے آپ میں مشکل فن ہے اور پھر ایسے مشکل موضوع پر قلم اٹھانا اپنی راحت کو تج کر محنت و زحمت کو گلے لگانے کا تقاضا کرتا ہے۔ روایتی مضامین سے اکثر رسالے اور مضامین کے مجموعے چھلکتے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن روایتی موضوعات سے ہٹ کر دشوار گزار راہوں پر چلنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کی گذشتہ کتاب 'برہان پور میں اُردو نثر نگاری: ماضی اور حال کے آئینے میں' علاقائی تاریخ، علاقائی تحقیق و تلاش کی بہترین مثال ہے۔ میری نظر میں علاقائی تاریخ کو مدون کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ موصوف نے اپنے مضامین و مقالات اور کتابوں کی اشاعت سے یہ کام بخوبی انجام دے کر اپنی مادرِ گیتی برہانپور کا حق ادا کر دیا ہے۔

'پروفیسر عزیز اندوری کی خاکہ نگاری' اور 'مقصود نشتری اندوری کی شعری شناخت' جیسے مضامین علاقائی ادیب اور علاقائی ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے بہترین تحقیقی و معلوماتی مواد فراہم کراتے ہیں۔ عزیز اندوری کی خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ خوب دل جمعی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ 'ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تجدیدی کارنامہ: فیض فہمی' ایک جامع مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی مصروفیات، ادبی سرگرمیوں، تحقیقی دلچسپیوں سے روشناس کراتا ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے وقت فیض احمد فیض اور تقی عابدی دونوں فن کار ذہن و نظر اور فکر و خیال کے پردوں پر یکساں دستک دیتے رہتے ہیں۔

اس کتاب میں 'محبِ وطن اقبال اور اقبال اور اطفال' عنوان سے دو مضامین شامل ہیں۔ اقبال کی فکر اور اُن کے فن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود اقبال کے ذریعے بچوں کے لیے لکھے گئے ادب پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اقبال اور اطفال مضمون ایک نئی تشریح اور ایک نیا زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے۔

'مرزا حفاظت بیگ ماہر برہان پوری: شخصیت و فن: ایک جائزہ' میں بہترین معلوماتی اور تحقیقی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ پروفیسر شیخ فرید اور مرزا حفاظت بیگ ماہر کی اردو زبان کی تعلیم، اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کی گئی مشترکہ کوششوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے غیر اردو داں طبقے تک اُردو زبان کی رسائی کون کون سے ذرائع سے ممکن ہو سکتی ہے، اس کی طرف ایک بلیغ اشارہ بھی ملتا ہے۔

'اُردو تحقیق و تنقید کی ترقی میں حسرت کا کردار: ایک سرسری جائزہ' عنوان سے قلم بند مضمون میں حسرت کی صحافتی خدمات، ترتیب و تدوین کے کارنامے، تنقیدی مضامین کی تسوید و اشاعت، شعرائے اُردو کے سلسلوں کی ترتیب کے وقیع کارنامے گویا کہ گوناگوں خدمات کا ذکر اس مضمون کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔ ایک بات یہاں ضرور کہنا چاہیے کہ اس کتاب میں اکثر مضامین روایتی دھارے سے ہٹ کر ہیں۔ آپ نے حسرت کی انقلابی، رومانی، وطنی اور متصوفانہ شاعری پر بہت کچھ پڑھا ہوگا لیکن حسرت کی نثر نگاری، ان کی تنقیدی روش، تحقیقی کاوشات پر کم ہی مضامین آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ یہ مضمون بھی نئے انداز کا ہے اور حسرت کو شاعر سے ہٹ کر ایک محقق و ناقد کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جن پر تفصیل سے لکھنے اور انھیں سراہنے کی ضرورت ہے۔ تاہم کتاب میں شامل مضامین دلچسپ تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں۔ مثبت تنقید کو بڑھانے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری نے کسی خاص نظریے، کسی اہم ازم، کوئی تحریک کا عینک آنکھوں پر لگانے سے پرہیز کیا ہے۔ اسی لیے یہ کتاب تحقیق و تنقید کے نئے دریچے کھولتی ہے۔

ترتیب

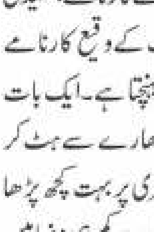

صفدر امام قادری: شخصی نقوش

ترتیب و تدوین: ظفر کمالی

صفحات: 608، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: اقبال حسن آزاد، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔ 811201

صفدر امام قادری کی اب تک 39 کتابیں (درسی کتابوں کو چھوڑ کر) منظر عام پر

آ چکی ہیں۔ ان میں تیرہ تصانیف تحقیق وتنقید، خاکے، شخصی تاثرات، تراجم اور ایک سفر نامہ (بنگلہ دیش کو میں نے دیکھا) پر مشتمل ہیں جب کہ ترتیب وتدوین کی 14، ہندی کی 6، انگریزی کی 1 اور اردو، ہندی اور انگریزی کی مشترکہ طور پر 5 مطبوعہ کتابوں کے علاوہ چھ کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ 'صلاح الدین پرویز کا آئیڈنٹیٹی کارڈ' (تحقیق وتنقید) ان کی پہلی کتاب ہے۔ 'آئنڈیٹی کارڈ' دراصل صلاح الدین پرویز کا وہ ناول تھا جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ صفدر امام قادری کی یہ کتاب دراصل ایک احتجاج ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی باتیں دوٹوک انداز میں کہی ہیں۔ اس کتاب نے بہت جلد اردو کے ادبی حلقوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس کے علاوہ تحقیق وتنقید کے ضمن میں اردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ، ذوق مطالعہ، محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور اور دیگر مضامین، مشاہدات، عہد سرسید کے ادبی وعلمی نقوش شامل ہیں۔ جب کہ 'جانے پہچانے لوگ' اور 'میرے والدین' خاکوں اور شخصی تاثرات پر مبنی تصانیف ہیں۔ علاوہ ازیں سید محمد محسن کا مونوگراف، کالموں کا انتخاب، عرض داشت، بنگلہ دیش کو میں نے دیکھا (سفر نامہ) اور عربی ادب کے تراجم 'روشن ہے ریگ زار' ان کے ادبی کارنامے ہیں۔

ظفر کمالی بیک وقت محقق، نقاد، رباعی گو، خاکہ نگار، تذکرہ نویس، ماہر ادب اطفال اور ظریفانہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھیں ادب اطفال کا انعام عطا کیا تھا۔ وہ شعبۂ فارسی زیڈ اے اسلامیہ کالج سیوان (بہار) سے بہ حیثیت استاد وابستہ تھے۔

(1) صفدر امام قادری: شخصی نقوش صفدر امام قادری کی شخصیت کی پرتیں کھولتی نظر آتی ہے۔ اس کتاب سے گزرتے وقت ایک ایسے صفدر سے میری ملاقات ہوتی ہے جو اب تک میرے لیے اجنبی تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر تا حال صفدر کو زندگی کے کیسے کیسے تجربے ہوئے...... کیسے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوئی...... کس طرح یہ شخص تجربات کی بھٹی میں تپ کر کھرا سونا بنا...... ان سب کا حال اس کتاب میں مذکور ہے۔

'عرض مرتب' میں ظفر کمالی یوں رقم طراز ہیں:

''صفدر امام قادری کی متنوع خدمات کو دیکھتے ہوئے برسوں پہلے یہ بات ہمارے دل میں آئی کہ ان کی شخصیت اور فن کے تعلق سے ایک کتاب ترتیب دی جائے۔ ان کے تعلق سے اصحاب فکر ونظر اور ان کے چاہنے والوں نے اچھی خاصی تعداد میں مضامین لکھے تھے۔ کتاب کو عملی شکل دینے کے لیے انھیں یکجا کیا گیا اور مزید مضامین کے لیے ان کے دوستوں اور شاگردوں سے رابطہ کیا گیا۔ اس طرح کے مضامین حاصل کرنے میں عموماً بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ہمارے لیے یہ بات باعث حیرت ہے کہ ہماری پر خلوص گزارش پر اتنی تعداد میں مضامین موصول ہوئے کہ ایک کتاب میں ان کی سمائی ناممکن ہوگئی لہٰذا ہم نے شخصیت اور فن کے لیے علاحدہ علاحدہ کتابیں ترتیب دینے کا ارادہ کیا لیکن دو کتابوں کے باوجود بھی تمام مضامین کی شمولیت ممکن نہیں ہو سکی مجبوراً بیسوں مضامین کو حذف کرنا پڑا جو آئندہ کسی اور کتاب میں شامل ہوں گے۔''

'کچھ بیاں اپنا' کے تحت صفدر نے اپنے بارے میں دو مضامین قلم بند کیے ہیں۔ اول 'جیسا سیکھا، جو کچھ پڑھایا' اور دوم 'میری کالم نویسی'۔ پہلے مضمون سے یہ ہم ایک اچھے شاگرد اور اچھے استاد کی خوبیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ایک اچھا شاگرد ہونا اور ایک اچھا استاد ہونا دو الگ چیزیں ہیں۔ صفدر نہ صرف ایک اچھے استاد ہیں بلکہ ایک اچھے شاگرد بھی رہے ہیں۔

صفدر امام قادری کالم نویسی میں بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کے کالم بھی ادبی شان کے حامل ہوتے ہیں۔ 'خاکے' کے تحت بتیا کے شاعر مرزا کھونچ اور غضنفر کا ایک ایک خاکہ اور ظفر کمالی کے دو خاکے شامل ہیں۔ 'بیگم صفدر امام' کی ایک بہترین خاکہ ہے جس میں گرچہ شازینہ (مرحومہ) کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس خاکے میں صفدر کی ایسی ایسی خوبیاں نظر کے سامنے آتی ہیں جن سے ان کے بیشتر دوست اور شاگرد نا آشنا تھے۔ اس عمدہ خاکے کے لیے ظفر کمالی کو دلی مبارکباد۔

'عنایات بزرگاں' کے تحت مولانا علی الیاس عاجز، ظفر امام، قاسم خورشید، سہیل انجم، ریحان غنی اور اقبال حسن آزاد کی تحریریں شامل ہیں۔ یہ سارے مضامین مربیانہ قسم کے ہیں۔

علی رفاد فتیحی اور امتیاز وحید نے ظفر کمالی کی کتاب 'سوغات' پر تبصرہ کیا ہے۔ بقول امتیاز وحید یہ 'صفدری رباعیاں' ہیں۔ 'حلقۂ احباب کی محبتیں'...... اس عنوان کے تحت ایس اے شکیل، سہیل وحید، واحد نظیر، محمد ذاکر حسین، نوشاد احمد کریمی، نظام الدین احمد، غلام ولا اور حفصہ اختر کے مضامین شامل ہیں۔ آب خلوص سے محبت کی مٹی میں گوندھے گئے یہ سارے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ ہر مضمون صفدر کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتا نظر آتا ہے۔

صفدر کے نئے پرانے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس دور پر فتن میں وہی ایک ایسے استاد ہیں جو اپنے شاگردوں کو صرف زیور تعلیم سے آراستہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا کیریئر بھی بناتے ہیں۔ آج ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ملک و بیرون ملک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے۔ ظاہر ہے ایسے استاد کو بھلا پانا آسان کام نہیں ہے۔

'اظہار عقیدت' کے طور پر ان کے پرانے شاگردوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان شاگردوں میں تنویر حسن، جاوید اقبال، ترنم جہاں، منی بھوشن کمار، تسلیم عارف، نکہت پروین، سرتاج سبحانی، افشاں بانو، محمد عبدالرحمٰن ارشاد، راج دیو کمار، اور ناظرین عشرت کے نام شامل ہیں۔

نئے شاگردوں کے تاثرات 'گلہائے عقیدت' کے عنوان سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس عنوان کے تحت محمد مرشد، شبنم پروین، شگفتہ ناز، نازیہ تبسم، محمد مرجان علی، محمد شوکت علی، محمد ابو رافع، شازیہ حسن، فرحت صغیر، ناہید پروین اور محمد عامر نے استاد سے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ نوجوان اردو زبان وادب کا مستقبل ہیں۔

اس کتاب میں 'بالمشافہ' کے عنوان سے صفدر امام قادری کے دو انٹرویو بھی شامل ہیں۔ پہلا انٹرویو جاوید دانش نے لیا ہے اور دوسرا امتیاز وحید نے۔ دونوں انٹرویو صفدر کے بے پناہ شوق علم کے غماز ہیں۔ صفدر امام قادری کو کتابوں سے اس قدر عشق ہے کہ انھوں نے محض خدا بخش لائبریری کی ہم سائیگی کی خاطر اس علاقے میں فلیٹ خریدا۔ کتابوں سے ایسا عشق خال خال ہی نظر آتا ہے۔

'خطوط' کے کالم میں ظفر کمالی کے نام صفدر امام قادری کے 53 خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے دونوں اصحاب کی نہ صرف علمی وادبی بصیرت کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان سے ملک کے سماجی اور سیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کئی جگہ بے تکلفانہ بہاری بولی کا استعمال ہوا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔ ایک بات اور قابل غور

ہے اور وہ یہ کہ شروع کے خطوط میں تو 'پیارے بھائی'، 'ظفر بھائی' یا 'بھائی ظفر کمالی' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے لیکن 1991 کے بعد لکھے گئے زیادہ تر خطوط میں 'ڈاکٹر صاحب' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ دوستی کے ساتھ احترام کا یہ رشتہ قابل قدر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

'مطبوعات' کے تحت عبدالوہاب قاسمی کا مضمون 'صفدر امام قادری کی تصنیفات: ایک تعارف' پیش کیا گیا ہے جس میں صفدر کی 43 علمی وادبی اور درسی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اگر یہ مضمون 'صفدر امام قادری: فکری وفنی زاویے' میں شامل ہوتا تو بہتر تھا۔

کتاب کے آخر میں 'منظوم خراج عقیدت کے طور پر نوشاد احمد کریمی کی نظم 'صفدر امام قادری کے نام' اور امان ذخیروی کی توشیحی نظم 'درشان پروفیسر صفدر امام قادری' شامل ہیں۔ دونوں نظمیں فکری اور فنی لحاظ سے عمدہ ہیں۔

عاصی فائقی: فن اور شخصیت

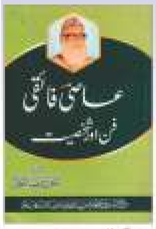

مرتب: تنویر رضا برکاتی

صفحات: 200، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: مارچ 2024

ناشر: دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہان پور

مبصر: پروفیسر محمد رفیق انصاری، پروفیسر شعبۂ اردو

چھترپتی مہاراج شیواجی گورنمنٹ کالج، برہان پور

'عاصی فائقی فن اور شخصیت' تنویر رضا برکاتی کی ساتویں مرتبہ کتاب ہے۔ یہ دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب میں اکادمی کی ڈائریکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی کا پیش لفظ، صوبے کے ادیب، شاعر، نقاد اور دیگر مصنفین کی تخلیقات شامل ہیں۔ عرض مرتب میں تنویر رضا برکاتی نے مرتبہ کتاب، 'عاصی فائقی فن اور شخصیت'، کے مواد کی فراہمی سے زیور طباعت کے دشوار گذار مراحل تک کی روداد آسان اور موثر پیرائے میں بیان کی ہے۔ ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کا تبصرہ بعنوان 'عاصی فائقی شخصیت اور فن پر اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے' میں ڈاکٹر صاحب نے مقالہ نگاران کے مضامین ومقالات کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہے اور مضامین ومقالات کی حیثیت سے قارئین کو واقف کرایا ہے۔ پروفیسر حدیث انصاری کا مضمون بعنوان 'دارالسرور، باب دکن اور عاصی فائقی' میں تغزل کے رنگ اور مسائل زندگی پر سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد یاسین گنائی کا مضمون 'عاصی فائقی کی شاعری میں صنعتوں کا استعمال' 29 صفحات پر مشتمل سب سے طویل مضمون ہے۔ مضمون نگار نے عاصی صاحب کے پانچوں شعری مجموعے کا گہرا مطالعہ کر کے بہت ہی محنت ومشقت سے جتنی صنعتوں کی مثالیں پیش کی ہیں قارئین کو ان سبھی صنعتوں سے متعارف بھی کرایا ہے۔ ڈاکٹر شاہ جہاں بیگم نے قطعہ نگاری سے تعارف کراتے ہوئے رباعی کو اس صنف سے مختلف صنف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، ڈاکٹر صاحبہ نے منتخب عنوان عاصی فائقی کی قطعہ نگاری کا بالغ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور عاصی صاحب کے قطعات کی خوبیوں سے ہمیں آشنا کیا ہے۔ 'شہرگل کا غزل گو عاصی فائقی' میں مضمون نگار ڈاکٹر توقیر عالم توقیر نے عاصی فائقی کی غزلیہ شاعری اور آتش، اقبال اور عرفان صدیقی جیسے شعرا کے کلام میں یکساں خیال کی مثالیں پیش کی ہیں۔ عاصی فائقی کی غزل میں تغزل اور زبان کی سادگی کا تفصیلی جائزہ ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری نے اپنے منتخب موضوع 'گلابی غزل گو عاصی فائقی' میں تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر مبین نذیر کا مضمون بعنوان 'حضرت عاصی فائقی کی تقدیسی شاعری' میں عاصی فائقی کی حمد گوئی نعت گوئی اور سلام وغیرہ کی خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ عاصی کی تقدیسی شاعری کو روح پرور اور رنگِ تصوف ووحدت الوجود کا آئینہ دار بتایا ہے۔ ڈاکٹر فرحین بیگم کا مضمون بعنوان 'عاصی فائقی' کا کلام شاعر کے قلبی احساسات کا عکاس 'تقدیسی شاعری کی راہ پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے عاصی صاحب کی مذہبی فکر اور پاکیزہ خیالات پر روشنی ڈالی ہے اور تصوفانہ کلام میں صنعتوں کے استعمال سے روشناس کیا ہے۔ یوں تو کتاب میں شامل تمام مضامین عاصی فائقی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں، تاہم طالب علم کو ذہن نشین رکھتے ہوئے ڈاکٹر نصرت مینوں کا مضمون 'عاصی فائقی کی غزل گوئی' عمدہ مضمون ہے۔

ڈاکٹر محمد الطاف انصاری کا مضمون بعنوان 'عاصی فائقی بحیثیت نظم گو' عمدہ اور عاصی فائقی کی نظم نگاری پر پر مغز مضمون ہے۔ آصف پرویز نے بعنوان 'عاصی فائقی کی شخصیت اور فن کے آئینے میں' عاصی فائقی کے پانچوں مجموعہ کلام عاصی کی فنکاری کا جائزہ لیا ہے۔

شہباز زرین جلیل احمد نے 'عاصی فائقی کی شاعری کی خصوصیات' میں نظم نگاری کی خصوصیات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ سہیم الدین خلیل الدین صدیقی نے اردو شاعری کی روایت پر اظہار خیال کرتے ہوئے 'عاصی فائقی کی شاعری میں قنوطیت' کے تحت غم ویاس کے تاثر سے واقف کرایا ہے۔ شیخ اظہر بشیر کے قلم سے تحریر مضمون 'عاصی فائقی کی شاعری میں تصوف' عاصی صاحب کے صوفیانہ کلام کا آئینہ دار ہے۔ ایم ریحانہ پروین ناہید 'عاصی فائقی کی شخصیت اور شاعری' کے زیر عنوان سے موصوف کا تعارف اور ان کی شاعری کے اہم موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ شیخ بدرالدین نے مضمون 'عاصی فائقی کی شاعری میں تصوف کا رنگ' کو مرکزی حیثیت دے کر عاصی کی صوفیانہ شاعری پر روشنی ڈالی ہے، شیخ شکیلہ بانو شیخ اکبر نے عاصی فائقی کی شاعرانہ عظمت کا جائزہ مجموعہ کلام التحیات کی روشنی میں لیا ہے۔ محترمہ نے اس مجموعۂ کلام میں شامل حمد، نعت، منقبت، مرثیہ اور صوفیانہ کلام پر اپنے خیالات سے روشناس کرایا ہے۔ حارث حمزہ لون کا مضمون 'عاصی فائقی کا شعری منظر نامہ' عمدہ انداز میں لکھا ہے۔ محمد شاکر نے عاصی فائقی کی شخصیت کو سچے تجربے کے معتبر اظہار کا شاعر بتانے کی سعی کی ہے۔ غزل، رباعی، قطعہ اور نظم کے اشعار کے انتخاب سے ریسرچ اسکالر یاسمین صاحبہ نے عاصی فائقی کی شاعرانہ خصوصیات میں فائقی کی شاعرانہ خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ تحسین صاحب نے عاصی فائقی کے سوانحی خاکے کا سرسری جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شاہینہ ناز نے مجموعہ کلام التحیات میں صوفیانہ رنگ تلاش کیا ہے۔ میمونہ تحسین نے اپنے منتخب عنوان 'عاصی فائقی کی شاعری کے چند نمایاں پہلو' میں فائقی کی شعری صفات کا بیان کرنے کے ساتھ خصوصاً مذہبی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ محترمہ فرزانہ انصاری کا مقالہ عاصی کی شاعری میں رنگِ تصوف التحیات کے تناظر میں ایک عمدہ مقالہ ہے۔ اس میں محترمہ نے فلسفۂ تصوف سے تعارف کرایا ہے اور مجموعہ کلام التحیات سے صوفیانہ کلام کو پیش کر کے عاصی فائقی کی شاعری صوفیانہ رنگ میں رنگی ہوئی ثابت کیا ہے۔

اس کتاب میں تقریباً سبھی مضمون نگار نے شہر برہان پور کو علمی و ادبی، تاریخی اور ثقافتی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں شامل ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کے تاثرات کی چند سطروں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''غرض کہ تنویر رضا برکاتی کی مرتبہ کتاب 'عاصی فائقی :فن اور شخصیت' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ عاصی فائقی کے حوالے سے نقش اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی عاصی فائقی پر تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے کام ہوں گے یہ کتاب بہترین حوالہ ثابت ہوگی۔''

صحافت و ابلاغیات

اردو صحافت اور ادب (اداریے اور شذرات)

مصنف: حسن ضیاء

صفحات: 384، قیمت: 300 روپے، سال اشاعت: 2024

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر جگ موہن سنگھ، مکان نمبر C-73، لین نمبر 8، شیو نگر، جموں۔ 180001

حسن ضیاء نے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز علی گڑھ سے کیا۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں لکھتے بھی رہے اور کئی رسائل و جرائد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ادب اور صحافت کے مختلف شوقیہ اور پیشہ وارانہ مراحل سے گزرتے ہوئے جب 2006 میں انھوں نے اُردو کے مشہور جریدہ ماہنامہ 'آج کل' کی ادارت سنبھالی تو ان کی ادبی و صحافتی صلاحیتیں زیادہ کھل کر سامنے آئیں۔ حسن ضیاء نے اس عرصے میں ماہنامہ 'یوجنا' (انگریزی) اور ماہنامہ 'یوجنا' (ہندی) اور ماہنامہ 'آج کل' (اُردو) جیسے نامی رسالوں کے مدیر کے فرائض بھی انجام دیے۔ دوران ادارت انھوں نے ان تینوں رسالوں کے لیے مستقل اداریے بھی لکھے۔ حسن ضیاء کے مطابق وہ مشہور فکشن نگار، صحافی اور دانشور خشونت سنگھ سے بہت متاثر ہوئے۔

حسن ضیاء کی تازہ ترین کتاب 'اُردو صحافت اور ادب (اداریے اور شذرات)' 2024 میں شامل چند مضامین کو چھوڑ اکثر و بیشتر تحریریں رسالہ 'آج کل' کے اداریے ہیں۔ ان اداریوں کو عنوانات کے ساتھ اب حسن ضیاء نے اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ زیر بحث کتاب میں صحافت اور منتخب صحافیوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافت، سائنس ٹیکنالوجی اور اردو ماس میڈیا وغیرہ پر معلوماتی مضامین لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب میں حسن ضیاء نے اردو صحافت کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے مولوی محمد باقر اور ان کے اخبار 'دہلی اُردو اخبار' سے لے کر عصر حاضر تک کی اردو صحافت اور صحافیوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے مثلاً: اردو صحافت، شخصیات، سفر ہے شرط، زبان و ادب، غالبیات، تحریک آزادی، آئین اور گاندھیائی ادب، متفرقات۔

زیر بحث کتاب میں اردو صحافت اور ادب کے علاوہ ہندوستان کے سائنسی اور تکنیکی پیش رفت کے حوالے سے رسالہ 'آج کل' کے لیے لکھے گئے جتنے بھی اداریے شامل کیے ہیں یہ سبھی معیاری نوعیت کے ہیں۔ ان اداریوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسن ضیاء صحافت کے بارے میں اپنا ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ حسن ضیاء لکھتے ہیں کہ:

''صحافت سے مراد وہ عمل ہے جس میں خبروں کو جمع کر کے لکھ کر، ایڈٹ کر کے مختلف میڈیا پلیٹ فارمس کے ذریعے ان کی نشر و اشاعت کی جاتی ہے۔ خبر وہ معلومات ہے جو حال ہی میں ہوئے واقعہ کی اطلاع فراہم کرتی ہے۔ خبر کی ترسیل کے مختلف ذرائع ہو سکتے ہیں۔ خبر کی تعریف و تشریح مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ خبر کے اجزائے ترکیبی میں کب، کیوں، کہاں، کیسے، کون، جیسے سوالات کے جوابات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ خبر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تازہ اور بروقت ہو اور اس کو سنتے ہی اثر پڑے، واقعہ ہم سے قریب کا ہے، اس میں کوئی متنازعہ بات ہے اور کوئی بڑی شخصیت شامل ہے تو خبر کو زیادہ دلچسپی سے پڑھا، سنا یا دکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی خلاف معمول بات ہے، یا خبر مفید معلومات پر مبنی ہے تب بھی اس کا اثر زیادہ ہوگا۔ خبر کے ساتھ نظر بھی اچھی صحافت کا حصہ ہونا چاہیے یعنی خبر سے آگے بڑھ کر حالات حاضرہ پر تبصرے اور تجزیے بھی کسی صحیفے کی تشکیل و تکمیل میں اہم ہیں۔'' (ص 16)

کتاب میں شامل عنوانات کے تحت حسن ضیاء نے خواجہ احمد عباس، خواجہ احمد فاروقی اور کرشن چندر سے لے کر آل احمد سرور، نند کشور وکرم، رشید احمد صدیقی، کلدیپ نیر، شمیم حنفی وغیرہ کی صحافتی اور ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ حسن ضیاء نے اپنی کتاب میں یورپ کا سفر اور خاص طور پر برٹش لائبریری کے حوالے سے کئی اہم معلومات پیش کی ہیں۔

برصغیر کے بہت کم اسکالر ایسے ہوں گے جنھوں نے برٹش لائبریری لندن سے استفادہ کیا ہے۔ حسن ضیاء صاحب نے یورپ کے سفر کے دوران عالمی شہرت یافتہ اس برٹش لائبریری کا بھی دورہ کیا۔

برٹش لائبریری لندن کا شمار دُنیا کی بہترین اور سب سے بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے جہاں زبان و ادب کے علاوہ تقریباً تمام علمی اور ادبی موضوعات پر کتابیں اور مسودے دستیاب ہیں۔ اس لائبریری کا ایک بڑا اور اہم حصہ انڈیا آفس ریکارڈ کہلاتا ہے۔ لائبریری کے اس حصے میں اُردو اور ہندوستانی زبانوں کے قدیم ترین قلمی نسخے موجود ہیں۔ اس لائبریری میں متحدہ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے نادر و نایاب قلمی نسخے اور دیگر اشیا بھی موجود ہیں۔ چنانچہ حسن ضیا اس کتاب میں لکھتے ہیں:

یہ دیکھ بھی خوشی ہوئی کہ برٹش لائبریری کے ساؤتھ ایشیا کلکشن میں 80 ہزار سے زائد اردو کتابیں اور ایک ہزار کے قریب مخطوطات ہیں جن میں بعض نادر و نایاب ہیں۔ اردو اخبارات اور رسال بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ غرض کہ یہ ذخیرہ تلاش و جستجو اور مطالعے و تحقیق کے لیے ایک نئی دنیا کے دروازے ہم پر وا کرتا ہے۔ (ص 212)

اسی طرح زبان و ادب کے باب میں غالب، حالی، شبلی، پریم چند، اقبال، اکبر الہ آبادی، ساحر لدھیانوی وغیرہ کے حوالے سے مختصر لیکن معیاری اور معلوماتی مضامین لکھے گئے ہیں۔ زیر بحث کتاب میں 'غالبیات' کے عنوان سے حسن ضیاء کی پانچ تحریریں شامل ہیں۔ اس کتاب 'اردو صحافت اور ادب' میں تحریک آزادی، آئین اور گاندھیائی ادب کے عنوان 13 مضامین کتاب میں شامل ہیں۔ یہ سبھی مضامین 1857 کے بعد کے جدید ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

کتاب کے ساتویں باب میں مصنف نے صحافتی نوعیت کے تین مضامین شامل کیے ہیں۔ یہ سبھی مضامین چند سال پہلے کے کرونا وائرس کے پھیلاؤ اور ہندوستانی عوام، سماج اور معیشت پر اس کے اثرات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ 'اُردو

صحافت اور ادب' کے مصنف حسن ضیاء نے اس کتاب کے آخری باب میں 'مصنف کے بارے میں' کے عنوان سے اپنا سوانحی کوائف درج کیا ہے۔ جس سے ان کی شخصیت اور خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

حسن ضیاء کے بارے میں مشہور و معروف ادیب اور صحافی وشوا ناتھ طاؤس فرماتے ہیں کہ:

''آپ نے اعلیٰ و عمدہ مضامین کی ایک کہکشاں بچھا دی ہے جس کا نظارہ پا کر حصول آزادی سے قبل لاہور کے ادبی رسالوں مخزن، عالمگیر، نیرنگ خیال اور ہمایوں کی یاد زندہ و تابندہ ہوگئی جو طمطراق کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔'' (ص 383)

میری ذاتی رائے میں حسن ضیاء کی یہ کتاب عصری اُردو صحافت اور ادب کے بارے میں ایک جامع کتاب ہے جس سے اُردو صحافت، ادب، صحافیوں اور ادیبوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو صحافت اور ادب کے ہر طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تصوف

عارفانہ اور متصوفانہ اشعار

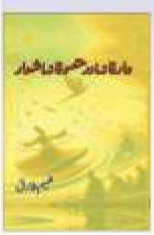

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 144، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ملنے کا پتہ: ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی- 110002

مبصر: ڈاکٹر محمد دانش غنی

شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلیکر کالج، رتناگری (مہاراشٹر)

شمیم طارق محقق، نقاد، شاعر، کالم نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ تحریر کے علاوہ ان کو تقریر میں بھی ملکہ حاصل ہے لیکن اپنی 24 ویں کتاب میں انھوں نے خود کو اشعار کے شارح کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ شارح کی حیثیت تلوں میں سے تیل نکالنے جیسی ہے اور اس مشکل کام میں بھی انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ مذکورہ کتاب میں میر تقی میر، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانِ جاناں، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، خواجہ حیدر علی آتش، مرزا غالب، مصطفےٰ خاں شیفتہ، شاہ تراب علی قلندر، امیر مینائی، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر، بیدم شاہ وارثی، علامہ اقبال، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، سید امین اشرف کے علاوہ چار ایسے شعرا کے کلام میں روحانیت اور ماورائیت کی نشاندہی کی ہے جو ترقی پسند شعرا کی فہرست میں شامل ہیں۔ یہ شعرا فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور جاں نثار اختر ہیں۔ شاعری کی تفہیم اور پھر ایسی شاعری کی تفہیم جس میں تصوف کی کیفیات اور مفاہیم کی آمیزش ہو انتہائی مشکل کام ہے لیکن شمیم طارق نے اس کام کو بہت آسانی سے کیا ہے۔ اس لیے کہ ان کا مطالعہ تو وسیع ہے ہی تصوف سے نظری تعلق بھی ہے۔ کسی صاحب کے استفسار یا اعتراض پر انھوں نے ترقی پسند شعرا کے کلام میں بھی تصوف یا ماورائیت کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تصوف اور ماورائیت ایک نہیں ہے۔ البتہ تصوف میں ماورائی احساسات شامل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نشاندہی اتنی مدلل ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی یہ وضاحت بہت قابلِ قدر ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر بھی پورا اترتا ہو اور بحرِ ناپیدا کنارِ زندگی کے معیار پر بھی۔ فراق، فیض، مخدوم اور جاں نثار نے فن کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے اور زندگی کی مختلف کیفیتوں اور صداقتوں کے ساتھ بھی مگر الفاظ و تراکیب کی حد تک ایک خاص رنگ کو برقرار رکھا ہے جو ماورائیت کے احساس سے خالی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ کلاسیکی اور جدید شعرا کے اشعار کو تو تصوف سے الگ کر کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا، ترقی پسند شعرا میں بھی بیشتر کے خیالات کو ماورائیت کے ان کے احساسات کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی ماورائیت نے بیشتر روحانیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ 'برائے شعر گفتن تصوف خوب است' یعنی شعر گوئی کے لیے تصوف خوب ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جن شعروں کا انتخاب کیا ہے وہ بھی بہت خوب اور بامعنی ہیں۔ مثلاً

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے	میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(میر درد)

گل کو جو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں	در کو جو در کہوں تو اس آنسو کو کیا کہوں

(مظہر جانِ جاناں)

بے خود کیے دیتے ہیں انداز حجابانہ	آ دل میں تجھے رکھ لوں اے جلوۂ جانانہ

(بیدم شاہ وارثی)

صبح کی آس کسی لمحے جو گھٹ جاتی ہے	زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

ایک مضمون 'قوالی اور سماع' کے عنوان سے ہے جس میں ان کا موقف بہت گراں قدر ہے کہ قوالی اور سماع کے سلسلے میں طرفین نے اس سلسلے میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے جو اثرات کے قائل نہیں ہیں وہ قوالی یا سماع سے طاری ہونے والے وجد و حال کو 'شرعی ناچ' قرار دیتے ہیں جو قائل ہیں وہ اس کی شرائط کا لحاظ رکھتے ہیں نہ آداب کا۔ قوالی اور ہندوستانیت کا بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ حتیٰ کہ چشتی سلسلے سے تعلق رکھنے والے اگرچہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں ملتے ہیں مگر قوالی اور سماع کی مقبول صورت ہندوستان یا ہندوستان سے الگ ہونے والے ملکوں میں ہی ملتی ہے اور اس میں مقامی زبانوں کے الفاظ کے علاوہ بھجن کیرتن کا انداز بھی ہے۔ ہندوستان کے نقش بندی صاحبان اس سے گریز کرتے ہیں۔ ایک زمانے سے قوالی اور سماع میں صرف اشعار اور منظوم کلام ہی سنے سنائے جاتے ہیں مگر اس موضوع پر اہل دل صوفیہ نے جو لکھا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر نثر میں لکھے ہوئے جملوں اور عبارتوں کے دہرائے جانے کے بھی اثرات مرتب ہوتے تھے۔ محفل قوالی اور سماع کو منعقد کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ قوالی یا سماع کا وقت نماز کے وقت سے نہ ٹکرائے مگر اب یہ احتیاط نہیں کی جاتی۔ اس لیے اس کے جائز و ناجائز ہونے پر بحث کرنے سے پہلے اس سوال پر بحث ہونا ضروری ہے کہ قوالی اور سماع اپنی اصل شکل میں رہ بھی گیا ہے یا نہیں؟

مصنف نے یہ وضاحت ابتدا (پیش لفظ) میں کر دی ہے کہ:

''عارف سے مراد پہچاننے والا یا حق کی معرفت رکھنے والا اور عارفانہ سے مراد عارف کی مانند ہے۔ چونکہ 'سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا' کی تکرار کرنے والوں میں بھی سچ یا حق کا معیار یا مفہوم الگ الگ ہے اس لیے عارف اور عارفانہ کے مفہوم کا وسیع تر معنی کا حامل ہونے کا امکان موجود ہے مگر معرفت (خدا شناسی، قانونِ قدرت کی واقفیت وغیرہ) اسمِ معرفہ ہے جو ایک معین شے کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو اس مفہوم میں ہی استعمال کیا جاتا ہے جو دینِ فطرت

سے مشروط ہے۔ دوسرے الفاظ کے مفاہیم میں بھی اس قسم کا فرق ہے مثلاً عقل اور وجدان کی بنیاد پر خالق کائنات کو ایک ماننے والے موحد اور محسن انسانیت کی اتباع اور اتباع میں خالق کائنات کو ایک اور فقط ایک تسلیم کرنے والے مومن ہیں۔'' (ص 11)

یہ کتاب طویل تبصرے اور بھرپور ستائش کی متقاضی ہے۔ کتاب کا انتساب ایک بڑی علمی شخصیت پروفیسر مسعود انور علوی کے نام ہے جو خانقاہ نشین بھی ہیں اور اس انتساب کی جو وجہ بتائی گئی ہے وہ بھی بہت گراں قدر ہے۔ مختصراً اتنا کہہ دینا بھی کافی ہے کہ شمیم طارق کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اردو جاننے والا ہر شخص اس کو پڑھے اور اپنے کتب خانے میں محفوظ رکھے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی تصحیح ہونا ضروری ہے۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔

خاکے

کیسے انھیں بھلائیں

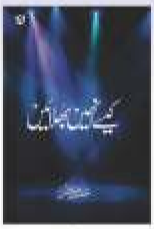

مصنف: عمیر منظر

صفحات: 158، قیمت: 299 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: نامک پبلی کیشنز دہلی 110025

مبصر: ڈاکٹر اطہر حسین، نادرن ریجنل لینگویج سینٹر، پنجابی یونیورسٹی، کیمپس پٹیالہ، پنجاب

نظم ونثر دونوں حوالوں سے ادبی دنیا میں ڈاکٹر عمیر منظر محتاج تعارف نہیں۔ وہ مختلف موضوعات پر مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی کئی اہم تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی کتاب 'خان محبوب طرزی لکھنو کا ایک مقبول ناول نگار' ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے جسے ادبی دنیا میں خوب سراہا گیا۔ مختلف موضوعات پر لکھا جانے والا ان کا ہفتہ واری کالم بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف 'کیسے انھیں بھلائیں' (خاکوں کا مجموعہ) دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ واضح رہے کہ کیسے انھیں بھلائیں کے بیشتر خاکے مختلف اوقات میں وجود میں آنے والی تحریروں کا مجموعہ ہے، جس میں متعدد شخصیات پر 20 خاکے شامل ہیں۔ ان شخصیات میں مشاہیر علم وادب، اساتذہ اور احباب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عام انسان بدو بھیا کا غیر معمولی خاکہ بھی شامل ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں سے کئی اہم خاکے زندہ شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔

کتاب میں مولانا ابواللیث ندوی، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی، مولانا ابوالبقا ندوی، حفیظ نعمانی، مجتبیٰ حسین اور اشتیاق احمد ظلی وغیرہ جیسی اہم شخصیات پر شامل خاکوں کے علاوہ ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنے ان معاصرین کی سیرت کو بھی اجاگر کیا ہے جن سے انھیں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر قربت رہی ہے۔ ان شخصیات کے چہروں کو روزمرہ کی بول چال میں براہ راست اور بے تکلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خاکہ نگاری انسان کی ظاہری وباطنی عکاسی کا نام ہے۔ ان میں شامل کئی ایسے خاکے ہیں، جو زندگی کی حرارت سے معمور ہیں اور ہمارے درمیان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں بدھو بھیا کے خاکے کو خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عمیر منظر نے اپنی خاکہ نگاری کی ابتدا کے بارے میں لکھا ہے کہ انھیں خاکہ لکھنے کی تحریک پروفیسر صغری مہدی سے ملی۔ انھی کے ایما پر انھوں نے اپنا پہلا خاکہ لکھا، جو رسالہ نئی کتاب میں شائع ہوا۔ یہ خاکہ 'قرۃ العین حیدر کچھ یادیں کچھ باتیں' کے عنوان سے مذکورہ کتاب میں بھی شامل ہے۔ یہ نقطۂ آغاز تھا۔ پھر اس کے بعد خاکہ نگاری کی شاہ راہ پر ان کے قلم رواں ہو گئے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کئی اہم خاکے لکھے بلکہ کووڈ کے زمانے میں خاکہ نگاری سے متعلق ان کے شوق میں مزید اضافہ ہوا اور یہ سفر توانائی کے ساتھ آگے بڑھا۔ کتاب میں شامل خاکوں کے علاوہ بھی انھوں نے کئی اہم خاکے لکھے ہیں جو اس کتاب کا حصہ نہیں ہیں۔ مذکورہ خاکوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھائے وہ ان سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان سے جذباتی تعلق بھی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام خاکوں میں جذبات کی لہر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا ابواللیث ندوی، قرۃ العین حیدر، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی، مولانا ابوالبقا ندوی، حفیظ نعمانی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی وغیرہ جیسی اہم شخصیات کے فکر وفن سے خوب استفادہ کیا ہے۔ رفقا کے خاکوں بالخصوص ڈاکٹر امان اللہ فہد فلاحی، معظم بلال اور محمد علم اللہ کا خاکہ جذبات سے پر نظر آتا ہے ان خاکوں سے نہ صرف یہ کہ ان کے تعلقات بلکہ خاکہ نگار کی شخصیت اور ان کے ماضی کے دریچوں کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مشہور عالم دین مولانا ابواللیث ندوی کا خاکہ بے حد اہم ہے۔ واضح رہے کہ مولانا نہ صرف یہ کہ عمیر صاحب کے ہم وطن تھے بلکہ انھوں نے ان سے فیض بھی حاصل کیا تھا۔ وہ مولانا کے قرآنی مقالات کو کتابی شکل میں جمع کر کے شائع کر چکے ہیں۔ مولانا کے حوالے سے انھوں نے اپنی بچپن کی یادوں کو بڑے جذباتی انداز میں سمیٹا ہے۔ کتاب میں قلم کا سپاہی بیباک صحافی حفیظ نعمانی کا بھی خاکہ شامل ہے۔ واضح رہے کہ عمیر صاحب کے حوالے سے مجھے بھی ان سے ملنے کا کئی بار موقع ملا۔ آشنا چہرے (حفیظ نعمانی کے خاکوں کا مجموعہ) کی ترتیب کے دوران مجھے ان کی بیشتر تحریروں کو بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر عمیر کے ساتھ جب بھی ان کے گھر جانے کا موقع ملتا تو علمی وادبی اور ملک کے سیاسی حالات پر گھنٹوں باتیں سننے کو ملتی تھیں جس سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ کتاب میں ان کا خاکہ پڑھ کر بیتے ہوئے دنوں کی یادیں تازہ ہو گئیں۔

مندرجات کی فہرست میں ایک نام خواجہ یونس کا بھی ہے، جنھیں میں تقریباً دو دہائیوں سے جانتا ہوں۔ دراصل کئی برسوں تک میں ارم ماڈل اسکول کا طالب علم رہا ہوں۔ تعلیم کے دوران کئی دفعہ انھیں سننے کا بھی موقع ملا۔ خاکہ پڑھ کر علم دوستی کے علاوہ ان کی دیگر کئی اہم خوبیاں بھی مجھ پر روشن ہوئیں۔ مذکورہ شخصیات کے علاوہ چودھری شرف الدین، قاری قربان احمد، ضیا احمد فاروقی، مشتاق اعظمی، سلیم شیرازی اور ابراہیم افسر کے خاکے بھی اپنی کیفیت اور کمیت میں خوب ہیں۔ اختصار نے ان خاکوں میں جامعیت پیدا کر دی ہے اور یہی ان خاکوں کا اصل حسن ہے۔ یہ خاکے زبان وبیان کے دلکش امتزاج سے بھی مملو ہیں۔ کمیت الفاظ کے سہارے جزئیات کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا وہ متحرک ہوں۔ ڈاکٹر عمیر کی خاکہ نگاری کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ بیشتر خاکوں میں ذیلی عناوین کے ذریعے خاکے کے مرکزی کردار اور اس کی کسی نہ کسی خوبی کو نشان زد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ قاری کی تشویق میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ ایمائیت کی تمازت سے بھرپور خاکہ تخلیقی نثر کی ایک خاص دلچسپ صنف ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر کی یہ کتاب قارئین کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

فکشن

چاندنی کے اندھیرے

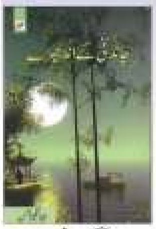

شاعر: جہانگیر انس

صفحات: 160، قیمت: 250 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: اسعد اللہ، ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'چاندی کے اندھیرے' مجیب الرحمٰن المعروف جہانگیر انس کے لکھے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل 36 افسانے شامل کیے گئے ہیں اور اہم بات یہ کہ یہ افسانے ملک کے مؤقر ادبی جرائد و ماہناموں میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ جہانگیر انس ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار کی حیثیت سے خود کو منوا چکے ہیں انھیں لکھنے لکھانے سے شغف رہا ہے ہر موضوع پر لکھنا نہیں چاہتے لیکن جب لکھتے ہیں تو ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ موضوع کا حق ادا کر دیا جائے ورنہ خاموشی کو غنیمت جاننا ان کا شیوہ رہا ہے۔ ان کے افسانوں کی بابت ڈاکٹر قطب الدین اشرف کا یہ اقتباس حقیقت پر مبنی ہے وہ لکھتے ہیں 'ان کے کئی افسانے ظلم و ستم، سماجی جبر و نابرابری، بے بسی و لاچاری کی تصویروں سے آراستہ ہیں۔ غریب اور کمزور سے کوئی خطا سرزد ہوتی ہے تو گاؤں، سماج کے بڑے لوگ ان کی آبرو سے کھیل جاتے اور انسانیت سوز سزائیں دیتے ہیں، یہ امیر اور رئیس لوگ غریب کے گھر بار اور اس کی عزت و ناموس کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں، غرض سماجی ناانصافی، عدم مساوات اور فنا ہوتی انسانی قدروں کے خلاف وہ اپنے انداز سے احتجاج درج کرتے ہیں اور بحیثیت انسان اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل افسانہ 'اجنبی' ہمارے اپنوں کے ہم سے بے پراوئی کرنے اور اعراض برتنے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کس طرح سے ایک انسان جنھیں وہ خود سے عزیز سمجھتا ہے اور ان کی خاطر گرمی، ٹھنڈی، برسات اور اپنی بیماری یا مصیبت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک اجنبی شہر میں روزی روٹی کی تلاش کرتا ہے اور معاش کے لیے وہ اپنے کو ہلکان کر دیتا ہے لیکن جب وہ اپنے گھر پہنچتا تو گھر والوں کی سرد مہری دیکھ کر اس کا کرب جاگ اٹھتا ہے اور وہ اندر اندر سے گھل رہا ہوتا ہے لیکن اس کی شکایت بھی وہ کسی سے نہیں کر سکتا ہے مبادا ایسا نہ ہو کہ اس کی بدنامی ہو، افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے 'تین چار دن گھر رہ کر ہی اسے شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اپنوں میں رہ کر بھی وہ اجنبی ہے، گڈو اس کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اس سے دور ہے اور رجنی؟ رجنی اگر اپنی ہوتی تو اس کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتی؟ اپنا گھر بھی اسے اجنبی لگا، جس گھر کو بنانے اور جن لوگوں کو سنوارنے میں اس نے اپنی زندگی کے قیمتی سال بتائے تھے وہ گھر اور وہ لوگ اس کے لیے اجنبی تھے، نئے سماج اور نئی قدروں نے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس سے کسی کو لگاؤ نہیں، سب اس کی کمائی سے پیار کرتے ہیں'۔ افسانہ 'ادھوری تصویر' میں ایک آرٹسٹ اپنے فن کے مظاہرہ کے لیے بیتاب ہوتا ہے لیکن جس کی وہ تصویر ہے سماج نے اس سے منھ موڑ لیا ہے جاوید جو کہ اس کہانی کا ہیرو ہے تصویری مقابلے میں اول انعام حاصل کرنے کے بعد جیسے ہی مدد کے لیے اس کے گھر کا راستہ لیتا ہے انتقال کی خبر سنتے ہی ایک لاکھ انعامی رقم کا چیک پھاڑ کر ہوا میں اچھال دیتا ہے اسی کے ساتھ یہ افسانہ قاری کو سوچ کی دنیا میں گم کر دیتا ہے کہ جاوید نے ایسا کیوں کیا۔ 'دبی ہوئی چنگاری' میں افسانہ نگار نے سماج میں چل رہی غیر اعتمادی مقدس رشتوں میں پنپ رہی بیوفائی اور تار تار ہو رہے رشتوں کی عکاسی کی ہے جس میں انسان دل کے زخم کو نہ بیان کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی گتھی کو سلجھا سکتا ہے نتیجے کے طور وہ مجرد زندگی کو شادی شدہ زندگی پر ترجیح دینے لگتا ہے عامر کے کردار میں اس طرح کے بہت سے مسائل موجودہ معاشرے کے ارباب و حل عقد کو چیلنج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کی تلافی ضروری ہے، یہ افسانہ میری سمجھ سے موجودہ سماجی مسائل کا المیہ ہے۔

اس کے علاوہ افسانہ نقش فریادی، گناہوں کا داغ، حسن پرست، دفتری آداب، زندہ کہانی، حسن اتفاق، اپنا خون، ادھوری داستان، طلسم مخفی، خوشی کا بوجھ، بڑا مجرم، دلال، مگر مچھ کے آنسو، اور اتفاق کے مطالعے سے زندگی اور اس کی کشمکش، سماج اور اس کی حقیقت، انسانی سوچ اور اس کی داستان، جبر اور کدورت، توبہ اور اس کی ضرورت کی داستان سرائی کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے کہیں کہیں انتہائی چابکدستی سے افسانے کا پلاٹ بنتے ہوئے انسانی نفسیات میں چل رہی اتھل پتھل کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پرو دیا ہے اگر دھیان سے بین السطور میں پوشیدہ باتوں کی طرف قاری ذہن لے جائے تو بہت کچھ طشت ازبام ہو جاتا ہے۔ ایک مثال دیتا ہوں جہانگیر انس نے افسانہ 'زندگی کے بوجھ' میں ایک ایسے سماج کا نقشہ کھینچا ہے جہاں اس افسانے کے کردار کو زندگی اور رشتہ عزیز ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ اپنی بساط بھر کوشش کرتا ہے، دولت سے محروم ہونے کے سبب اس کے حصول کے لیے وہ جی جان سے کوشش کرتا ہے، کامیاب بھی ہوتا ہے لیکن اچانک اسے شالنی سے دھوکا ملتا ہے اور وہ اپنی بہن جس کے آرام و آسائش اور اس کی شادی دھوم سے کرنے کے خواب دیکھ رہا ہوتا لیکن کوئی بھی خواب اس کا پورا نہیں ہوتا ہے اور دل کی تباہی کا سبب شراب کی بوتلوں سے ماند کرنے کی کوشش میں ایک دن وہ زہر کے جام سے اپنی زندگی تمام کر دینا چاہتا ہے لیکن پھر اسے اگلا دن کے حوالے کر دیتا ہے۔ اگر قاری غور کرے تو نہ جانے کتنے ایسے کیس ہمارے معاشرے میں موجود ہیں لیکن حل کسی کے پاس نہیں، یہ افسانہ نگار کا کمال ہے اس نے اپنے کردار کو مرنے نہیں دیا کیونکہ زندگی کی خوبصورتی تکلیفوں کو برداشت کرنے اور اس کو جینے میں ہے۔ مجھے امید ہے یہ مجموعہ اہل ادب اور افسانے کے باذوق قارئین کو ضرور پسند آئے گا اور مطالعے کے بعد افسانہ نگار کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ افسانہ نگار چونکہ منجھے ہوئے بزرگ قلم کار ہیں اور اس میں ان کی زندگی کے تجربات و حوادث بھی شامل ہیں اس لیے یہ مجموعہ بھی تپ کر کندن بنا ہے۔

شاعری

اداس موسم (شعری مجموعہ)

شاعر: انور آفاقی

صفحات: 160، قیمت: 320 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر جسیم الدین، مترجم، حکومت بہار، پٹنہ

کتاب 'اداس موسم' دربھنگہ، بہار کے سینئر شاعر و تحقیق کار انور آفاقی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، اس سے قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ 'لمسوں کی خوشبو' کے علاوہ دیرینہ

خواب کی تعبیر (سفرنامہ) پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے گفتگو (انٹرویو) نئی راہ نئی روشنی (افسانوی مجموعہ) دوبدو (ادبی مکالمہ) اور میزان فکروفن (مجموعۂ مضامین) جیسی کتابیں منظر عام پر آ کر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

'اداس موسم' بنیادی طور پر چار حصوں میں منقسم ہے:

پہلا حصہ غزلیات پر مبنی ہے۔

دوسرا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ قطعات کا احاطہ کرتا ہے اور چوتھے حصے میں متفرق اشعار ہیں۔

کتاب کی ابتدا آپ نے 'اپنی بات' سے کی ہے، پھر حمد باری تعالیٰ اور نعت نبی کو فوقیت دی ہے۔ پھر غزلیہ شاعری کو جگہ دی ہے۔ آپ کی شاعری کے حوالے سے معتبر ناقد و تخلیق کار حقانی القاسمی نے کہا ہے: 'انور آفاقی کا مشاہداتی اور محسوساتی رقبہ بہت وسیع ہے کہ وہ ایک ہی منظر، موسم، مقام اور ماحول میں مقید نہیں ہیں، متنوع لسانی اور ثقافتی مناظر و مظاہر سے ان کی سماعت و بصارت کا رشتہ رہا ہے، الگ الگ مزاج اور رویوں کے افراد و اماکن سے رابطوں نے بھی ان کی ادراکی دنیا کو وسعت عطا کی ہے'۔ اداس موسم میں شامل کلام کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انور آفاقی کی شاعری میں انسانی معاشرے کے آلام و مسائل، جبر و استبداد اور درد و کرب کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ جیسا کہ یہ اشعار۔

ایک کے مرتے ہی مرجاتا ہے کنبہ سارا   ایک ہی فرد ہو جب گھر میں کمانے والا
اپنی پلکوں پہ بٹھا کر مجھے رکھو ورنہ   اک مسافر ہوں گیا پھر نہیں آنے والا

انور آفاقی کی شاعری میں سادگی کے ساتھ تنوع بھی ہے، ان کی شاعری جہاں انسانی معاشرے کے کرب و آلام کی ترجمانی کرتی ہے، وہیں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ نسل نو کو آگے بڑھنے کی تلقین کرتی ہے، جیسے کہ۔

جو بھی کرنا ہے کرو آج ہی ورنہ یارو   جو گزر جاتا ہے پل وہ نہیں آنے والا
وقت کے ساتھ چلو وقت کو سمجھو انور   جو گیا وقت، نہیں لوٹ کے آنے والا

آفاقی کی شاعری میں کرب و آلام کے ساتھ حب الوطنی کی بھی بھرپور ترجمانی ہے، کیوں کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ وطن سے دور گذرا ہے، وطن سے دوری کا درد و کسک ان کی شاعری میں عیاں ہے۔

اسی مٹی سے رشتہ ہے پرانا   مرے اجداد کی مٹی یہی ہے

ان کے شعری اظہار کا حسن ان کی سادگی میں مخفی ہے، وہ انتہائی سادگی سے بہت معنیٰ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔

انور آفاقی کی شعری کائنات ہماری ہمہ جہت زندگی کی ترجمان ہے، معاشرے کے افراد جہاں جہاں محوِ سفر ہوتے ہیں، آفاقی کی شاعری ان کا تعاقب کرتی ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری ہو یا نظمیہ، وہ اپنی شاعری سے معاشرے کو مثبت اور صالح پیغام دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

عجب سکوت ہے چھایا عجب گھٹا آئی   گھٹن ہے چاروں طرف، کیسی یہ ہوا آئی
پرندے شاخوں پہ اب کیوں نظر نہیں آتے   کہاں سے زہر میں ڈوبی ہوئی گھٹا آئی

انور آفاقی کی شاعری میں مسموم فضا میں سانس لینے والوں کے لیے خوشگوار فضا کی بحالی کی امید بھی نظر آتی ہے، وہ اپنی شاعری کے ذریعے یاس و قنوط کے حصار سے آج نہیں تو کل نکلنے کا امید افزا پیغام بھی دے رہے ہیں۔

افکار نادر

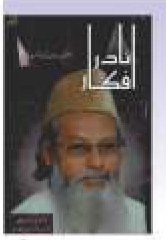

مصنف: ڈاکٹر نادر المسدوسی

پبلشر: المسدوسی پبلی کیشنز، مغل پورہ، حیدرآباد

مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی

E-167، فورتھ فلور، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر نادر المسدوسی نے 'افکار نادر' کے ذریعے اپنے خیالات و احساسات کو بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے شعرگوئی کے ذریعے اپنی بات اور جذبات کو جس حسن خوبی کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، کیونکہ ہر قابل اور ذی شعور انسان کے پاس خیالات اور احساسات ہوتے ہیں، لیکن ہر کوئی اپنے خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرے یہ ضروری نہیں ہے، لیکن ڈاکٹر نادر المسدوسی میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ موضوع کے لحاظ سے شاعری اور نثر دونوں میں ہلکے اور گہرے رنگ ہوتے ہیں۔ نثر کو اوقاف کی سیڑھیوں کی ضرورت ہے۔ شاعری انھیں پھلانگ سکتی ہے۔

بقول غالب۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا   ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر نادر المسدوسی نے 'افکار نادر' کے ذریعے اپنی بات کہنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا ہے۔

صاحب کتاب ڈاکٹر نادر المسدوسی محتاج تعارف نہیں ہیں، اس سے پہلے بھی ان کی کئی کتابیں مثلاً 'تفہیم الایمان'، 'عکس محبوب'، 'فکر و آگہی' اور 'گلدستہ حیات' وغیرہ منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ وہ رپورتاژ اور خاکہ نگار، تبصرہ نگار اور مضمون نگار بھی ہیں۔ انھوں نے شاعری کی دنیا میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے اور اپنا الگ مقام بنایا ہے۔

ڈاکٹر نادر المسدوسی مختلف اوصاف و صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ ایک اچھے اور معتبر شاعر ہیں، جو شعری پیرائے میں اپنے تصورات و خیالات کا خوش اسلوبی سے اظہار کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'افکار نادر' ان کے شعری مزاج کے ترجمان ہیں۔ اس کے علاوہ صاحب کتاب اور کتاب کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے واحد نظام آبادی 'افکار نادر کے نادر افکار' نامی مضمون میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نادر المسدوسی ایسے فنکار ہیں جن کا تعبیر و اظہار کی صلاحیت و استعداد اور قابلیت کی خوبی اور خوش اسلوبی سے پائی جاتی ہے۔''

اس کے علاوہ واحد نظام آبادی شعری مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''افکار نادر، شعری مجموعہ، عام شعری مجموعوں کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ شعری مجموعہ مختلف اصناف سخن کا مجموعہ ہے۔''

زیر تبصرہ 'افکار نادر' میں حمد، نعت، مناجات، غزلیات، تہنیتی و تعزیتی قطعات اور متفرق قطعات کے علاوہ مذہبی کلام بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر نادر المسدوسی کی غزلوں میں کافی وسعت ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں مختلف مضامین ملتے ہیں۔ عصری حسیت، جدید رنگ، سہل ممتنع اور مذہبی و اصلاحی افکار وغیرہ خصوصیات سے ملتی ہیں۔ غزل میں لب و رخسار اور گیسوؤں کے پیچ و خم کا ذکر نہ ہو تو شاید تشنگی رہ جاتی ہے۔ کتاب میں شامل غزل ملاحظہ کیجیے۔

رخ جو چمکا تو یوں لگا جیسے   چاندنی میں نکھر رہی ہے رات
ان کی زلفوں کے سائے میں اکثر   دھیمے دھیمے گزر رہی ہے رات

غزلوں میں کتنی گہرائی وگیرائی ہوتی ہے اس کا اندازہ ان کے اس قطعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

غواص جانتا ہے کہ موجوں کے درمیاں   ازابتدا تاانتہا کتنا ہے فاصلہ
نادر کی شاعری بھی سمندر سے کم نہیں   غوطہ زنوں سے پوچھیے کیا کیا نہیں ملا

انھوں نے 'افکار نادر' کے کلام سے کس حد تک لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے، اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

ترقی دیکھ کر اوروں کی حد سے مت نکل جاؤ
غرور اور فتنے کی آتش میں تم ہرگز نہ جل جاؤ

نظرعقبیٰ پہ تم رکھنا، وہاں ہے دائمی آرام
رہو تم دور دنیا سے نہ لذت سے بہل جاؤ
گناہوں میں جو گزری توبہ کرکے پاک ہوجاؤ
یہ موقع ہے سنبھلنے کا خدارا اب سنبھل جاؤ

184 صفحات پر مشتمل کتاب 'افکار نادر' کی ادبی دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اسے شرف قبولیت بھی حاصل ہوگی۔ یہ کتاب تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

ادب اطفال

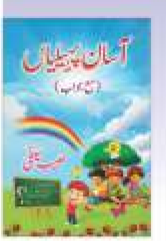

آسان پہیلیاں (مع جواب)

مصنف: حبیب سیفی

صفحات: 112، قیمت: 150 روپے

پتہ: فرسٹ فلور E12/51B حوض رانی، مالویہ نگر نئی دہلی۔ 17

مبصر: ڈاکٹر ذکی طارق، 564 کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک، غازی آباد۔ 201009 یوپی

حبیب سیفی کی تخلیقی فسوں طرازی اور تخیل کی جادوگری سے کوئی صاحبِ ہوش اور اردو زبان وادب کا شعور رکھنے والا انکار نہیں کرسکتا۔ یقیناً ادبِ اطفال کے اس جنونی نے سائنسی ادبِ اطفال اور ادب کی دوسری اصناف پر اپنے تین دہائیوں سے زیادہ کے ادبی سفر میں جو نقوش ثبت کیے ہیں وہ دور تک اور دیر تک پہچانے جائیں گے۔

مذکورہ کتاب سے پہلے حبیب سیفی کی بچوں کے متعلق کئی سو نظمیں بچوں کے لیے شاعری کی نظموں کے پانچ شعری مجموعوں، 1 درخشندہ ستارے، 2 بچے ہندوستانی، 3 مستقبل کے چاند ستارے، 4 امیدوں کے پھول اور 5 روشن ستارے کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہیں۔ غزلیات کے 2 مجموعے دیدہ ور اور متاع خواب، نثری 3 کتابیں شوکت پردیسی فکروفن کے آئینے میں، 'رموز ادب حصہ اوّل وحصہ دوم، اور 'بچوں کے ادب میں سائنس کی عکاسی' ادب اطفال پر ان کا ضخیم تحقیقی مقالہ الگ ہے۔

جیسا کہ اہل ادب جانتے ہیں منظوم پہیلیاں صرف جذبات کا اظہار نہیں بلکہ ایک مکمل فن ہے اور شاعری کی دیگر اصناف کی طرح ایک قدیم صنف ہے جس کے اصولوں کو سمجھے بغیر پہیلیاں کہنا آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف بیشتر شعرائے کرام کی عدم توجہ کا شکار رہی، حضرت امیر خسرو پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس کی جانب توجہ کی اور اس صنف کے موجد کہلائے۔ مختلف موضوعات کو انھوں نے پہیلی کی شکل میں منظوم کرکے عوام کے لیے اس صنف کو دلچسپی کا موجب بنادیا۔ محققین نے ان کی اس کاوش کا جب گہرائی سے مطالعہ کیا تو بہت سی پہیلیوں کو مشتبہ بھی قرار دیا لیکن اولیت کا سہرا امیر خسرو کے ہی سر رہا، کیونکہ محققین ان سے قبل کسی ایسے شاعر کو تلاش کرنے میں ناکام رہے جس نے اس صنف میں کوئی ایک پہیلی بھی کہی ہو۔ حضرت امیر خسرو کے بعد تقریباً چار صدی گزر جانے پر شیخ چاند نے قصیدہ کے معروف شاعر مرزا محمد رفیع سودا کے یہاں 199 پہیلیاں تلاش کر اہل ادب کو متوجہ کیا، جن کے ذریعے اس عہد کی تہذیب، تمدن، اور سماجی ارتقا کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اسی دور میں انشاء اللہ خاں انشا، سعادت یار خاں رنگیں، بہادر شاہ ظفر، حکیم مومن خاں مومن کے یہاں بھی چند پہیلیوں کی جہاں نشاندہی ملتی ہے وہیں ان حضرات کے بعد منیر شکوہ آبادی اور تجمل حسین نے بھی اس صنف کی آبیاری میں حصہ لے کر ادبی افق پر اپنا نام درج کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ بیسویں صدی میں صوفی تبسم اور شان الحق حقی نے بھی سنجیدگی سے اس صنفِ لطیف پر کام کیا ہے۔ ان کے بعد دور تک خلا ہی خلا ہے جس کو پُر کرنے کی جناب 'حبیب سیفی' نے قابل ستائش کوشش کی ہے۔

حبیب سیفی نے پیش لفظ سے پہلے چار سطروں کی وضاحت ان پہیلیوں کے بارے میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اپنی اس کتاب کے متعلق ایک بات بتادینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں، اور وہ بات یہ ہے کہ آسان پہیلیاں (مع جواب) قومی پالیسی برائے تعلیم سال 2020 سے متفق ہوکر لکھی گئی ہے۔ مجھے علم ہے کہ تعلیم کا فکری محور تبدیل ہوچکا ہے، اسی لیے جو حالات حاضرہ کا تقاضہ ہے اسے نبھانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

کتاب کی فہرست میں، پہلا حصہ: مذہبیات صفحہ 18 تا 28، دوسرا حصہ: علم وفن، ٹیکنالوجی صفحہ 29 تا 37، تیسرا حصہ: صحت وغذا صفحہ 38 تا 46، چوتھا حصہ: پھل وسبزیاں صفحہ 47 تا 56، پانچواں حصہ: مسالہ، میوہ صفحہ 57 تا 63، چھٹا حصہ: استعمال کی چیزیں صفحہ 64 تا 76، ساتواں حصہ: دیش، شہید وطن ورہنما صفحہ 77 تا 85، آٹھواں حصہ: جانور وپرندے صفحہ 86 تا 93، نواں حصہ: درخت، پیشہ واشیا 94 تا 100، دسواں حصہ: عام پہیلیاں صفحہ 101 تا 105، مصنف کا حال واحوال 106 تا 112۔

موجودہ عہد سوشل میڈیا کا عہد ہے، بچے کتابوں سے دور ہوتے جارہے ہیں، ذہنوں میں کسی بھی سوال کے جواب دینے کی فکر کس طرح پیدا ہوسکتی ہے، تجسس کا مادہ کہاں سے پیدا ہوگا، جب سوالات کے جواب موبائل کے ذریعے گوگل سے تلاشے جائیں گے، ایسے میں حبیب سیفی کی فکرمندی اہم ہی نہیں قابل تحسین ہے کہ انھوں نے ایک قدیم صنف کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنی تخلیق 'آسان پہیلیاں' (مع جواب) کے ذریعے ایک فرض کفایہ بھی ادا کردیا ہے۔

■

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان ولسانیات، سائنس وٹکنالوجی، طب وفلسفہ، فنون لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطور خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد وشمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

اودھ نامہ
avadhnama

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دہلی

ساہتیہ اُتسو 2025

نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام ایشیا کے سب سے بڑے ادبی میلے کا باقاعدہ افتتاح حکومت ہند کے ثقافت اور سیاحت کے وزیر گجیندر شیخاوت نے

کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ادب سب سے مضبوط دھاگہ ہے جو ہندوستان کو باہم جوڑتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے دور میں ہمارا ادب ترجمے کے ذریعے عالمی سطح پر مقبول ہونے لگا ہے۔ اب ہندوستان کے بارے میں پوری دنیا کا نظریہ بدل گیا ہے۔ ثقافت کی وزارت کے جوائنٹ سکریٹری امیتا پرساد سارا بھائی بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ اس سے قبل گجیندر سنگھ شیخاوت نے فیتہ کاٹ کر اور شمع روشن کرکے ساہتیہ اکیڈمی نمائش 2024 کا افتتاح کیا۔ اس سالانہ نمائش میں گزشتہ سال کی کامیابیوں کو تصاویر اور مضامین کی تفصیل کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے صدر مادھوکوشک نے وزیر کا استقبال کیا۔ اپنے خیر مقدمی بیان میں سکریٹری کے سری نواس نے گزشتہ سال اکیڈمی کی کامیابیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکیڈمی نے گزشتہ سال 484 کتابیں شائع کیں اور 459 پروگرام منعقد کیے۔ آج ادبی میلے کے پہلے روز 100 سے زائد ادیبوں نے 20 مختلف پروگراموں میں شرکت کی۔ کچھ اہم پروگرام قبائلی شاعری اور کہانی پڑھنا اور پینل ڈسکشن تھے۔ ہندوستانی ادب، ہندوستان کے شمال مشرقی خطے کی لوک ثقافت، ہندوستان کے ادبی کاموں میں دیہی سماج کا غائب ہونا وغیرہ جیسے موضوعات پر رسمی بیانات بھی دیے گئے۔ کئی نشستوں میں کثیر لسانی شاعری اور کہانیاں پڑھی گئیں۔

ساہتیہ اُتسو 2025 کے تیسرے روز 22 سیشنز میں منعقد کیے گئے مختلف پروگراموں میں ایوارڈ یافتگان کے ساتھ مصنفین کی بات چیت، ہندوستانی تاریخی افسانوں کی آفاقیت اور مشترکہ انسانی تجربہ، کیا ماس میڈیا ہی ادبی کاموں کو پھیلانے کا واحد ذریعہ ہے؟، عالمی ادبی منظرنامے میں ہندوستانی ادب، جدید ہندوستانی ادب میں یاترا جیسے موضوعات پر گفتگو اور کثیر لسانی شاعری اور کہانی پڑھی گئی۔ مشہور انگریزی مصنف امیتو چٹرجی نے سموتسار لیکچر پیش کیا جس کا موضوع تھا 'کچھ چیزیں قابل توجہ'۔ گزشتہ روز رائٹرز کانفرنس میں جن ادیبوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا، انھوں نے اپنا تخلیقی کام قارئین کو بتایا۔ گگن گل نے جنھیں ان کے ہندی شعری مجموعے کے لیے ایوارڈ دیا گیا، اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ شاعر کے لیے شاعری کرنا یا شاعر رہنا آسان نہیں ہے۔ آپ برسوں سے شاعری کررہے ہوں تو بھی شاعر بننے میں زندگی لگ جاتی ہے۔

ادبی میلے کے چوتھے دن مختلف ہندوستانی زبانوں کے 140 سے زائد ادبا نے 22 سے زائد پروگراموں میں حصہ لیا۔ ان پروگراموں میں پانچ کثیر لسانی شعری ملاقاتوں اور چار کہانیوں کے اجلاس کے ساتھ ساتھ اہم موضوعات پر بات چیت کی گئی جیسے کہ آزادی سے پہلے کے ہندوستانی ادب میں قوم کا تصور ہندوستانی سماج میں تبدیلیوں کی عکاسی کے طور پر تھیٹر، ثقافتی طور پر مختلف زبانوں میں ادبی کاموں کا ترجمہ کرنے میں درپیش چیلنجز۔ 'ادب اور سماجی انصاف' کی صدارت سابق چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس دیپک مشرا نے کی۔ اس بحث میں اے پی مہیشوری، منگل کمار اور اشونی کمار نے حصہ لیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں جسٹس دیپک مشرا نے کہا کہ ادب اور قانون کا گہرا رشتہ ہے۔ ادب کا سماجی انصاف سے خوشگوار، باوقار اور اثر انگیز رشتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاشرے میں انصاف کا قیام صرف عدالتوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ادب کے ذریعے معاشرے کے ہر طبقے کی آواز کو نمایاں طور پر پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ 'ہندوستانی ادبی روایات: ورثہ اور ترقی' کے عنوان سے قومی سمینار کا بھی آغاز ہوا، جس کا افتتاحی خطبہ ممتاز بنگالی اسکالر اور مترجم سوکانت چودھری نے کیا اور کلیدی خطبہ ممتاز انگریزی مصنف مکرند نے دیا۔ ابتدا میں اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں، قدیم ادب کے تنوع سے لے کر 20 ویں صدی میں دلت اور خواتین کی تحریر کے عروج تک ہندوستانی ادب کے ارتقا اور اس کی نئی شکلوں میں جدید توسیع اور ترجمہ کے اثرات پر روشنی ڈالی۔ اکیڈمی کے صدر مادھوکوشک نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہندوستانی ادب ہمدردی اور انسانیت پر مبنی ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں زبانی روایات کے مسلسل اثر کو تسلیم کیا اور خواندگی سے آگے ادب کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ثقافتی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر آج داستان مہابھارت فوزیہ داستان گو اور رتیش یادو نے پیش کی۔

ساہتیہ کے آخری روز گوا کے گورنر پی ایس سریدھرن پلئی نے ساہتیہ اُتسو 2025 میں منعقدہ ایک سمپوزیم کی صدارت کی۔ سمینار کا عنوان تھا 'ادب اور فن کی دیگر شکلوں کے درمیان مشترکہ زمین' اس سیشن کے دیگر مقررین میں معروف مصور جتن داس، معروف کلر ڈائریکٹر ایم کے رائنا، ایڈیشنل سکریٹری، وزارت

ثقافت رنجنا چوپڑا، آرٹ انٹرپرینیور نجیے کے رائے اور سماجی اور ثقافتی کارکن اور مصنف سندیپ بھٹودیا تھے۔ آخر میں گوا کے گورنر پی ایس سریدھرن پلئی نے کہا کہ ایک مصنف عام لوگوں کے لیے لکھتا ہے نہ کہ حکمراں یا حکومت کو خوش کرنے کے لیے۔ انھوں نے کہا کہ تخلیقی کام کا حقیقی جج عام قاری ہوتا ہے، خواہ وہ ادبی ہو، بصری، اظہار خیال یا فن کی کوئی اور شکل۔ ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے گوا کے گورنر کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13، 11، 10، 8 مارچ 2025

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کالج میں 'محفل قوالی'

نئی دہلی: ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کالج دہلی یونیورسٹی اور اردو اکادمی دہلی کے زیر اشتراک 25 مارچ کو 'محفل

قوالی' کا انعقاد کالج کے آڈیٹوریم میں پروفیسر سدانند پرساد پرنسپل کالج کے زیر سرپرستی کیا گیا جس میں بین الاقوامی شہرت یافتہ قوال فنکار نظامی برادرس نے بہترین آواز اور ساز سے ایسا سماں باندھا کہ سامعین جھوم اٹھے۔ نظامت کے فرائض محترمہ ریشما نے انجام دیے۔ انھوں نے مہمانوں کا تعارف کرایا اور قوالی کی روایت پر روشنی ڈالی۔ آخر میں شعبہ اردو کے ٹیچر ان چارج اور استاد ڈاکٹر نازیہ نے مہمانان گرامی، اساتذہ، طلبا، ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ اسٹاف اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام میں کالج کے اساتذہ اور معزز شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

رپورٹ: ڈاکٹر نازیہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کالج، دہلی یونیورسٹی، 25 مارچ 2025

کنور مہندر سنگھ بیدی کی یوم پیدائش پر مشاعرہ

نئی دہلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی کے کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کی جانب سے 10 مارچ کو کنور مہندر سنگھ بیدی کے 116 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر بیدی صاحب کے شاگرد مشہور شاعر سیف سحری کے اعزاز

میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ بیدی صاحب پنجاب کے منٹگمری میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب گورونانک جی سے ملتا ہے۔ ان کا شاعری میں بھی بلند مقام ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ نارنگ ساقی صاحب کی اردو والوں سے گہری وابستگی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے وہ بانی و جنرل سکریٹری ہیں، وہ بیدی صاحب کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، بیدی صاحب کی کتابیں چھپواتے رہتے ہیں، ان کی یاد میں مشاعرے اور سمینار کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں نیویارک سے تشریف لائے ڈاکٹر یوگیندر اپادھیائے نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور ایک نظم پیش کی۔ اس موقعے پر کنور مہندر سنگھ بیدی کے صاحب زادے جناب وریندر سنگھ بیدی نے ٹرسٹ کی جانب سے سیف سحری کو ستائیس ہزار نو سو روپے کا چیک پیش کیا۔ متین امروہوی نے اپنی مشہور نظم قلمی چہرہ کے ذریعے بیدی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 مارچ 2025

اترپردیش

مشاعرہ، تقریب و تقسیم ایوارڈ

کرنجوت بازار: کرنجوت بازار ضلع سنت کبیر نگر

اتر پردیش کی ایک علمی و ادبی بستی ہے۔ جہاں بے شمار اہل علم گزرے ہیں۔ اسی علمی بستی کی ایک علمی و ادبی تنظیم 'بزم نوید جاں فزا' کے زیر اہتمام تین اپریل کو کرنجوت بازار لوہرن کے کرکٹ گراؤنڈ میں مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم اور حماد انجم ایڈووکیٹ کی یاد میں پہلے آل انڈیا نعتیہ مشاعرے اور تقسیم ایوارڈ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔

مشاعرے سے قبل کرنجوت بازار کی ایک علمی، ادبی، صحافتی، طبی، سماجی و سیاسی شخصیت مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم اور ان کے فرزند معروف ادیب و شاعر اور وکیل جناب حماد انجم ایڈووکیٹ کے نام پر علاقے کی اہم شخصیات کو ایوارڈ تقسیم کیے گئے۔ تقریب تقسیم ایوارڈ اور مشاعرے کی صدارت اس علاقے کی ایک سرکردہ علمی و ادبی شخصیت اور معروف شاعر و ادیب اور جامعہ اسلامیہ دریاباد کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا عتیق الرحمٰن المعروف بہ عتیق اثر ندوی نے کی۔ مشاعرے کے کنوینر بزم نوید جاں فزا کے سربراہ مولانا اشرف حسن عارفی تھے۔

پہلی بار مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کے نام پر شروع کیا جانے والا یہ ایوارڈ جن شخصیات کو دیا گیا ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ مولانا عتیق اثر ندوی (مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم ایوارڈ برائے جملہ خدمات)، مولانا انجم صاحب کے فرزند، معروف صحافی اور وائس آف امریکہ کے نمائندہ جناب سہیل انجم (ایوارڈ برائے ادب و صحافت) مولانا انجم صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند اور صدر شعبہ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں (ایوارڈ برائے تحقیق و ترجمہ نگاری)، معروف نعت خواں جناب عبد السلام انجمی نیپالی (ایوارڈ برائے نعت خوانی)، مولانا محمد جعفر مدنی (ایوارڈ برائے فقہ و فتاویٰ) اور ڈاکٹر انور علی (ایوارڈ برائے طبی خدمات)۔

حماد انجم کے نام پر شروع کیا جانے والا ایوارڈ جن شخصیات کو دیا گیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

معروف شاعر جناب جمال قدوسی (حماد انجم ایڈووکیٹ ایوارڈ برائے شاعری)، ابرق ساجدی، کاشف شکیل، اور اسد بستوی (ایوارڈ برائے شاعری)۔ واضح رہے کہ حماد انجم ایڈووکیٹ کا 2025 میں انتقال ہو چکا ہے۔ ان شخصیات کے علاوہ ایک درجن سے زائد شعرا کو مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شمس کمال انجم کی دو کتابوں حماد انجم ایڈووکیٹ: شخص اور شاعر اور انتخاب کلام حماد انجم کا اجرا عمل میں آیا۔

مولانا عتیق اثر ندوی نے اپنے صدارتی کلمات میں مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کی علمی و ادبی خدمات کو یاد کیا اور کہا کہ بزم نوید جاں فزا نے ان کی اور حماد انجم کی یاد میں پہلے نعتیہ مشاعرے کے انعقاد اور ان دونوں کے نام پر ایوارڈ تقسیم کرنے کی جو بزم سجائی ہے اس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ معروف صحافی سہیل انجم نے تاثراتی کلمات میں کہا کہ مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم نے زندگی بھر علم وادب کی آبیاری کی اور لوگوں میں شعری و ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے مشاعرے کی نظامت کی۔

سہیل انجم، دہلی، 7 اپریل 2025

بہار

نئی ٹکنالوجی کو اُردو والے نہیں اپنائیں گے تو پیچھے رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر شمس اقبال

گیا: جن سنسکرتی منچ، گیا ضلع اکائی کے بینر تلے قومی

کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر جناب شمس اقبال کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا انعقاد فکشن ہاؤس، پولس لائن، گیوال بیگہ میں کیا گیا۔ جس کی صدارت مناظر حسن شاہین اور نظامت احمد صغیر نے کی۔ احمد صغیر نے ڈاکٹر شمس اقبال کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ شمس اقبال اس شخصیت کا نام ہے جو ہمیشہ فعال رہے۔ جب وہ نیشنل بک ٹرسٹ میں رہے اس وقت بھی فعال رہے، جب قومی کونسل میں پی پی او رہے تب بھی فعال رہے اور اب جب وہ قومی کونسل کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے ہیں تب بھی فعال اور متحرک ہیں۔ انھیں کام کرنے کا جنون ہے اور کام کیسے کیا جاتا ہے وہ خوب جانتے ہیں اور کام کرکے دکھاتے ہیں، انھوں نے گزشتہ ایک سال میں جو کام کیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر عبدالحیٔ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں شمس اقبال کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں قومی کونسل میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور وہ پی پی او تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے عہدے کا رعب نہیں دکھایا۔ ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آئے اب جبکہ وہ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اور جس طرح کام کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ آخر میں ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ میں صرف یہاں گیا کے ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کی غرض سے آیا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ احمد صغیر نے یہ نشست منعقد کی۔ انھوں نے آگے کہا کہ میں اس طرح کام نہیں کرنا چاہتا جس طرح دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ میں ہمیشہ کچھ نیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور گزشتہ ایک سال میں جس طرح کے پروگرام میں نے کیے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا سب سے مشکل کام ہے لیکن میں نے ورک شاپ کرا کے 32 کتابیں لکھوائیں جو جلد ہی شائع ہونے والی ہیں۔ مصنوعی ذہانت پر بھی میں ایک پروگرام کرنے والا ہوں۔ دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ نئی نئی ٹکنالوجی سامنے آرہی ہے۔ ڈیجیٹل دنیا کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس میں ہمارے اُردو کے ادبا و شعرا کہاں کھڑے ہیں اور اس ٹکنالوجی کو کس طرح اپنا رہے ہیں یہ سوچنے کا مقام ہے۔ اگر اس نئی تبدیلی سے ہم روبرو نہیں ہوئے تو یقیناً پیچھے رہ جائیں گے۔ اس موقعے پر احمد صغیر کی نئی کتاب 'یہ کہانی نہیں ہے' اور ایم ایس راہی کی کتاب 'کالندی' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ احمد صغیر کے شکریے کے ساتھ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

رپورٹ: محمد یوسف عالم انصاری، گیا، 5 اپریل 2025

تلنگانہ

اردو میں سوانحی ادب 1980 کے بعد

حیدرآباد: مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شعبۂ اردو کی جانب سے دو روزہ قومی سمینار 'اردو میں سوانحی ادب 1980 کے بعد' افتتاحی اجلاس CPDUMT آڈیٹوریم میں شروع ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمس الہدیٰ صدر شعبۂ اردو مانو نے شرکا، مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈائرکٹر سمینار نے کہا کہ سوانحی ادب میں تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس صنف میں مزید تحقیق اور کام کی ضرورت ہے۔ کئی اصناف میں اس کے نمونوں کے نقش مل جاتے ہیں۔ اس موقعے پر بی بی رضا خاتون شعبۂ اردو نے کہا کہ سوانحی ادب کا سمینار منفرد ہے، سوانح لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، فن اور تکنیک کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین شعبۂ اردو جے این یو نے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب میں کہا کہ سوانحی ادب پر معیاری تحقیق کی ضرورت ہے، زمانہ قدیم سے اس صنف کا رواج ہے اس میں شخصی زندگی، نجی زندگی، حالات وواقعات جذبات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ قاضی حبیب سابق صدر شعبۂ اردو چنئی یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ سمینار کا موضوع وسیع ہے۔ طباعت واشاعت کی سہولت کی وجہ سے سوانحی ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ خطوط میں بہت سے سوانحی عناصر مل جاتے ہیں۔ پروفیسر اشتیاق احمد رجسٹرار مانو نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ سوانحی ادب کا موضوع بہت اہم ہے، حیاتیاتی خاکے بہت لکھے گئے، عربی فارسی انگریزی ادب میں سوانحی ادب تخلیق ہورہا ہے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ابوشہیم خاں نے انجام دیے جب کہ ڈاکٹر بدر سلطانہ نے کلمات تشکر پیش کیا۔ قومی گیت کے بعد جلسہ اختتام کو پہنچا۔ 19 فروری شام سات بجے مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔

سمینار میں ڈاکٹر محمد جاوید حمزہ، ڈاکٹر نوشاد عالم

شور، ڈاکٹر امان اللہ چشتی، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر آمنہ تحسین، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر غضنفر اقبال، ڈاکٹر منظور دکنی، ڈاکٹر احمد خاں، ڈاکٹر گل رعنا، پروفیسر عرشیہ جبین، پروفیسر مسرت جہاں، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر نشاط عمری، ڈاکٹر مصباح الانظر، نور اللہ نیاز مدنی، ڈاکٹر بدر سلطانہ، پروفیسر محمد نثار احمد، ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر جعفر جری، ڈاکٹر محمد یاسر، ڈاکٹر حمیرہ سعید، ڈاکٹر سعید الدین، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر کہکشاں لطیف، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر رئیس فاطمہ، ڈاکٹر مخدوم محی الدین، ڈاکٹر محمد نہال، ڈاکٹر ابرار الباقی، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر صابر علی سیوانی، ڈاکٹر محمد جعفر، محمد عامر انصاری، ڈاکٹر محمد اکمل، ڈاکٹر محمد کاظمی اور ڈاکٹر راغب نے اپنے مقالے پیش کیے۔ جملہ چھ تکنیکی سیشن متوازی انداز میں منعقد کیے گئے۔ مذکورہ اجلاسوں کے صدر پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر علیم اشرف جائسی، پروفیسر مسرت جہاں، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر عزیز بانو، پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر آمنہ تحسین، پروفیسر قاضی حبیب، پروفیسر ابوالکلام، ڈاکٹر محمود کاظمی وغیرہ تھے۔ نظامت کرنے والوں میں ڈاکٹر ابو شہیم خاں، ڈاکٹر بدر سلطانہ نور اللہ مدنی، محمد شبلی آزاد، محمد محتشم تنویر کوثر، حنا گلاب، ڈاکٹر محمد جابر حمزہ اور کلمات تشکر ادا کرنے والوں میں ڈاکٹر بدر سلطانہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اختتامی اجلاس میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر محمد نثار احمد نے خطاب میں کہا کہ تمام پڑھے گئے مقالے منفرد تھے۔ مہمان ذی وقار پروفیسر شاہد حسین نے کہا کہ سمینار کامیاب رہا۔ محققین محنت جستجو لگن سے تحقیق کریں۔ مہمان خصوصی پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ سوانح عمری پر سمینار بہت عمدہ ہے۔ اس طرح کے سمینار اور جگہوں پر ہونا چاہیے۔ سمینار میں طلبا و طالبات اسکالر اساتذہ کی کثیر تعداد تھی۔ پروفیسر گلفشاں حبیب ڈین مانو نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ذمہ داران مبارکباد کے قابل ہیں کہ مالی وسائل کی کمی کے باوجود سمینار کامیابی سے ہمکنار رہا۔ ڈاکٹر بی بی رضا خاتون سمینار کنوینر نے کہا کہ دو روزہ سمینار میں جتنے مقالے پڑھے گئے وہ معیاری اور معلومات سے بھر پور تھے۔ علاوہ ازیں وی سی مانو پروفیسر عین الحسن، رجسٹرار پروفیسر اشتیاق احمد ڈین اور یونیورسٹی کے تدریسی و غیر تدریسی عملے، صحافیوں طلبہ، اسکالر کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر شمس الہدیٰ صدر شعبۂ اردو نے مہمانوں، مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سمینار کی تیاری ایک مشکل مسئلہ ہے لیکن پھر بھی آسانی کے ساتھ دو دن کامیابی سے گزر گئے۔

رپورٹ: ڈاکٹر محمد ناظم علی، سابق پرنسپل، گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ واکیڈمک سنیٹ ممبر تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد، 24 مارچ 2025

راجستھان

قوم پرستی کے لیے وقف نوجوان، ترقی یافتہ ہندوستان کی وراثت: ڈاکٹر اندریش کمار

جودھپور: اللہ، خدا، رب، ایشور، واہے گرو، بھگوان

یہ سب ایک ہی مالک کے نام ہیں۔ ہمیں خود ایک اچھے دوست بن کر دوسروں کو اچھا دوست بنانا چاہیے۔ سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں اس کے بعد ہم کسی بھی ذات، مذہب، فرقے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے سینئر پرچارک، قومی اگزیکیٹیو ممبر اور مسلم راشٹریہ منچ کے سرپرست ڈاکٹر اندریش کمار نے مولانا آزاد یونیورسٹی میں منعقد 'قوم پرستی کے لیے وقف نوجوان، ترقی یافتہ ہندوستان کی وراثت' کے عنوان سے سمینار میں کلیدی مقرر کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

مسلم راشٹریہ منچ کے قومی کنوینر اور وقف بورڈ کے سابق چیئرمین ابوبکر نقوی نے ملک سے محبت کے موضوع پر کہا کہ ہم کو ملک کی ترقی کے لیے سرسید احمد خاں کے مطابق آگے بڑھنے کے لیے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں کمپیوٹر رکھنا ہوگا۔

یونیورسٹی کے چیئرپرسن محمد عتیق نے کہا کہ یونیورسٹی کا ایک ہی مقصد ہے کہ سماج میں معاشی اور تعلیمی اعتبار سے بچھڑے ہوئے طلبا کے لیے بہتر ماحول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنا اس سلسلے میں ہم یونیورسٹی کی معیاری تعلیم کے لیے سینٹر آف ایکسی لینسی کے لیے کوشاں ہیں۔

یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر جمیل کاظمی نے کہا کہ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ یہاں راجستھان کے علاوہ بھی ملک کی کئی ریاستوں کے طلبا مختلف مضامین میں ریسرچ کر رہے ہیں۔

پروگرام کے آخر میں فارمیسی ڈپارٹمنٹ کے ڈین ڈاکٹر پیوش شرما نے آنے والے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کا اختتام قومی ترانے کے ساتھ ہوا۔

رپورٹ: پی آر او، مولانا آزاد یونیورسٹی جودھ پور، 8 مارچ 2025

اعزاز و اکرام

ڈاکٹر تقی عابدی

کناڈا: ایک عظیم الشان تقریب میں ماہر انیس و دبیر، مشہور و معروف دانشور، 80 سے زیادہ کتابوں کے

مصنف، شاعر اور نقاد ڈاکٹر تقی عابدی کو کناڈا میں باوقار 'ہیز میجسٹی کنگ چارلس III تاجپوشی میڈل 2024' سے نوازا گیا ہے، یہ ایوارڈ انھیں معزز رکن پارلیمنٹ اقرا خالد نے اردو ادب کے میدان میں ان کی مسلسل اور انمول خدمات کے اعتراف میں پیش کیا۔ ملحوظ خاطر رہے، جناب تقی عابدی کناڈا کے پہلے وصول کنندہ ہیں جنھیں یہ ایوارڈ اردو ادب اور شاعری میں ان کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں

پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی کو ان کی تحقیقات، خاص طور سے لالہ چھنولال دلگیر کے تعلق سے ان کے کام اور نئے گوشوں سے اردو دنیائے ادب کو آشنا کروانے کی وجہ سے انتہائی عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ نیرنگ سرحدی میموریل بزم ادب فاؤنڈیشن کینیڈا کی جانب سے ان کو اس موقعے پر مبارکباد پیش کی گئی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر عابدی کا شمار کناڈا کے معروف ہارٹ سرجن کے طور پر ہوتا ہے اور سماجی خدمات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 مارچ 2025

پاپولر میرٹھی

نئی دھلی / میرٹھ: کناڈا اور ہندوستان کے مابین ثقافتی تبادلے کے ایک حصے کے طور پر 'ناد آرٹ سوسائٹی' کے زیر اہتمام بسنت اتسو 2025 تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں ہندوستان کے معروف مزاحیہ شاعر ڈاکٹر سید اعزاز الدین شاہ المعروف بہ پاپولر میرٹھی کو 'نادیوگی' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس شاندار

تقریب میں دنیا بھر سے فنکاروں کو مدعو کیا گیا تھا، جن میں ہندوستان سے پاپولر میرٹھی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر 'سرے فلیٹ ووڈ' کے ایم ایل اے جگروپ برار نے پاپولر میرٹھی کو توصیفی سند پیش کی اور کہا آپ کے مزاح، تخلیقی اور شاعرانہ صلاحیتوں نے اس شام کو مزید تقویت بخشی۔ فن اور ثقافت میں آپ کی شاندار کارکردگی کے لیے آپ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ۔

کناڈا کے ادبی دورے سے لوٹے پاپولر میرٹھی نے صحافی دوستوں سے اپنے تجربات شیئر کرتے ہوئے بتایا کہ کینیڈا کو دیکھنے کے بعد، مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی دوسرے ملک میں ہوں۔ وہاں ہندوستانیوں کی بڑی تعداد کی موجودگی نے مجھے اپنے پن کا احساس کرایا۔ خاص طور پر وہاں کے لوگوں میں شاعری اور کو سننے کے تئیں زبردست جوش وجذبہ نظر آیا۔ واضح رہے کہ پاپولر میرٹھی نے حکومت کناڈا کی دعوت پر اس ادبی محفل میں شرکت کی اور متعدد پروگراموں میں شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 اپریل 2025

رسم اجرا

'دی ونگس فاؤنڈیشن' اور 'ڈائنامک انگلش اکیڈمی' کے زیر اہتمام پانچ کتابوں کی رسم رونمائی

دھلی: 'دی ونگس فاؤنڈیشن' اور 'ڈائنامک انگلش اکیڈمی' کے زیر اہتمام پانچ کتابوں کی رسم رونمائی کا انعقاد کیا

گیا جن میں ڈاکٹر عادل حیات کی دو کتابوں، اردو اکادمی دہلی سے شائع شدہ مونوگراف 'اختر انصاری دہلوی' اور بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ 'سپنوں کا گھر'، ڈاکٹر انوار الحق کا مجموعۂ مضامین 'نارنگ قرأت'، ڈاکٹر جاوید حسن کا ساہتیہ اکیڈمی سے شائع شدہ پروفیسر محمد اسدالدین کے انگریزی مونوگراف 'عصمت چغتائی' کا اردو ترجمہ اور نوید انجم کا مجموعۂ کلام 'نقش رائیگاں' شامل ہیں۔ اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے تمام صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ عادل حیات کی ادبی کاوشوں کا دائرہ شاعری، تحقیق وتنقید اور ادب اطفال تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہر کام سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انوار الحق کے مضامین کا مجموعہ 'نارنگ قرأت' دراصل پانچ کتابوں کے حوالے سے تجزیاتی نوعیت کے پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔ وہ ادب کے نئے رجحانات پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر جاوید حسن کا اصل میدان ڈراما اور ترجمہ ہے اور وہ نئی نسل کے باصلاحیت ادیب ہیں۔ صاحب صدر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نوید انجم کی شاعری میں جدت اور ندرت متاثر کن ہے۔ مہمان خصوصی اور مہاتما گاندھی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ ماریشس کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر انوار الحق اور ڈاکٹر جاوید حسن میرے بہت ہی اچھے ادبی دوست ہیں اور ان کی یہ کتابیں ادبی دنیا کے لیے بیش قیمت تحفے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اختر انصاری کے فکر وفن پر ڈاکٹر عادل حیات کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر انوار الحق کی کتاب 'نارنگ قرأت' کے حوالے سے کہا کہ ان مضامین سے نارنگ فہمی میں مدد ملے گی۔ شہپر رسول نے جاوید حسن کو ساہتیہ اکیڈمی جیسے موقر ادارے سے ان کی کتاب شائع ہونے پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس کا مطالعہ اہل اردو کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ انھوں نے نوید انجم کی شاعری کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک تازہ کار شاعر ہیں چنانچہ ان کی تازگی ایک نوع کی فرحت کا احساس دلاتی ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے ان پانچوں کتابوں پر فرداً فرداً اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تہنیت پیش کی۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے ان کتابوں کی اشاعت پر دلی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کتابوں کے مصنفین مجھے بے حد عزیز ہیں اور مستقبل میں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔ اس پروگرام کا دوسرا حصہ شعری نشست پر مشتمل تھا جس کی صدارت پروفیسر شہپر رسول نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مارچ 2025

بزم سرقہ

آسنسول: شمالی آسنسول کی الحفیظ ویلفیئر سوسائٹی، کے زیر اہتمام شعبہ اردو رانی گنج گرلز کالج کے پروفیسر

ڈاکٹر عبدالحلیم انصاری کی تحقیقی وتنقیدی کتاب 'بزم سرقہ' کی رسم رونمائی زیر صدارت الحاج نذیر احمد یوسفی جب کہ نظامت امتیاز احمد انصاری نے کی۔ مہمان مقررین

میں اشہر ہاشمی، سید انجم رومان، انجینئر خورشید غنی، ڈاکٹر محترمہ شہور حسین، جب کہ مقامی طور مولانا امداداللہ رشیدی اور محمد مشتاق احمد ضلعی اور معروف صحافی محمد وجیہ الدین جمال شریک تھے۔ اظہار تشکر الحاج نسیم انصاری جنرل سکریٹری ادارہ ہذا نے کی۔

تمام مقررین نے سرقہ کو اخلاقی جرم قرار دیا اور اشہر ہاشمی نے تو اسے باضابطہ مجرمانہ فعل قرار دیتے ہوئے قانونی چارہ بھی کیے جانے کی گنجائش بتائی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محترمہ شہور حسین نے بھی اظہار خیال کیا۔ الحاج نسیم انصاری نے مصنف کی کتابوں کو خرید کر تمام سامعین کو مفت تقسیم کیا۔

رپورٹ: محمد وجیہ الدین جمال، آسنسول، 6 اپریل 2025

کاروانِ غزل

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگلپور کے زیر اہتمام افسانہ نگار ڈاکٹر خالدہ ناز کی رہائش گاہ پر شاعر جوہر ایاغ کی صدارت میں ڈاکٹر تبسم پروین کا شعری مجموعہ 'کاروانِ غزل' کا رسم اجرا انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز، ڈاکٹر تبسم پروین، جوہر ایاغ، محمد شاداب عالم، ڈاکٹر سید نیر حسن، ڈاکٹر حبیب مرشد خاں، ڈاکٹر محمد صدیق، اے پروفیسر تقی احمد جون، ڈاکٹر خالدہ ناز، اے پروفیسر عالیہ خان، شاداب عبداللہ، ڈاکٹر حنا تبسم، ڈاکٹر ارشد رضا وغیرہ کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے کہا کہ ڈاکٹر تبسم پروین بہت نیک، ملنسار، فعال، متحرک شخصیت کی مالک ہیں۔ کاروان غزل ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 208 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر حبیب مرشد خاں نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 اپریل 2025

وفیات

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

رامپور: معروف اسکالر اور خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار کا 28 مارچ 2025 کو علی گڑھ میں اپنی بیٹی کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ مرحوم کافی عرصے سے صاحب فراش تھے اور اپنی اکلوتی بیٹی شائستہ بیدار کے مکان پر علی گڑھ میں علاج کرا رہے تھے۔ مرحوم کے انتقال کی خبر جیسے ہی رامپور پہنچی ادبی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔

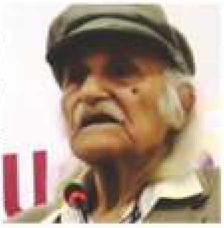

مرحوم کے جنازہ کو رامپور لایا گیا۔ ان کی نماز جنازہ محلّہ کٹرہ جلال الدین میں مرحوم کے مکان کے قریب چوک میں ادا کی گئی جس میں علم و ادب سے وابستہ افراد اور کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ عابد رضا خاں رامپور کے محلّہ کٹرہ جلال الدین خاں کے رہنے والے اور منشی حامد رضا خاں کے صاحب زادے تھے۔ رامپور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے اور شعبۂ علوم اسلامیہ میں پوسٹ گریجویشن کے بعد مصر کی علمی خدمات پر تحقیق کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تکمیل علم کے بعد رامپور میں رہ کر شاد عارفی لائبریری، صولت پبلک لائبریری اور بعد میں رضا لائبریری کے زلف و گیسو سنوارے۔ 1962 کے بعد دہلی میں سپرو ہاؤس کی لائبریری میں ملازم ہوئے۔ 1972 میں پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر ہوئے اور گمشدہ ذخیرہ کو مدفن سے نکال کر بین الاقوامی شہرت کے آسمان تک پہنچا دیا۔ مرحوم بیدار صاحب کو علم و ادب سے جنون کی حد تک ذوق تھا، فن کتابت اور خانہ داری میں یکتا تھے۔ وہ بیک وقت مشرقی اور مغربی لائبریری سائنس کے ماہر تھے۔ وہ علمی ذوق رکھنے والوں کی حد درجہ مدد فرماتے تھے۔ مرحوم نے بہت سی کتابوں کو مرتب کیا، تدوین و تالیف کی، لیکن اپنا تحقیقی مقالہ شائع نہیں کرا سکے۔ ان کے انتقال سے علم و فن کا ماہ تاباں غروب ہوگیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مارچ 2025

ڈاکٹر سوریہ کانت

نئی دہلی: ہندوستان کے ممتاز اسکالر، صحافی، مفکر، مصنف اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سوریہ کانت بالی کا انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ ان کی عمر 82 برس تھی۔ ان کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ ڈاکٹر سرسوتی بالی، دو بیٹے اور بہوئیں، ایک پوتی اور ایک پوتا ہے۔ مسٹر بالی اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس ٹرسٹ کے ٹرسٹی بھی تھے۔ مسٹر بالی پہلے دہلی یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے پروفیسر رہتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔ پھر انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے استعفیٰ دے دیا اور نو بھارت ٹائمز میں شمولیت اختیار کی۔ سینئر صحافی ڈاکٹر گووند سنگھ کے مطابق مسٹر بالی کی تحریر کی نفاست کو دیکھ کر راجندر ماتھر انھیں نو بھارت ٹائمز لے آئے۔ چونکہ ان کا نقطہ نظر واضح تھا اس لیے ان کے پاس کبھی بھی موضوعات اور خیالات کی کمی نہیں تھی۔ قومی موضوعات پر ان کا قلم بہت طاقتور تھا۔ ڈاکٹر بالی کی تحریریں ہندوستانیت سے بھری پڑی ہیں۔ ہندوستانی افسانوی کہانیوں پر مبنی ان کا کالم 'بھارت گا تھا' بہت مقبول ہوا۔ بعد میں اسی عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ وہ روزنامہ جاگرن میں بھی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ وہ کچھ عرصہ ٹی وی سے بھی وابستہ رہے لیکن انھیں یہ پسند نہیں آیا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ فری لانس رائٹنگ میں مصروف تھے۔ ان کا انتقال تعلیم، ادب اور صحافت کی دنیا کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 اپریل 2025

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ اردو دنیا میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تلفظ

مصنف: شکیل حسن شمسی
دوسرا ایڈیشن: 2025
صفحات: 184+xxiv
قیمت: 135 روپے

منشی عبدالقیوم خاں خطاط

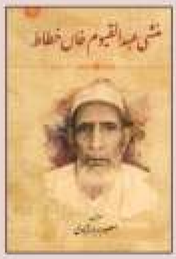

مرتب: معصوم مرادآبادی
پہلا ایڈیشن: 2025
صفحات: 160
قیمت: 125 روپے

درد: علامت اور علاج

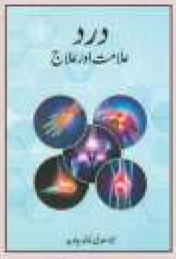

مصنف: ابوسعدی خالد جاوید
تیسرا ایڈیشن: 2025
صفحات: 200
قیمت: 130 روپے

اردو صرف ونحو

مصنف: اقتدار حسین خان
پانچویں طباعت: 2025
صفحات: 131
قیمت: 100 روپے

منتخب اللغات

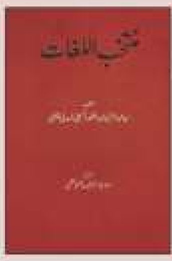

مولف سید عبدالرشید عبدالغفور الحسینی المدنی التتوی
مترجم: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی
دوسری طباعت: 2023
صفحات: 720، قیمت: 785 روپے

آئینِ ہند: ان کہی کہانی

مصنف: رام بہادر رائے، مترجم: جاوید عالم
پہلی اشاعت: 2024
صفحات: 624+xl
قیمت: 340 روپے

معالجات (جلد: اوّل، دوم، سوم، چہارم)

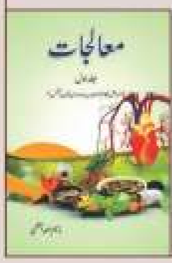

مصنف: وسیم احمد اعظمی
پانچواں ایڈیشن: 2024
صفحات: 2325 (مکمل سیٹ)
قیمت: 970 روپے (مکمل سیٹ)

کشاف اصطلاحات ادبیات (جلد اول)

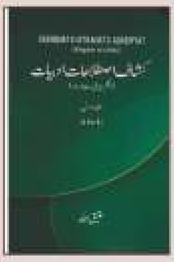

مصنف: عتیق اللہ
پہلی اشاعت: 2024
صفحات: 627+26
قیمت: 340 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मई–2025,वर्ष:27, अंक:05
URDU DUNIYA Monthly, May-2025, Vol.27, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/04/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6